المودودیؒ

نعیم صدیقیؒ

فہرست

انتساب

اُس قوم کے نام ——
جس نے
بارہا
کانٹوں کو سر آنکھوں پر رکھا
اور
پھولوں کو پامال کیا!

٭

ایک تعارف
اس دل چسپ تاریخی شخصیّت کا
جو درحقیقت کسی تعارف کی محتاج نہیں
وہ کہ ——
جس کے حصّے میں سب سے زیادہ گالیاں بھی ہیں
اور سب سے زیادہ احترام بھی!
وہ کہ ——
جس نے بھرپور زندگی گزاری
اور فوت ہوا تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ
پہلے سے زیادہ زندہ ہے۔

٭

ابتدائیہ

(نقشِ ثانی)

یہ کتاب اپنی پہلی ترتیب و ضخامت کے ساتھ ۱۹۶۳ء میں "مولانا مودودی ایک تعارف" کے نام سے شائع ہوئی تھی، اِدھر مولانائے مرحوم کی وفات کے بعد احباب کی طرف سے اصرار ہوتا رہا کہ اس کا نیا ایڈیشن آنا چاہیے۔ قوّت و فرصت کی کمی کی وجہ سے میں اپنی مطبوعہ کتب کی اشاعتِ نو یا غیر مطبوعہ تحریروں کی ترتیب کی طرف اتنی کم توجّہ دے سکتا ہوں کہ جس کا اندازہ خود اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ زیرِ گفتگو کتاب کی اشاعتِ اوّل کے بعد پھر کبھی میں نے اس کے متعلّق سوچا ہی نہیں۔ بدقسمتی سے یہاں ایسے پبلشر بھی نہیں ملتے جو آدمی کو کھینچ گھسیٹ کر کتابوں کی تصنیف و ترتیب اور تجدید و نظرِ ثانی کی راہ پر لے جاتے ہیں۔

اب کی ادارہ معارفِ اسلامی (منصورہ لاہور) کی طرف سے تقاضا ہوا کہ ۱۹۶۳ء والی متذکرہ کتاب کا نیا ایڈیشن نکالنے کے لیے ازسرِ نو مرتب کر دوں چنانچہ جب ادھر توجّہ ہوئی تو ایک تو وہ مضامین سامنے آئے جو مولانا کی وفات کے بعد لکھے گئے ہیں اور یہ احساس بھی پیدا ہُوا کہ بعض احوال و معاملات کے بارے میں

کچھ خلا رہ گیا ہے ان وجوہ سے نئے مضامین کو شامل کیا گیا۔

ظاہر بات ہے کہ " ایک تعارف'' والے مضامین میں نے ابتدائی دور میں لکھے اور جس طرح مولانا کو دیکھا اور سمجھا تھا اسی طرح دو تین مختصر مضامین میں انکی شخصیت اور ان کے کردار کو دکھانے کی کوشش کی۔ اس وقت کے حالات میں میرا منشا یہ بھی تھا کہ اندازِ گفتگو ایسا ہو کہ ہم سے دور دور رہنے والے حلقوں میں بھی اسے پڑھا جائے اور سلیم الطبع حضرات مخالفانہ پروپیگنڈے کے اٹھائے ہوئے غبار میں گھرے ہونے کی حالت میں بھی مولانا کی حقیقی تصویر کی ایک جھلک دیکھ کر انصاف سے اپنی رائے قائم کریں۔

تین مضامین کا وہ مجموعہ مصنّفانہ ذہن کے مرتب کردہ نقشے پر کام کر کے تیار کیا گیا۔ اب صورتِ حالات دوسری ہے۔ سابق ایڈیشن میں اندازِ تفکّر غالب تھا۔ مگر بعد کے ان مضامین میں جذباتی تاثّرات بھی شامل ہیں ــــ مگر وہ کوئی عدمِ توازن پیدا کرنے کے باعث نہیں بنے۔

اب نئے اضافہ شدہ ایڈیشن کی تحریروں میں سابق ایڈیشن کے مضامین جوں کے توں اپنی جگہ پر ہیں۔ کتاب کے اندر ہی دوسرے حصّے کے طور پر بعد کی تحریروں کو شامل کر دیا گیا ہے۔ گویا اب مولانا کو دو مختلف زاویوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔

منصورہ
یکم اکتوبر ۱۹۸۳ء

نعیم صدّیقی

ایک اور ابتدائیہ

(نقشِ ثالث)

اب یہ کتاب تیسرے ایڈیشن کے لیے جارہی ہے۔ وقت نکال کر میں نے اس کی نظرِ ثانی کرلی ہے۔ متعدّد فاش غلطیاں سامنے آئیں۔

اِس وقت اگر ترجمان القرآن کی ادارت کے ساتھ ساتھ میری توجّہ مجلّہ "تذکرہ مودودیؒ" پر مرتکز نہ ہوتی تو میں اس کتاب میں کچھ نئی چیزیں شامل کرتا۔ مگر مجبوری یہ ہے کہ ۱۹۸۵ء میں ایڈیشن ختم ہوچکا ہے اور مکتبہ المنار کو فرمائشیں موصول ہورہی ہیں، لہٰذا کسی اضافے کے بغیر "المودودی" کا تازہ ترنقش پیشِ خدمت ہے۔

امید ہے کہ قارئین اس کا مطالعہ کرتے ہوئے مولانا سیّدابوالاعلیٰ مودودیؒ کے لیے خدائے رحیم وودود سے رحمت وعنایت کا سوال کریں گے۔ بعدازاں ربِّ کریم وغفور کے سامنے میرے لیے بھی فلاحِ دارین کی درخواست کا دامن پھیلائینگے ایسے تمام خادمانِ دینِ حق، قارئینِ "المودودی" اور خیر خواہانِ مؤلّف کے لیے میں بھی حسناتِ دنیا و آخرت کی دعا کرتا ہوں۔

نعیم صدّیقی

۱۷رجنوری ۱۹۸۶ء

اوراب دہلی ایڈیشن

یہ اللہ ہی کی نوازش ہے کہ وہ اپنے کسی بندۂ ناچیز کی معمولی سی خدمات کو قبول فرماکر انھیں انسانی قلوب کے لیے پُرکشش بنا دے اور ان کا دائرۂ اثر پھیلتا چلا جائے۔ پاکستان میں "المودودی" کے چار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ — دہلی ایڈیشن پانچواں ہے۔

میں نے جب سے اپنی زندگی اور قوتوں کو اسلام کے لیے وقف کیا ہے اس وقت سے دوسری ممکن مساعی کے علاوہ اقامتِ دین اور فروغِ حق کے لیے میں نے قلم کی قوّت کا زیادہ سے زیادہ استعمال نثر اور نظم دونوں میدانوں میں کیا ہے۔ مقالات، سوالوں کے جواب، یا ادب و انشاء اور شعر و تنقید کے لیے میں نے ایمان و ضمیر کے تقاضوں سے قلم کو حرکت دی ہے اور کبھی ایسا موقع نہیں آیا کہ دولت یا شہرت کی ہوس نے میرے نقطۂ نظر یا اندازِ بیان میں کوئی تبدیلی پیدا کردی ہو۔ ان چیزوں کو بفضلہٖ تعالیٰ میں نے اپنے اوپر غالب نہیں ہونے دیا۔

اور شاید میرے خدا پرستانہ خلوصِ نگارش ہی کی برکت ہے کہ میری خدمات کے دائرۂ اثر کو پھیلاؤ مل رہا ہے۔ خصوصیت سے "محسنِ انسانیت" (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حق میں خداوندی فیض و کرم کو دیکھ کر میں خود حیران ہوں۔

ابھی تو میری مطبوعہ کتابوں کے علاوہ ہزاروں صفحات کتابی شکل میں نہیں آئے اور میرے قلیل قویٰ کے سامنے بہت بھاری کام پڑا ہے۔

خیر اس وقت بات "المودودی" کے دہلی ایڈیشن کی ہو رہی ہے۔ میری

دلی دعا ہے کہ اس کتاب کو بھارت کے حلقوں میں بھی خصوصی مقبولیت حاصل ہو اور اس کے ناشر ادارے کے لیے بھی برکت کے دروازے کھُلیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ بھارت کے مسلمانوں کو ایک سنگین ماحول نے فہمِ حق اور قبولِ خیر کی خصوصی صلاحیتیں دی ہیں، اور غیر معمولی ذوقِ مطالعہ سے بھی آراستہ کیا ہے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ وہ المودودی کو پوری دلچسپی سے پڑھیں گے اور میرے ثواب میں اضافہ کریں گے۔ پڑھنے والے اگر مجھے میری غلطیوں سے آگاہ کرنے کے ساتھ میرے لیے فلاحِ دارین کی دعا کریں اور یہ التجا بھی کریں کہ میری زندگی کی جو گھڑیاں بھی باقی ہیں وہ اعلائے کلمۃُ الحق، خدمتِ دین اور فلاحِ انسانیت میں صرف ہوں۔

نعیم صدّیقی
۲۰/۱۰/۹۰

یقیناً اس تری جرأت کو دنیا یاد رکھے گی
سزائے موت سُن کر بھی نہ پیشانی پہ بل آیا

ماہر القادریؒ

انسانم آرزوست

کہو، وہ کون حسیں ہے تمھاری بستی میں
کہ جس کے نام کے ساغر اٹھائے جاتے ہیں

زندگی کے شہر میں اولادِ آدم کے انبوہ پائے جاتے ہیں۔ ان میں ہر آن کچھ تعداد پردۂ عدم کے پیچھے چلی جاتی ہے اور اپنے سے زیادہ جانشین پیچھے چھوڑ جاتی ہے، مگر ان میں مجسّمہ ہائے حسن وخوبی کم ہوتے ہیں۔ اشخاص کروڑوں ہوتے ہیں لیکن شخصیّت کم پائی جاتی ہے۔ اور پھر ان میں تابناک شخصیّتیں تو اِکّا دُکّا سامنے آتی ہیں۔

ہمارے اس دور میں اور ہمارے ہی دیس میں ایک شخص ہیں جن کو مولانا مودودی کہا جاتا ہے۔

مگر ذرا رُکیے، پہلے ذرا اور باتیں ہولیں۔

اس سے قطع نظر کہ میں نے اپنے مضامین کا جو مجموعہ تیار کیا ہے وہ بحیثیتِ مجموعی، یا ان میں سے کوئی ایک مضمون شخصیّت نگاری میں آتا ہے یا نہیں، نفسِ شخصیّت نگاری کے بارے میں دو ایک باتیں کہتا ہوں۔

شخصیّت نگاری اَدب کی ایک انتہائی شریف و معزّز صنف ہے۔ مشرقی اور خصوصًا اسلامی نقطۂ نظر سے شخصیّت نگاری کا مقصد لازمی طور پر تعمیری ہوتا ہے۔ شخصیّت نگار کے فن کی جانچ دو سوالوں سے کی جا سکتی ہے:

ایک یہ کہ اس نے کیسی شخصیّت کو چھانٹ کر سامنے رکھّا، دوسرے یہ کہ اسے کس انداز سے پیش کیا۔ شخصیّت نگار کی پہلی ذمہّ داری یہ ہے کہ وہ ایک ہجوم میں سے کوئی ایسی بہترین شخصیّت انتخاب کرے جس کے فکر وعمل سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کیا جا سکتا ہو، جس کی مثال دوسروں کو روشنی بہم پہنچائے، اور جس کو جاننا اور سمجھنا فی الواقع ایک ضرورت ہو۔ اس کی دوسری ذمہّ داری یہ ہے کہ وہ کسی شخصیّت کی تصویر گری ایسے زاویوں سے اور ایسے رنگوں سے

کرے کہ دوسرے لوگ اس کی زیادہ سے زیادہ قابلِ اخذ و اکتساب خوبیوں سے آشنا ہوسکیں۔

دوسرے لفظوں میں شخصیّت نگاری نام ہے تلاشِ انسانیّت کا ــــــــ یا یوں کہیے کہ بہترین نمونۂ انسانیّت کی جستجو کا؛ اور پھر اس کے بعد وہ نام ہے کسی اچھّے نمونۂ انسانیّت کو بہترین انداز سے پیش کرنے کا، بلکہ فی الحقیقت شخصیّت نگاری کسی کو مثال کے طور پر پیش کر کے دوسروں کے اندر تعمیرِ انسانیّت کی ایک لطیف و مؤثر کوشش ہے۔ شخصیّت نگار ایک طرف رفتہ و موجود شخصیّتوں میں انسانیّت کا حسُن تلاش کرتا ہے اور دوسری طرف اس حسن کا پرتو دوسروں پر ڈالنا چاہتا ہے۔ شخصیّت نگار بھی ناول نگار کی طرح کسی کو ہیرو کی حیثیت دے کر سامنے لاتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ناول نگار تخیّل کی روشنی میں اپنے تجربات کا رنگا رنگ مسالہ استعمال کر کے تصوّری پیکر تراشتا ہے، مگر شخصیّت نگار کو اپنا ہیرو ماضی یا حال کی واقعاتی تاریخ میں تلاش کرنا ہوتا ہے۔ نتیجۃً دونوں ایک ہی پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ دونوں انسانیّت کے مثالی نمونے فراہم کر کے دوسروں کے لیے ان سے استفادہ کی راہ کھولتے ہیں۔

شخصیّت نگار جب کسی شخصیّت کو کام کرنے کے لیے منتخب کرتا ہے تو اپنے انتخاب کے پردے میں وہ اپنے معیارِ انسانیّت کو بھی ہمارے سامنے واضح کر دیتا ہے۔ اس کی پسند بتا دیتی ہے کہ اس کی نگاہ کی رسائی کہاں تک ہے اور اس کی اپنی انسانیّت کا قد و قامت کیا ہے۔ اونچے درجے کا کوئی شخصیّت نگار جو خلوص سے اپنے سامنے تعمیرِ انسانیّت کا مقصود رکھتا ہو کبھی کسی گھٹیا شخصیّت کو فن کا محور نہیں بنا سکتا۔ وہ ہر حال میں عام اور معمولی سطح سے بلند تر کسی مردِ کار کا انتخاب کرے گا، جس کے تذکرے سے فکر کے دیے روشن ہوسکیں، جس کا تصوّر سامنے لانے سے کچھ شریف جذبے ترو تازہ ہوسکیں اور جس کے کارناموں کا مطالعہ کرنے سے کردار میں بلندی آسکے۔

سچّا شخصیّت نگار اپنے منتخب کردہ ہیرو سے محبّت کرتا ہے اور اسے ایک حد تک ممدوح بناتا ہے، مگر وہ اسے بے عیب سمجھنے والا اندھا قصیدہ گو نہیں ہو سکتا۔ وہ پہلے قدم پر یہ حقیقت مان کر چلتا ہے کہ انسان انسان ہے، فرشتہ نہیں ہوسکتا۔ انسان کتنی ہی بلندیوں تک پہنچے، کچھ کمزوریاں اس کے ساتھ لگی رہتی ہیں۔ وہ کبھی نقص و خطا سے منزّہ نہیں ہوا کرتا انبیاءؑ کے بعد جن انسانوں کو ہم بہترین انسان قرار دے سکتے ہیں، وہ وہ ہیں جنھوں نے

اپنی کمزوریوں کے آگے بھی ہتھیار نہیں ڈالے، بلکہ کمزوریوں سے معرکہ جاری رکھّا اور ان کی خوبیاں بار بار غالب نکلیں۔ ہوسکتا ہے کہ اچھّے لوگوں کو اس کشمکش میں ٹھوکریں لگی ہوں اور چوٹیں کھانی پڑی ہوں۔ مگر وہ گر گر کر ہمیشہ اٹھ کھڑے ہوتے رہے ہیں، اور مٹی جھاڑ کر ازسرِ نو آگے اقدام کرتے دکھائی دیے ہیں۔ یہی لوگ تاریخ کے ہیرو ہیں اور سچّا شخصیّت نگار انہی کا متلاشی ہوتا ہے اور انہی کی تصویروں کے مرقعے تیار کرکے ایوانِ ادب کو آراستہ کرتا ہے۔

ایسے کسی مردِ کار کی تلاش میں کامیابی کے بعد بڑی نازک ذمہّ داری سامنے آتی ہے کہ اس کے فکر و کردار کے حسن کو خوبی سے اُجاگر کیا جاسکے اور اس کو ایک حد تک مثالی حیثیت سے سامنے رکھّا جاسکے۔ اسے اس انداز سے سامنے لایا جائے کہ پڑھنے والے کا انسانیت پر اعتماد قائم ہو کہ آدمی مزاحمتوں اور کمزوریوں کے باوجود بلند ہوسکتا ہے، آدمی پستی کی طرف لے جانے والے محرکات کے ساتھ معرکہ لڑسکتا ہے۔ اتنا بھی کافی نہیں۔ کامیاب شخصیّت نگار وہ ہے جو اپنے قاری میں بلند تر ہونے کا ولولہ اور ایک مثال سے سبق لے کر بہتر انسان بننے کا عزم پیدا کر دے۔ شخصیّت نگار جب اس تعمیری مشن کو سامنے رکھ کے کام کرتا ہے، تو اس میں چھوٹی چھوٹی بشری کمزوریوں سے درگزر کرنے کا جذبہ کار فرما ہو جاتا ہے جو جتنا بڑا شخصیّت نگار ہوگا، وہ اتنا ہی بڑا معاف کرنے والا بھی ہوگا۔ بخلاف اس کے اگر کوئی شخص چھوٹی موٹی کمزوریوں سے چشم پوشی کرنے کے بجائے اُلٹا نمایاں اور ممتاز اور نیک نام اور خوش اطوار شخصیّتوں میں کرید کرید کر کمزوریاں تلاش کرتا ہے، انکو پھیلا پھیلا کر دیکھتا اور دکھاتا ہے، تو گویا وہ انسانی تاریخ کو روشن کرنے والی بتیّوں کو گُل کر دینے کے درپے ہے۔ وہ انسانوں کے اندر انسانیّت کے متعلّق مایوسی پھیلا دینے کے لیے کوشاں ہے۔ اس کی مساعی کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ نکلے گا کہ اس کے پڑھنے والے یہ رائے قائم کرلیں کہ اُونچے سے اونچے انسان بھی درحقیقت پست تھے۔ اور اچھّے سے اچھّے افراد بھی صحیح معنوں میں اچھّے نہ تھے۔ یہ تأثر سرے سے اس اُکساہٹ کا راستہ بند کر دے گا جو عام متوسّط درجے کے انسانوں میں عظمت انسانیّت کی طرف بڑھنے کا سبب بنتی ہے۔ پس یہ سِیَر نگاری تعمیرِ انسانیّت کے بالکل برعکس تخریبِ انسانیّت کی ایک خطرناک کوشش ہوگی سِیَر نگاری کا یہ رُخ پوری انسانیّت کو پستی کے رُخ پر ڈال دے گا۔

ایک طرف کچھ لوگوں کو بڑے لوگ اور عظیم شخصیّتیں کہہ کر پیش کرنا اور دوسری طرف اُن کی زندگی میں کمزور اور پست پہلو نکال نکال کر دکھانا سوائے اس کے کس نتیجے تک پہنچا سکتا ہے کہ کمزوری اور پستی سے کوئی مفر نہیں اور یہ کہ بڑے لوگ اور عظیم شخصیّتیں بھی ایک ڈھکوسلہ ہیں۔

تعمیر پسندانہ ذہن سے جب بھی سوچیے تو ماننا پڑے گا کہ نئی نسلوں کے سامنے ہمیں اسلاف کے ہاں سے یا آئندہ نسلوں کے سامنے معاصر شخصیّتوں کے ہاں سے چن چن کر اچھے اوصاف اچھّے اخلاق اور اچھّے کارناموں کو لانا ہے۔ میراث جو پیچھے سے آگے منتقل ہونی چاہیے وہ صرف خیر و خوبی کی میراث ہے۔ کمزوریاں جواہر کے خزانہ میں شامل نہیں کی جاسکتیں جن کو آگے منتقل ہونا ہے۔ پس شخصیّت نگار کی ذمّہ داری یہ بھی ہے کہ وہ سوانحی مواد کی چھنٹائی کرے، وہ مشاہدہ و مطالعہ کے پورے حاصل کو تفکّر کے کھلیان میں ڈال کر بھُس کو اڑا دے اور غلّے کو محفوظ کرلے۔ غلّے کے ساتھ بھُس کا پایا جانا کوئی اَنہونی بات نہیں، مگر بھُس اس قابل بہرحال نہیں ہے کہ اسے غلّہ کے ساتھ ملا جُلا کر اسلاف کی طرف سے اخلاف کی جھولی میں ڈال دیا جائے۔

ہم مسلمانوں کے ہاں سوانح نویسی اور شخصیّت نگاری کا فن ٹھیک اسی تعمیری نقطۂ نظر کے ساتھ پروان چڑھا ہے۔ سب سے پہلے قرآن نے انبیاء اور بعض صلحاء کی زندگی کی تصویریں تیّار کرکے وہ نہج معیّن کردیا جس پر شخصیّت نگاری کا نشوونما ہونا چاہیے۔ قرآن نے بہترین شخصیتیں لیں اور ان کی بہترین نقشہ کشی اچھّے سے اچھّے زاویوں سے ہمارے سامنے کرکے رکھ دی۔

اور قرآن ہی تھا جس کی شخصیت نگاری کے ساتھ "اسوہ" اور "سُنّت" کا تصوّر شامل تھا، یعنی جس کو پیش کیا نمونہ بنا کر پیش کیا اور جو بھی پہلو سامنے رکھے قابلِ تقلید بنا کر رکھے۔ اسی طرح حدیثِ رسالت میں انسانیّت کے جن گلہائے سرسبد کو سجا کر پیش کیا گیا ہے اُن کی خوشبو اور رنگینی صدہا بہاروں کا سرمایہ قرار پائی ہے۔ قرآن وحدیث نے جو راستہ بنا دیا تھا اس پر چل کر ہمارے سوانح نویسوں اور شخصیّت نگاروں نے صحابہؓ، تابعینؒ کی شخصیّتوں کے مرقعے تیار کیے جن کا ہر ورق اور ہر نقش آج ہمیں درسِ رفعت دیتا ہے۔

اس کے برعکس اہلِ کتاب کے ہاں جب پستی آئی تو انھوں نے اپنے انبیاء کی عظیم و مقدّس شخصیّتوں تک کے خاکوں میں انہی گھٹیا عادات واطوار کا رنگ بھر دیا جو ان میں پھیل گئی تھیں، پست ذہن و کردار کا آدمی عظیم ترین شخصیّت کو موضوع بنا کر پست کر دیتا ہے چنانچہ بائبل میں خدا کے بہترین برگزیدہ بندوں کے دامنِ عصمت پر بدترین داغ دکھائی دیں گے اپنے بہترین لوگوں کو جب انھوں نے اس رنگ میں دیکھا اور دکھایا تو وہ خود اور زیادہ پستی میں گرتے چلے گئے۔ انھوں نے نیکی اور عظمت کے دِیوں کو خود ہی گُل کر دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ تاریکیوں میں بھٹکتے رہ گئے۔

آج مادّہ پرست یورپ نے سیرت نگاری کا ایک نیا مدرسۂ فکر حقیقت نگاری کے نام سے قائم کیا ہے اور اس کا خوب دَور دَورہ ہے۔ مغرب کا سیرت نگار ایک غیر جانبدار آنہ مقام پر قدم جما کر بالکل ایک کیمرے کا سا پارٹ ادا کرنا چاہتا ہے۔ جو جذبات سے بالکل عاری ہو کر مختلف زاویوں سے تصویر لے رہا ہو۔ یہ تصویر گری کتنا ہی دلآویز فن ہو اکرے تعمیرِ انسانیت کا ذریعہ بہر حال نہیں بن سکتا۔ آج کے حقیقت نگار لازم سمجھتے ہیں کہ وہ پیشِ نظر شخصیتوں میں کوشش اور کاوش کر کے بھی کچھ کمزوریاں تلاش کریں۔ اگر کمزوریاں سامنے نہ ملیں تو، واقعات کی گہرائی میں ڈوب کر بہم پہنچائیں۔ وہ اگر ثابت نہ ہو سکیں تو کم از کم اُنکے ہونے کا ظنِ غالب پیدا کر دیں، اور کچھ ہاتھ نہ آئے تو پھر دورِ ابتدار کی ان کمزوریوں کو اُچھالیں جن سے لڑ کر اور جن کو پیچھے چھوڑ کر ایک آدمی عروج کی منزلیں طے کرتا ہوا کسی مقامِ عظمت تک پہنچا ہو۔ یہ بھی نہیں تو عمیق نفسیاتی تجزیہ کر کے اور بچپن کے واقعات کو سامنے رکھ کر یہ ثابت کر دکھائیں کہ یہ جو کچھ عظمت و رفعت دکھائی دیتی ہے یہ خود کسی کمزوری کا مظہر یا ردِّ عمل ہے۔

جن تمدّنوں میں اخلاقی انحطاط پیدا ہو جاتا ہے ان میں سوانح نویسی اور شخصیّت نگاری کسی ایسے ہی نہج پر بڑھتی ہے اور اس میں سوانح نویس اور شخصیّت نگار کا غیر شعوری یا نیم شعوری ایک مقصد بن جاتا ہے کہ وہ اپنی اور اپنے دور کی اخلاقی پستیوں کے لیے وجہ جواز فراہم کرے۔

بہر حال یہ حقیقت نگارانہ رنگ کی شخصیّت نگاری اس مشن اور پیغام سے خالی ہو جاتی ہے جو شخصیّت نگاری کی رُوح ہے۔ سچّا شخصیّت نگار محض قلم کش نہیں ہوتا اور

اس کا کام دفترِ ادب میں چند خوب صورت اور رنگین خاکوں کا اضافہ کر دینے تک محدود نہیں ہوتا، بلکہ وہ موجودہ انسانوں اور آنے والی نسلوں کو انسانی شرف کے لحاظ سے بلند تر کر دینے کا مشن اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ یہ مشن اس کے کام میں جذباتی روح بھر دیتا ہے۔ وہ کسی طرح اپنے اندر مصنوعی غیر جانب داری اور بے تعلّقی پیدا نہیں کر سکتا۔ اسکی حقیقت پسندی اور راست بازی اسے اس کا پابند تو بناتی ہے کہ وہ انتخاب کردہ شخصیّت کی خوبیوں کے بیان میں کوئی بے جا مبالغہ نہ کرے اور نہ اپنی طرف سے کچھ خوبیاں گھڑ کر اس کے ساتھ چپکا دے، لیکن اس کی حقیقت پسندی اور راست بازی یہ تقاضا نہیں کرتی کہ وہ ڈھکے چھپے پہلوؤں کو کرید کرید کر لازمًا کچھ کمزوریاں تلاش کرے، اور وہ ثابت نہ ہوں تو ان کے ہونے کا گمانِ بد ضرور پیدا کر دے۔ وہ تو ہے ہی خیر وخوبی کا جویا اور خیر وخوبی کو دوسروں تک پہنچانے کا واسطہ۔ وہ حُسن کا متلاشی ہے اور اسے زیادہ سے زیادہ انسانوں تک منتقل کرنے کا وسیلہ۔

یہ ہے میرا ذہن شخصیّت نگاری کے متعلّق۔ اس ذہن کے ساتھ میں نے ایک درخشاں شخصیّت کو موضوع بنایا ہے۔ جہاں تک میرے انتخاب کا تعلق ہے مجھے اپنے اوپر اعتماد ہے کہ میں نے انتخاب اچھا ہی کیا ہے، لیکن اس کے آگے کا یہ سوال کہ اس کتاب میں جمع شدہ مضامین میں میں نے شخصیّت نگاری کہاں تک کی ہے اور پھر اس کا حق کہاں تک ادا کیا ہے، اس کا جواب میں نہیں دے سکتا، اس کا جواب ہر پڑھنے والا اپنے لیے خود ہی تجویز کرے گا۔

میں اپنے تجربے کی روشنی میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ خود میں نے مولانا کی شخصیّت پر جو کچھ لکھا ہے اس نے مجھے یہی احساس دلایا ہے کہ مولانا مودودیؒ کے شخصیّت نگار کی ذمّہ داری سے عہدہ برآ ہونا میرے بس میں نہیں ہے۔ اس کام کے لیے میرے اندر جس درجہ کا بڑا انسان موجود ہونا چاہیے وہ شاید موجود نہیں۔

در اصل مولانا مودودیؒ کی شخصیّت کی تصویر اتنی پھیلی ہوئی ہے اور اس کے اتنے درخشاں گوشے سامنے ہیں کہ ان سب کا احاطہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے، پھر سوال صرف اسے پیش کر دینے کا نہیں، پیش اس طرح کرنا ہے کہ قاری یہ محسوس کرے کہ جیسے اس نے

تصویر اپنی آنکھوں سے دیکھ لی ہو۔

مولانا کے اندر ایک داعیٔ حق، ایک متکلمِ اسلام، ایک مفکّرِ حیات، ایک ادیب، ایک خطیب، ایک سیاسی قائد، ایک تنظیم کار بیک وقت جمع ہیں، ان کی شخصیّت سیاسی و تاریخی اور علمی و ادبی ہر لحاظ سے بے حد اہم ہے، اور پھر اس کے ساتھ حسنِ کردار کا اجتماع ان کو اپنے دور کی ایک قیمتی شے بنا دیتا ہے۔ مگر کسی ایسی جامع شخصیّت کے حُسن کو دوسروں تک منتقل کرنا ٹیڑھی کھیر ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اس کام کو کیا ہی نہ جائے۔ کوشش ہی کی راہ کامیابی کی منزل کو جاتی ہے۔ بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں کہ جنھیں ان کے شخصیت نگاروں کا قلم زندگی دیتا ہے، ورنہ وہ ہمیشہ گم نامی میں پڑی رہتیں۔ چنانچہ ڈاکٹر جانسن کے متعلّق کارلائل نے ٹھیک کہا کہ اس کا نام شاعر یا قِصّہ گو یا مقالہ نگار اور مؤلف ہونے کی بنا پر زندہ نہیں ہے، بلکہ وہ زندہ ہے تو باسویل کی لافانی تصنیف کے اوراق کے بل پر زندہ ہے۔ اس سوانح عمری کے متعلّق کہا جاتا ہے کہ دنیا کے سوانحی لٹریچر میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔

دوسری قسم کی شخصیتیں وہ ہوتی ہیں کہ جن کی عظمت ان کے سوانح نگاروں کو بھی شہرت و عظمت کے مقام پر لا کھڑا کرتی ہے۔ شخصیّت نگار کو کسی حسین شخصیّت کے حُسن سے اسی طرح حصّہ ملتا ہے جس طرح مامون نے محبوبہ کی طرف بھیجے ہوئے قاصد کی آنکھوں کے متعلّق لکھا تھا کہ ؎

أَرىٰ أَثَرًا مِّنْهُ بِعَيْنَيْكَ بَيِّنًا
لَقَدْ أَخَذَتْ عَيْنَاكَ مِنْ عَيْنِهِ حُسْنًا

(تیری آنکھوں نے میری محبوبہ کی آنکھوں سے حُسن کا جو ہر قبول کیا ہے۔ میں اس کا واضح اثر تیری آنکھوں میں دیکھ رہا ہوں)

اس کی مثال میں مولانا مودودیؒ کی شخصیّت کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ کوئی بھی شخص جو آج یا کل مولانا کی شخصیّت یا سوانح کو دنیا کے سامنے شایانِ شان طریق سے لائے گا اس کا نام مولانا مودودیؒ کے نام کے ساتھ زندہ رہے گا۔

آج نہیں کہا جا سکتا کہ کسے یہ مقام حاصل ہوگا۔!

مولانا مودودیؒ کی شخصیّت اور سوانح میں بہت ہی غیر معمولی اہمیّت کیوں پیدا ہو گئی ہے؟

سچ یہ ہے کہ شہرت کی زر نگار قبائیں دیکھ کر نگاہ کتنے ہی مواقع پر رکی ہوگی، مگر وائے ناکامی کہ ان قباؤں میں انسان کم ہی ملا۔ فرماں رواؤں کے طنطنے دیکھے، ادیبوں کے چمنستان ہائے نگارش دیکھے، شعراء کی زمزمہ سنجیوں سے استفادہ کیا، جادو بیان خطیبوں کو عقائد و احکام کی وضاحت کرتے اور کفر و ایمان کے فیصلے کرتے دیکھا، مگر کم ہی ایسا ہوا کہ انسانیت کے حُسن سے دامنِ نگاہ بھرا ہو۔ کیا پوچھتے ہو ؂

آدمیّت! تیری تلاش رہی
دیکھے ہیں پردہ ہائے نام بہت

مگر مودودی کے اندر انسان کو موجود پایا اور زندہ پایا۔ اور اسے انسانِ عظیم پایا۔ مودودی کی عظمت تاریخی لحاظ سے یہ ہے کہ اس نے تاریخ کے دھارے پر بہنے والے انبوہ ہائے کثیر کے بالمقابل، دھارے سے لڑنے کا مسلک اختیار کیا ہے۔ بہنے والے وہ بھی ہیں جو پانی پر پُر شکوہ تخت بچھائے بہہ رہے ہیں۔ وہ بھی جو خوب صورت بجروں میں بہہ رہے ہیں۔ وہ بھی جو براہِ راست موجوں کی آغوش میں جھولے لیتے ہوئے بہہ رہے ہیں۔ اور وہ بھی جو غوطے کھا کھا کر بہہ رہے ہیں، اور یہ بہنے والے ایک ایک کرکے ڈوب بھی رہے ہیں۔ مادّہ پرستی کے اس طوفانِ مغرب میں جو قیمتی عنصر دھارے کے خلاف لڑ رہا ہے یا کم سے کم قدم جمائے کھڑا ہے یا کھڑا رہنے کی سعی کر رہا ہے، اس کے درمیان مولانا مودودی کو ایک امتیازی مقام حاصل ہے۔ کیوں کہ وہ وقت کی ہوا کے ساتھ چلنے پر ایک لمحہ کے لیے بھی کبھی راضی نہیں ہوئے، بلکہ برابر ہوا کا رُخ بدلنے کے لیے کوشاں رہے ہیں۔

دراصل کسی دینی ملّت کی ساری زندگی کش مکش میں ہوتی ہے کیونکہ اسے ایک واضح عقیدہ اور معیّنہ ضابطہ کے تحت پورے نظام کو چلانا ہوتا ہے۔ مگر حالات کی ہوائیں موافق ہی نہیں، مخالف ہو کر بھی چلتی ہیں۔ مخالف ہواؤں کے چلنے پر سفینۂ تمدّن کا رخ اپنے اصولی نصب العین کی جانب رکھنا ایک کٹھن کام ہے، یہی کٹھن فریضہ ملّتِ اسلامیہ نے بخوبی سرانجام دیا۔ مگر بعد میں بدلتے حالات کا مقابلہ کما حقہٗ جاری نہ رہا۔ ایک اصولی نظام کا رُخ تاریخ کسی قدر موڑ لے گئی۔ مسلمانوں پر ماضی میں ایسے دو بڑے خوفناک دور آئے۔ ایک عبّاسی دور، دوسرے سلطنتِ مغلیہ میں اکبر کا دور۔ اِن دونوں موقعوں پر جو قوّت سفینۂ ملّت کی

ناخدائی کر رہی تھی۔ وہ طوفانی ہواؤں اور موجوں کے سامنے خم کھا گئی۔ اور ان دونوں موقعوں پر طوفان سے لڑنے اور نظریہ و اصول کو بحال رکھنے کی سعادت ان مردانِ خدا کے حصّے میں آئی جن کے پاس ایمان، علم اور کردار کے سوا دوسری طاقت نہ تھی، اور اب تیسرا سنگین ترین دور درپیش ہے جس میں باہر سے فکری، سیاسی اور ثقافتی اثرات کا طوفان خوفناک رفتار سے پورے عالمِ اسلام میں اُمڈ رہا ہے۔ جدید تعلیم یافتہ طبقے اور ان سی اُٹھے ہوئے اربابِ قیادت جن پر قلعہ کے بچاؤ کی ذمّہ داری عائد ہوتی ہے، ذہنی غلامی کے روگ نے ان سے تابِ مقاومت سلب کرلی ہے اور وہ ہنستے مسکراتے اور خوش آمدید کہتے ہوئے کنجیاں دشمن کے حوالے کر رہے ہیں۔ عالم وہ ہوگیا کہ ؎

مستی سے اُس نگاہ کی لے محتسب خبر
دنیا تمام بزمِ خرابات ہوگئی

یہی وہ خطرناک مرحلہ تھا جس کے لیے اقبال نے یہ احساس قوم کو دلانا چاہا تھا کہ تم میدانِ جنگ میں ہو اور یہ موقع نوائے چنگ سے لطف اندوز ہونے کا نہیں، بلکہ اس مردِ فردانگر نے "دورِ حاضر کے خلاف" اس بھروسے پر اعلانِ جنگ بھی کر دیا تھا کہ قوم کے نوجوان اس کے اعلان پر صف بستہ ہو جائیں گے۔ آج اگر وہ نغمہ طرازِ جہاد اُٹھ کے دیکھے کہ اس کے شاہین و عقاب کس شان سے پسپا ہوئے ہیں، تو اپنے رجز کو واپس لے کر شاید مرثیہ پڑھنے پر مجبور ہو جائے۔

بہ ہر حال اقبال کے اعلانِ جنگ کی لاج رکھی تو مولانا مودودی نے، کہ خود ہی فکری و تہذیبی جنگاہ میں سینہ سپر نہیں ہوئے، بلکہ قوم کے اندر سے جی دار اور صاحبِ کردار عنصر کو اپنے گرد سمیٹا اور آج اگر معرکہ گرم ہے تو اس شخص کے دم سے!

فیضی! احسنت ازیں عشق کہ دوراں امروز
گرم دار دزِ تو ہنگامۂ رُسوائی را!

مولانا مودودی نے اس کوشش میں اپنی پوری زندگی کھپا دی ہے کہ حالات کے سامنے جھک کر اپنے اصولوں کو مسخ کرنے کے بجائے ہم اصولوں کو قائم رکھنے کے لیے حالات سے جنگ کریں، اسلام کو ہم اپنی سہل طلبی کی وجہ سے تاریخ کے تابع نہ کر دیں، بلکہ تاریخ کو

مجبور کردیں کہ وہ اسلام کے منشار کے مطابق ڈھلے ۔ مودودی کا مشن یہ ہے کہ ہم مغربیّت کے سانچے میں آرام سے نہ ڈھل جائیں ، بلکہ مغربیّت کے مقابل میں اسلامی نظریہ ، اسلامی نظامِ حیات اور اسلامی تہذیب کو برپا کریں ۔

یہ درحقیقت اپنی خودی کے تحفظ اور اپنی ہستی کی بازیافت کا پیغام ہے ۔ اس پیغام سے اثر پذیر ہونے والوں کا احساس یہی ہو سکتا ہے کہ ؎

بے خودی لے گئی کہاں ہم کو
دیر سے انتظار ہے اپنا

مادّیّت کے مقابلے میں کھڑے ہونے کے لیے جس ایمان و شعور کی ضرورت ہے اسے نوجوانوں میں اُبھارنے کے لیے مولانا مودودیؒ نے ایک عظیم فکری کارنامہ انجام دیا ہے ہزارہا صفحوں پر پھیلا ہوا لٹریچر فراہم کیا ہے ۔ جس میں کتاب و سُنّت کی حکمت اور علومِ حاضر دونوں کی روشنی میں تہذیبِ مغرب کے خلاف اپنا مقدّمہ نہایت مدلّل طور پر ثابت کیا ہے اور اسلام کی اساسی صداقتوں سے لے کر اس کے اصول و احکام تک ہر چیز کو اس طرح منقح کر دیا ہے کہ اس دور کے عقلیّت زدہ ذہن اس کے زیرِ اثر فکری انقلاب سے دوچار ہو جاتے ہیں اور انھیں محسوس ہوتا ہے کہ انھیں اپنی گم شدہ ہستی دوبارہ ہاتھ آگئی ہے ۔ مولانا مودودی نے اسلام کو انفرادی مذہب کی حیثیت سے نہیں ، پوری زندگی کے بہترین نظامِ عدل کی حیثیت سے متعارف کرایا ہے اور بے شمار دلوں کو اس کی برتری کے اعتراف پر مجبور کر دیا ہے ۔ اتنا ہی نہیں انھوں نے اس نظام کو عملاً قائم کرنے کی جدّوجُہد کے لیے نوجوان طاقت کو اُٹھا کھڑا کیا ہے ، شہریوں میں ، دیہاتیوں میں ، تاجروں میں ، ملازمین میں ، ادیبوں اور صحافیوں میں ، طلبہ میں ، خواتین میں ، مزدوروں میں ، غرضیکہ ہر طبقے میں ایک فعّال طاقت موجود ہو گئی ہے ۔

اس معرکہ استدلال میں ایسی بھرپور فتح مولانا مودودی کو حاصل ہوئی ہے کہ بے اختیار یہ شعر نوکِ قلم پر آگیا ہے ؎

صَمَتْنَا فَلَمْ نَتْرُكْ مَقَالاً لِصَامِتٍ
وَقُلْنَا فَلَمْ نَتْرُكْ مَقَالاً لِقَائِلٍ

"ہم جب خاموش ہوئے تو کسی خاموش بیٹھنے والے کے لیے کہنے کی
کوئی بات باقی نہ رہی، اور جب ہم نے بات کی تو ہم نے کسی بات کرنے
والے کے لیے کوئی موضوع نہ چھوڑا۔"

مولانا مودودی کا لٹریچر آج پاکستان ہی کی ایک ایک بستی میں موجود نہیں ہے، بلکہ متعدد دوسری زبانوں میں ترجمہ ہو کر عالمِ اسلام اور یورپ اور امریکہ میں بھی پھیل رہا ہے۔ اس کے نفوذ کا یہ حال ہے کہ مولانا کے مخالفین تک کے ذہنوں میں اس کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔ اس لٹریچر کے چھیڑے ہوئے مسائل، اس کا طرزِ فکر اور اس کی اصطلاحات کس گوشے میں موجود نہیں! بارہا اُونچے اُونچے ایوانوں سے ایسی تقاریر سُنی گئی ہیں جن میں یہ لٹریچر بول رہا ہوتا ہے۔ یعنی ع

اب وہی سارے زمانے کی ادا ٹھہری ہے

مولانا مودودی محض حکیم، مفکّر اور ادیب ہوتے اور صرف اپنا پیغام ہی دے جاتے تو بھی ان کی عظمت کے کنگروں کو چھونا بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا۔ مگر انھوں نے انقلاب کی عملی جدّوجہُد کی ذمہّ داریاں بھی اٹھائی ہیں اور مردانہ وار اٹھائی ہیں!

قوم کو پکارا، لبّیک کہنے والوں کو جمع کیا، ان کو نظم میں پرو دیا، ان کی تربیت کی نصب العین کے لیے ان کو وقت، قوای اور مال کی قربانی دینے کا درس دیا۔ ان کو سیاسی وعمرانی مسائل کا گہرا شعور دیا، ان کو مفاد کی کشمکش سے بے نیاز رہ کر زندگیوں کو انسانی اور ملکی خدمت کے لیے وقف رکھنے کا جذبہ دیا، پھر اس بہم شدہ قوت کے بل پر ایک طرف الحاد پسند، کمیونسٹ، مغرب پرست اور جاہ طلب عناصر کی مزاحمت نظریاتی اور سیاسی میدانوں میں جاری رکھی، دوسری طرف عوامِ ملک کو اسلامی نظام کے لیے تیّار کرنے کی مہم چلائی۔ اخلاقی فساد کا مقابلہ کرنے کے لیے "انجمن تحفّظِ اخلاقِ عامہّ" کی تاسیس کی، تعلیمِ عوام کے لیے قرآن وحدیث کے درسوں، دارالمطالعوں، تعلیم بالغاں کے اداروں اور اسکولوں اور مدارس کا اِجرا کیا، وقت کے مسائل سے جمہور کو آگاہ رکھنے کے لیے سلجھے ہوئے خطیبوں اور مقرروں کی ایک بہت بڑی ٹیم میدان میں اتاری، محنت کشوں کو ان کے حقوق دلوانے کے لیے جدّوجہد کا آغاز کیا، غریب طبقوں کو بیماریوں سے

بچانے اور بڑے بڑے مواقع مصائب پر سہارا دینے کے لیے شعبۂ خدمتِ خلق قائم کیا۔ خواتین میں دین، اخلاقیات، اجتماعی مسائل کا شعور اور جدّوجہد کا جذبہ پھیلانے کے لیے ان کی تنظیم کی، نوجوان طلبہ کو الحاد، کمیونزم اور مغربیّت کا مقابلہ تعلیمی دائروں میں کرنے کے لیے خطوطِ کار بہم پہنچائے اور ان کو رہنمائی اور تربیت دی، ادب کی دنیا میں اسلامی قدروں کے مشعل بردار کھڑے کیے۔ غرضیکہ زندگی کے ہر شعبے میں تعمیرِ نو کے لیے ایک حرکت پیدا کر دی۔

آج اتنی رفیعُ الشان دینی و قومی خدمات کو انجام دینے والی مشین نصب ہو چکی ہے اور اس کے پُرزے حرکت کر رہے ہیں۔

بدقسمتی سے مولانا مودودی کو نہایت گھٹیا حریفوں سے سابقہ پڑا اور زمانے نے اس داعئ فلاح کا خیر مقدم اوّلاً گالیوں، پھبتیوں، الزام تراشیوں اور تکفیر و تفسیق سے کیا (اور یہ سلسلہ کسی نہ کسی حد تک برابر جاری رہا ہے) اور پھر غدّاری اور تخریب اور پاکستان دشمنی کے سیاسی الزامات وضع کیے گیے۔ یہاں تک کہ آخر کار سیفٹی قوانین کے ترکش سے تیر برسائے جانے لگے۔ قید و بند کے دور آئے اور بالآخر ایک دن اس مسافرِ راہِ حق نے دیکھا کہ پھانسی کی کوٹھری اس کی منزل بن گئی ہے۔

چلی تھی بات جو منبر سے دار تک پہنچی
قلم کی نوک سے خنجر کی دھار تک پہنچی
مگر صدا تری گردوں کے پار تک پہنچی

ظلم و جور کی یہ بھٹی ہر داعئ حق کے لیے گرم کی جاتی ہے۔ کیوں کہ بغیر اس سے گزارے کھرے کھوٹے کا امتیاز نہیں ہو سکتا۔

بچہ گیرند عیارِ ہوس و عشق دگر
رسمِ بیداد مباد از جہاں برخیزد!

اسی لیے عشق کی نگری کا یہ دستور ہے کہ کلمۂ خیر کہیے اور گالیاں کھائیے۔ پھول برسائیے اور کانٹوں سے دامن بھریئے، موتی لٹائیے اور پتھر کھائیے۔ بے لوث خدمت کیجیے۔ اور مجرم ٹھہریے۔ راستی کے مسلک پر چلیے اور تعزیر بھگتیے۔

مولانا مودودیؒ کی شخصیت، بفضلہٖ تعالیٰ ان بھٹیوں سے گزر کر کھرا سونا ثابت ہوئی۔
اور آج اس لمبی کشمکش، عمر بھر کی تعمیری جدّوجہد اور امتحانِ بلا کی لذّت کشی نے صورت ایسی پیدا کر دی ہے کہ مولانا مودودیؒ راہِ حق کی ایک علامت ٹھہرے ہیں۔ امام احمد بن حنبلؒ عقوبت سے گزرنے کے بعد اپنے دور میں علامتِ حق بن گئے تھے اور ان کی ذات معتزلہ اور دوسرے فتنہ طرازوں کے مقابل میں محاذِ سُنّت کا ایسا مرکز بن گئی تھی کہ ایک شاعر پکار اُٹھا ؎

تَرٰی ذَا الْھَوٰی جَھْلًا لِاَحْمَدَ مُبْغِضًا
وَتَعْرِفُ ذَا التَّقْوٰی یُحِبُّ ابْنَ حَنْبَلٍ

"تو بندگانِ ہوس کو دیکھتا ہے کہ وہ جہالت زدہ ہوں گے اور احمد بن حنبلؒ سے بغض رکھتے ہوں گے اور اہلِ تقویٰ کو تو اس علامت سے پہچان سکتا کہ ابنِ حنبلؒ کے لیے ان کے دلوں میں محبّت موجزن ہوگی۔"

مولانا مودودی بھی اس دور میں اور اس ملک میں حق کے محاذ کی ایک نمایاں علامت بن گئے ہیں، وہ ایک شخص نہیں رہے، بلکہ ایک دعوت، ایک پیغام، ایک تحریک، ایک جدّوجہد، ایک نظامِ زندگی اور ایک انقلابی محاذ کا مظہر ہیں۔

عینی مشاہدہ ہے کہ صدہا لوگ آتے ہیں، ایک نظر مولانا مودودی کو دیکھتے ہیں، اور بس اتنے ہی سے ان کی امیدیں، امنگیں اور ہمتیں استوار ہو جاتی ہیں۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ تجدید و احیائے اسلام کا کام اس تاریک ترین دور میں بھی ہو سکتا ہے انھیں یقین ہو جاتا ہے کہ رات کتنی ہی لمبی ہو اس کی کوکھ سے صبح جنم ضرور لے گی۔

اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مودودی کے اندر جو انسانِ عظیم پایا جاتا ہے وہ بہ حیثیت انسان کش مکش اور امتحان ہی کے مراحل میں نہیں، بلکہ غیر معمولی درجے کی شہرت و اعزاز کے درمیان بھی برابر حسن پاش رہا ہے۔ اس کی طرف سے کسی کو کچھ بھی گھٹیا پن کا تجربہ نہیں ہوا۔

ہزارہا انسان اس سے ہر سال ملتے ہیں۔ ہر روز مختلف طبقوں کے اور علاقوں کے نت نئے ملاقاتی آتے ہیں، مختلف قسم کے ظروف و احوال میں اسے دیکھتے ہیں۔

مگر اسے دیکھ کر کبھی کسی کو مایوسی نہیں ہوئی۔

حتّٰی کہ اس کے نادان حریف بھی تنہائیوں میں یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ آدمی بس وہ ایک ہے جو نہ کبھی بکا، نہ جھکا۔

جی ہاں! لوگوں نے عجیب عجیب حرکتیں کیں۔

بعض نے اسے نظر انداز کرنا چاہا کہ گویا وہ موجود ہی نہیں۔ انھوں نے اس سے آنکھیں بند کرلیں، لیکن ان کے مساموں کو بھی دکھائی دیا کہ ایک کوہِ گراں سامنے کھڑا ہے اور یہ تردید نہیں کی جاسکتی کہ وہ موجود نہیں ہے یا وہ محض ایک ذرّۂ ناچیز ہے، بعض نے بہت اونچی اونچی مسندیں بچھاکر مصنوعی مناصب کی بلندیوں سے اسے دیکھا کہ شاید وہ اس طرح ان کے مقابلے میں پست رہ جائے گا مگر اس سروِ بلند و بالا کا قامت کوتاہ نہ ہوسکا۔ بعض نے اسے "ملّا" کہہ کر ادنیٰ بنانا چاہا، مگر اندازہ ہوا کہ بحیرۂ عرب کو "چہ بچہ" کہہ کر سکیڑنے کی کوشش کا کچھ حاصل نہیں۔ یہ مقامِ قدرت کی دین ہے۔ کیا خوب کہا تھا، بغداد کے رند شاعر ابو نواس نے کہ ؎

وَلَا یَطْمَئِنَ فِی ذَالِكَ مِنِّیْ طَامِعٌ
وَلَا صَاحِبُ التَّاجِ الْمُحَجَّبُ فِی الْقَصْرِ

(مجھ سے میرے مقامِ فقر کو چھیننے کے لیے کسی شائق کا جی نہ للچائے، حتّٰی کہ اس تاجدار کو بھی اس کے درپے نہ ہونا چاہیے جو قصرِ شاہی کے سراپردہ میں دربانوں کے درمیان گھرا بیٹھا ہے۔)

ایسی درخشاں شخصیّت کی سوانح نگاری یا شخصیّت نگاری کی ذمّہ داری اٹھانے والوں کے لیے ایک اہم کام یہ ہے کہ اس کی شخصیّت کا صحیح مرتبہ اور مقام اور موقف واضح کریں۔ ہونے کو تو یہ کام از خود ہو رہا ہے اور ایک شمعِ روشن کے گرد کتنا بھی غبار کیوں نہ پھیلا رہے وہ اپنے تعارف کیلیے اس کی محتاج نہیں ہوتی کہ کوئی قصیدہ خواں یہ بیان کرے کہ یہ شمع ہے اور اس کی روشنی بھی ہے۔ ابو نواس کا جو شعر اوپر درج ہوا ہے اسی کے ساتھ ایک مصرع ہے۔ ع

فَمِیْ عَنْ جَمِیْعِ النَّاسِ حَسْبِیْ مِنَ الْفَخْرِ

(میرا دہن، یعنی کلام تمام لوگوں کے مقابلے میں میرا سرمایۂ افتخار بننے کو کافی ہے)

سو مولانا مودودی کے لیے بھی ان کا اپنا ایمان و کردار ان کا مقام متعیّن کرنے کے لیے

کافی ہے، مگر معاصرت زدہ عناصر (خصوصًا سیاسی حلقے) جب کسی کام کے آدمی کے گرد تعصّبات اور غلط فہمیوں کا غبار پھیلا دیتے ہیں تو بہت سے لوگ استفادہ کرنے سے محروم رہ جاتے ہیں۔ تا آنکہ حقیقت از خود ان سے اپنا حقیقت ہونا تسلیم کرائے۔

بڑا سوال یہ ہے کہ معاشرے میں تاریخ میں، اور اپنے دور میں اس کی جگہ کیا ہے؟

معاشرے میں لوگوں نے اسے زیادہ سے زیادہ علمار کی صفوں میں جگہ دی ہے۔ تاریخی کشاکش کے لحاظ سے اسے حریفوں نے ایک اقتدار طلب شخصیت کے رنگ میں دکھانا چاہا ہے اور دور کے لحاظ سے اسے بیرونی اور اندرونی مخالفین نے مغرب کے اسلام دشمن پروپیگنڈا کی مروّجہ اصطلاح کے مطابق ایک قدامت پسند اور رجعتی شخصیت ثابت کرنے کی کوشش کی ہے حالانکہ معاشرے کے موجودہ طبقوں میں سے کسی میں بھی مولانا کی ذات پوری طرح نصب نہیں ہوتی ان کے لیے ایک نئی جگہ درکار ہے۔ کیوں کہ وہ قدیم وجدید طبقوں کے درمیان بالفاظِ خویش "پیچ کی راس"، کے آدمی کی حیثیت سے کھڑے ہیں۔ تاریخی کش مکش کے لحاظ سے وہ اسلامی نظریہ اور اصولوں کو برسرِ اقتدار لانے کے لیے کوشاں ہیں۔ دور کے لحاظ سے وہ علم اور سائنس کی ساری ترقیوں سے استفادہ کرنے اور مسائلِ تازہ کو اجتہادی زاویۂ نگاہ سے حل کرنے کے داعی ہوتے ہوئے مادّیّت کا طلسم توڑ کر انسانیّت کی لازوال اخلاقی قدروں پر تمدّن کی بنیاد رکھنے کے خواہاں ہیں۔

مگر کم لوگ، ا ر مخالفین میں تو بہت ہی کم لوگ ان کے صحیح مقام کو جان سکے ہیں۔ یہ کام مولانا کے سوانح نگار اور شخصیّت نگار کا ہے کہ وہ ان کو صحیح مقام پر دکھائے میرا کام محض تعارف کرانے تک محدود ہے اور شخصیّت نگار کا کام اس سے آگے شروع ہوتا ہے۔

ایک انسان

کہتے ہیں کہ پاکستان میں خوراک کی کمی ہے، تعلیم کی کمی ہے، اسلحہ کی کمی ہے۔ اور دوسری طرف آدمیوں کی بہتات ہے، لیکن سچ یہ ہے کہ یہاں سب سے خوفناک آدمیوں ہی کا توڑا ہے کوئی قوم اگر آدمیوں کے قحط سے دوچار نہ ہو تو ہر چیز کی کمی وہ پوری کرلے جاتی ہے۔ بلاشبہ مردو زن کا "بے پناہ"، ہجوم یا ایک ٹھاٹھیں مارتا "سمندر" ہے جو پاک زمین کے حصے میں آیا ہے۔ دس کروڑ نفوس! ان میں وزیر بھی ہیں، لیڈر بھی ہیں، ایم ایل اے بھی ہیں، صحافی بھی ہیں، ادیب اور اہلِ فن بھی ہیں، تاجر اور صنّاع بھی ہیں، سپاہی اور سپہ گر بھی ہیں، لیکن انسان بہت ہی کم ہیں۔ "بڑے آدمی"، ہماری قسمت میں بہت لکھے گئے ہیں۔ لیکن "آدمی" ہمارے پاس نہیں ہیں! آج بھی ہمارے شہرِ زندگی کے گرد پیرِ رومی کا "شیخ" چراغ ہاتھ میں لیے سرگرداں ہے اور الاپ رہا ہے کہ "انسانم آرزوست!"، ہوسکتا ہے کہ ہمارے ہاں روایتی مردم شماری کا ریکارڈ کئی اونٹوں کا بوجھ ہو، لیکن اگر ہم اپنے ہاں کے ہر ذی عقل "معاشی حیوان" کو محض بطورِ مروّت انسان کہنا چھوڑ دیں تو پھر شاید مردم شماری کا سارا اندراج چاول کے ایک دانے پر ہو سکے گا! یہ آپ نے سنا ہوگا کہ ماہرِ فن خطّاط چاول کے دانے پر پوری سورۂ یٰسین لکھ دکھاتے ہیں۔! ہمیں آدمی بننے کے لیے ابھی ارتقا کی بڑی لمبی اور کٹھن راہ طے کرنی ہے۔

"آدمی"، گوشت اور ہڈی کے اس بولتے اور چلتے پھرتے ڈھانچے کو نہیں کہتے جس پر چند اندرونی خواہشیں سواری کرتی ہیں۔ آدمی نام ہے شعور اور احساس کا، آدمی نام ہے اصول اور ایمان کا، آدمی نام ہے سیرت اور اخلاق کا۔ اور یہ مخلوق ہمارے ہاں ایک ناقابلِ ذکر اقلّیت کا مقام رکھتی ہے۔

ابو الاعلیٰ مودودی اس اقلّیت کا ایک فرد ہے ——— "ایک آدمی!"

وہ اگرچہ ایک انقلابی مفکّر بھی ہے، ایک سحر طراز ادیب اور خطیب بھی، لیکن اس کی بڑائی کا اصل راز یہ ہے کہ وہ ایک آدمی ہے۔ ایک ایسا آدمی جو پاکستان بھر میں نمایاں ہے اگر ہم ہمالہ کی کسی چوٹی پر کھڑے ہو کر ارضِ پاک پر نگاہ ڈالیں تو شاید پہلی نگاہ اسی شخصیّت کے حصّے میں آئے گی۔ آخر کیوں؟ اس لیے کہ یہ ایک ایسی شخصیّت ہے کہ جس کی اہمیّت کسی آبائی

جاگیر، کسی سرکاری عہدے، کسی خاندانی منصب اور کسی مصنوعی شہرت اور نمائشی پروپیگنڈے کے سبب نہیں، بلکہ محض ایک نظریہ و مقصد، ایک سیرت و کردار، ایک سرگرمِ عمل انسان کے بل پر ہے۔ وہ بڑا آدمی ہے تو فقط اس بنیاد پر کہ وہ ایک آدمی ہے، وہ ایک انسان ہے!

ہاں مگر ـــــــ اب مودودی ایک فرد کا نام نہیں رہا۔ اب اس لفظ کو بولتے ہی زندگی کا ایک مکمل فلسفہ، ایک اجتماعی کیریکٹر، ایک سیاسی تصوّر، ایک منظّم تحریک اور ایک نصبُ العین نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ مودودی کا نام لیتے ہی اسلامی دستور کے مسائل ذہن میں اُبھرنے لگتے ہیں اور اسلامی نظام کا ہیولیٰ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ اس معیار کی شخصیّتوں کو ہمیشہ دیکھا اور دکھایا جاتا ہے۔ دیکھنا اور دکھانا ایک تو "اکابر پرستی" کے گھٹیا جذبے سے ہوتا ہے، لیکن اس دیکھنے اور دکھانے کا ایک اعلیٰ محرّک بھی ہے اور وہ یہ کہ ان اوصاف اور عادات کو معلوم کیا جائے جنھوں نے ہم جیسے کسی پیکرِ آب و گِل کو ابنائے نوع کے لیے بہت بڑے پیمانے پر خیر و برکت کا سرچشمہ بنا دیا ہوتا ہے۔ اس تحریر کا منشاء بندگانِ خدا کے لیے ایک نیا ذہنی دیوتا گھڑ کے پیش کرنا نہیں ہے، بلکہ ہم یہی جاننا چاہتے ہیں کہ یہ شخص جس کے نام سے پاکستان کا ایک اَن پڑھ دیہاتی تک واقف ہے اور جس کا حلقۂ تعارف عراق اور شام اور حجاز تک پھیلا ہوا ہے آخر اس کا اصل جوہرِ شخصیّت کیا ہے!

جو لوگ بڑے آدمی کہلاتے ہیں ان کی سب سے بڑی چھوٹائی یہ ہوتی ہے کہ ان کا بڑا پن بالعموم ان کی شخصیّت پر باہر سے ایک خول کی طرح چڑھا ہوتا ہے۔ اس چمکتے دمکتے خول کو دُور ہی دُور سے دیکھتے رہیے تو بڑی مرعوبیّت طاری رہتی ہے۔ اس کے اندر کے آدمی سے اگر مڈبھیڑ ہو جائے تو ناظر کے تصوّرات کے محل چکنا چور ہو جاتے ہیں، لیکن مودودی کی شخصیّت اپنے بیرونی مظاہر سے لے کر اپنے باطنی جوہر تک بالکل یکساں اور یک آہنگ ہے، بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مودودی کی سوانح عمری اس کی پیشانی اور چہرے پر لکھی ہوئی ہے۔ مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم جلاوطنی کا دور ختم کر کے واپس تشریف لائے تو کسی موقع پر ریل میں سفر کرتے ہوئے لاہور سے گزرے۔ مولانا مودودی ان سے ملاقات کرنے پلیٹ فارم پر پہنچے، مگر کچھ معلوم نہ تھا کہ مولانا سندھی کس درجے میں ہیں۔ تلاش میں تھے کہ مولانا سندھی مرحوم نے دیکھتے ہی خاص طور پر متوجّہ کر کے (غالباً کھڑکی سے) مصافحہ کیا اور پہلے سے ملاقات نہ ہونے کے باوجود بڑے

جزم و یقین کے ساتھ استفہامیہ انداز میں فرمایا۔ "آپ مولانا مودودی ہیں نا"؟ پہلی بار ایک چہرے کو اور وہ بھی ایک نظر دیکھ کر غائبانہ تعارف کے بل پر ایک شخصیّت کو پہچان لینے کی جو حیرت انگیز نظیر سندھی صاحبؒ نے قائم کی وہ خود شاہد ہے کہ مودودی کا ظاہر اس کے باطن کا کتنا مکمل آئینہ دار ہے۔ ظاہر و باطن کے درمیان خود پیدا کردہ فاصلے نہیں ہیں، تصنّع اور تکلّف کے پردے نہیں ہیں، تضاد اور تناقض ہے دُور سے جو کچھ دکھائی دیتا ہے، قریب آکر وہی اور زیادہ نکھر کر نگاہوں میں آجاتا ہے۔

آج سے سترہ اٹھارہ برس پہلے کی بات ہے، اور اگر میں ان برسوں کی گنتی کر کے گن نہ لیتا تو میرا گمان یہی ہوتا کہ گویا کل کا واقعہ ہے ـــــ میں ابھی اپنے گاؤں ہی میں مقیم تھا اور آئندہ زندگی کے متعلّق بنتے بگڑتے نقشوں میں گُم سُم کچھ لکھنے، کچھ سوچنے اور زیادہ تر پڑھنے اور سمجھنے میں مصروف! اُس چھوٹی سی دور افتادہ دیہی آبادی کے برانچ پوسٹ آفس میں ہر روز ڈاک کا مَیلا سا جو تھیلا آیا کرتا تھا۔ اس میں میرے نام کا کوئی نہ کوئی اخبار یا رسالہ ضرور ہوتا۔ ایک رسالے میں مولانا کے نام سے جب پہلا مضمون میری نظر سے گزرا تو مضمون نگار کا نام ابوالاعلیٰ مودودی بڑا ہی عجیب لگا۔ یہ مضمون بھی کسی زورِ بیان کا متحمل نہیں تھا کیوں کہ اس میں محض ایک اسلامی نو آبادی ـــــ دارالاسلام ـــــ کے علمی قیام کی دعوت دی گئی تھی۔ [1] اس تحریر میں سادگیِ بیان کا حُسن تو تھا ہی، مگر اس کا خاص اثر (جواب تک میری کتابِ ذہن کے اوراق پر ثبت ہے) یہ تھا کہ لکھنے والا ان تمام لکھنے والوں سے مختلف چیز ہے جنھیں میں جانتا تھا اور اس کے اندر بڑا غیر معمولی پن ہے۔ ہمارے ہاں کی روایت کا تقاضا یہ تھا کہ اس ترغیبی مضمون میں ایک تو جوش انگیزی موجود ہوتی اور دوسرے روشن ہی روشن پہلو پیش کیے جاتے، لیکن نہیں، جذباتیت کے بجائے اس کا مزاج فکری تھا اور اس میں روشن پہلوؤں کے ساتھ مشکلات و موانع کو بھی قاری

---

[1] ایسی آبادیوں کے ایک تخیّل کا نقش میرے ذہن نے علّامہ اقبالؒ کے ایک مطبوعہ خطبے سے اخذ کیا تھا اسی پس منظر کے ساتھ میں نے اس مضمون کو پڑھا۔ واقعہ میں بھی دارالاسلام کی اسکیم کے پیچھے اقبالؒ کا ذہن کام کر رہا تھا۔

کے سامنے رکھ دیا تھا۔ اس کے باوجود بغیر صحافیانہ اور خطیبانہ لفّاظی سے مدد لیے، لکھنے والے نے اس میں پوری پوری ترغیبی روح پیدا کر دی تھی۔ اس مضمون کے بین السّطور کے دھندلکے میں ایک نئی قسم کی شخصیّت میرے سامنے تھی جسے پہچاننے سے تو میں قاصر تھا، لیکن جس کی جاذبیّت نے مجھے اسی لمحۂ ناآشنائی میں ... اپنی جگہ سے ہلا دیا۔ یہ کون آدمی ہے؟ یہ انوکھا سا نام کس کا ہے؟ یہ کیا اسکیم ہے؟ بس یہ سوالات سامنے تھے اور مضمون کو بار بار پڑھا جا رہا تھا۔ والدِ محترم سے ذکر کیا، ان کو پڑھ کر سنایا۔ اس رسالے کے مدیر نے اپنے نوٹ میں خود بھی مجوّزہ اسکیم سے دل چسپی کا اظہار کیا تھا، لہٰذا ان کو خط لکھا اور خط کے جواب میں سرسری سی ابتدائی معلومات مزید حاصل ہوئیں، مگر ان معلومات نے مزید تشنگی پیدا کر دی۔ میرے دل میں اس سے قبل صرف ایک ہی ملّی شخصیّت سے غیر معمولی دل چسپی کارفرما تھی ـــــ میرا اشارہ اقبالؒ کی طرف ہے ـــــ لیکن اب ایک اور متوازی قسم کی شخصیّت سے میری دل چسپی کا آغاز ہو چکا تھا۔ بعد میں غائبانہ تعارف کا سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔

۱۹۳۸ء کے بالکل آغاز میں ہفتہ بھر کا پروگرام بنا کر لاہور آیا اور مدّعائے سفر یہی تھا کہ اقبالؒ سے ملاقات کروں گا، بلکہ اس دور کے ذہن کے مطابق کہنا چاہیے "زیارت"، جو بیک وقت پہلی بھی ثابت ہوئی اور آخری بھی۔

چند ہفتے بعد اقبالؒ اپنا نغمۂ حیات افروز پورا کر کے ازلی و ابدی فضاؤں کی طرف پرواز کر گیا۔ اگست ۱۹۳۸ء میں مولانا مودودی کو قریب سے دیکھنے کا اشتیاق لیے ہوئے پٹھان کوٹ کا عزم باندھ کر دوسرا سفر کیا۔ غائبانہ تعارف تو اب کافی آگے تک جا چکا تھا کیونکہ ماہنامہ "ترجمان القرآن" کے متعدّد شمارے نگاہ سے گزر چکے تھے اور "سیاسی کش مکش حصّہ اوّل" کے فکر انگیز مباحث دل و دماغ میں اپنی جگہ پیدا کر چکے تھے اور مولٰینا کے ساتھ کام کرنے والے ایک کرم فرما سے خط و کتابت کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ یہاں اس امر کا ضمناً تذکرہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں اگرچہ ایک غیر سیاسی علاقے کا دیہاتی نوجوان تھا اور عملاً پارٹی پالیٹکس سے بُعد رکھتا تھا، لیکن ملک میں مسلمانوں کو انگریزی استبداد اور متعصّب ہندو اکثریت کی دو بلاؤں سے جو ہمّت آزما کش مکش درپیش تھی اس سے نظری حد تک گہرا ربط رکھتا تھا۔ اپنی پوری قوم کی طرح میں بھی اندھیرے میں تھا کہ اب کیا ہونا

چاہیے اور راہِ نجات کیا ہے؟ مولانا مودودیؒ کی تحریریں دیکھ کر امید کی ایک کرن ہاتھ آئی کہ شاید یہ شخص صحیح طرز پر سوچ رہا ہے اور ممکن ہے کہ اس کے ذریعے الجھنوں کے اس جنگل سے باہر نکلنے کا راستہ مل سکے جو واقعاتی تاریخ کی صورت میں دُور دُور تک پھیلا ہوا تھا۔ میری ابتدائی دلچسپی مذہبی سے زیادہ سیاسی تھی، لیکن خود اس سیاست کے اندر "مسلم قومیت" کی روح تہ نشیں تھی۔

ہاں تو میں گھر سے چلا اور کچھ وقفہ دارالاسلام کی اسی نو آبادی میں رہ کر مولانا مودودی اور ان کے خیالات اور ان کی عملی اسکیم کو سمجھنے کا ارادہ لے کر چلا۔ بس والوں نے اپر باری دوآب نہر کے کنارے اُتارا۔ کچھ دیر کھڑا دیکھتا رہا کہ کوئی دیہاتی آئے اور مزدوری لے کر سامان پہنچا دے۔ آخر اس بستی کا خاک روب "فقیریا" اُدھر سے گزرا اور جب اس کو معلوم ہوا کہ مجھے دارالاسلام جانا ہے، تو اس نے سوٹ کیس اور بستر سر پر رکھ لیا اور ہم چلے۔ میرا یہ رہنما مجھے بسوں کی سڑک کے بجائے ریل کے پُل کے راستے لے گیا جو نیچے سے بند نہیں تھا اور ایک ایک قدم اس کے (غالباً ستّر) سلیپروں پر رکھ کر اُسے پار کرنا پڑتا تھا۔ پہلے تو اتنے لمبے پُل اور اس کے نیچے شور کرتے اور بپھرے ہوئے رواں دواں پانی کو دیکھ کر دل دہل گیا۔ ارادہ کیا کہ واپس ہو کر جرنیلی سڑک کے راستے نہر کو پار کر لوں، لیکن پھر خیال آیا کہ فقیریا کے سامنے مجھے ایسی کمزوری نہیں دکھانی چاہیے۔ چلا مگر دس پندرہ سلیپروں پر لمبے ڈگ بھرنے کے بعد سر چکرایا، بیٹھ گیا، لیکن ایک بار پھر اسی ہمّت افزا خیال نے سہارا دیا اور پھر فقیریا کے نقوشِ قدم پر آگے بڑھنے لگا جو بغیر پیچھے مڑ کر دیکھے بے ساختگی سے چلا جا رہا تھا پل پار کرنے کے بعد جھاڑیوں، درختوں اور سبز گھاس کے بنے ہوئے ماحول میں چند کوارٹر دکھائی دینے لگے۔ اور ان کوارٹروں کے درمیان مسجد اپنے میناروں کی دونوں باہیں اوپر کو پھیلائے کھڑی تھی۔ پہلے سے اطلّاع تھی اور ایک دوست منتظر تھے۔ نہایا دھویا اور پھر ملاقات کا بے چینی سے منتظر رہا۔ غالباً مغرب کی نماز کا وقت قریب ہوا، تو بستی کی مختصر سی آبادی ــــــ تین چار افراد ــــــ مسجد کی طرف سمٹنے لگے۔ اذان ہوئی۔ اور اس کی آواز پر قریب کے ایک بڑے کوارٹر سے ایک شخص برآمد ہوا۔ وائل کا کُرتہ، لٹھے کا "غرارہ نما" پاجامہ، سر پر وائل ہی کی ایک ٹوپی (جو نماز کے لیے گویا خاص تھی) پاؤں میں غالباً باٹا کے سیاہ رنگ کے سلیپر ــــــ پورا لباس اُجلا جو سبز پس منظر میں عجیب شان سی نمایاں

تھا ـــــــ اس سادہ لباس کے ساتھ ایک روشن چہرہ (جلد کی سپیدی کے ساتھ جو ہر سیرت کی مخفی سی دمک لیے ہوئے) جس پر سکّہ بند مذہبی معیار سے چھوٹی شوخ سیاہ رنگ داڑھی کسی تعارف کے بغیر میں پہچان گیا کہ یہ وہی شخص ہے جس کے خیالات سے میں نے تھوڑا سا استفادہ کیا ہے۔ آنے والے نے مسجد میں داخل ہوتے ہی ایک ایسے انداز سے "السلام علیکم" کہا جو آج تک میں نے کسی میں نہیں پایا۔ مؤدّبانہ جھجک کے ساتھ مصافحہ کیا، کھڑے کھڑے دوستوں نے مختصر تعارف کرایا اور پھر جماعت کھڑی ہوگئی۔ نماز کا امام بھی وہی شخص تھا دلچسپ یہ کہ نماز اور قرارت کا اسلوب بھی بے حد ندرت لیے ہوئے تھا اور اس میں بھی اس شخص کی سیرت کی جھلک موجود تھی۔

اپنے پروگرام کے مطابق دو مہینے کا عرصہ میں نے جنگل کے دامن میں آباد شدہ اسی چھوٹی سی بستی میں گزارا۔ مولانا مودودی کا بیشتر وقت ترجمان القرآن کی ادارتی ذمّہ داریوں تصنیفی کاموں اور خط وکتابت میں صرف ہوتا۔ مولانا سے ملاقات یا تو نمازوں کے اوقات پر مسجد کے کشادہ صحن میں ہوتی اور کبھی نماز سے قبل اور کبھی نماز کے بعد بات چیت رہتی یا عصر کے بعد مولانا جب سیر کو نکلتے تو ترجمان القرآن کے منیجر، کاتب، مولانا صدرالدین اصلاحی اور میں ــــــ اور کوئی مہمان آجاتا تو وہ بھی ــــــ سب ساتھ جاتے۔ دین وسیاست کے اہم مسائل پر بحثیں بھی ہوتیں، لطائف بھی ہوتے، بستی اور اس کی مقصدی اسکیم سے متعلق معاملات بھی چھڑتے، ترجمان القرآن اور اس کے مکتبہ کے امور کا تذکرہ بھی ہوتا۔ اور اہم اور دلچسپ خطوط اور باہر سے آئے ہوئے سوالات اور اعتراضات پر بھی بات چیت ہوجاتی۔ اس "بزمِ متحرک" کی دلچسپیاں اور ان کی یادیں تو اب دل ودماغ کا مستقل سرمایہ بن گئی ہیں۔ کبھی مغرب کے بعد کا کھانا یکجائی ہوجاتا اور سلسلۂ گفتگو عشا تک جاری رہتا اس بزمِ متحرّک کا نشہ دو ہی چار دن میں اتنا تیز ہوگیا تھا کہ صبح ہی سے عصر کا انتظار رہتا اور اشتیاق کہتا کہ ع "سورج خدا کے واسطے ہوجا تلے تلے!!"

ابتدائی رابطے کے اس دور کی واقعاتی تفصیلات اب کچھ زیادہ محفوظ نہیں ہیں اور نہ گفتگوؤں ہی کا پورا مواد سامنے رہ گیا ہے، البتّہ وہ تأثرات میں بیان کرسکتا ہوں جن کو اپنے ساتھ لیے میں بعد کے اسلامی تحریک کے اس چھوٹے سے کیمپ سے رخصت ہوا۔

خیالات ہی کے مطالعے سے میں نے اندازہ کرلیا تھا کہ یہ شخص مُولوی نہیں ہے (یہ بات مولویّت کے بارے میں ہر طرح کے تحقیر آمیز تأثر سے الگ ہو کر محض حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر سے کہہ رہا ہوں۔ پہلی بار چہرہ سامنے آنے پر میری نگاہ نے میرے اندازے کی تصدیق کر دی۔ بعد کی ملاقاتوں اور گفتگوؤں نے اس رائے کو قطعی بنا دیا۔ مگر حیرت مجھے اس بات پر تھی کہ یہ شخص "مسٹر" بھی نہیں تھا۔ وہ مومن اور دین کا رمز شناس ضرور تھا، مگر اس کے گرد روایتی تقویٰ کی پُر تکلّف اور بوجھل فضا نام کو بھی موجود نہ تھی۔ وہ آزاد خیال اور وسیع النظر تھا، مگر اس میں وہ لااُبالی پن بالکل نہیں تھا جو اسلام تک کی حدود کو پامال کرتا کہیں کا کہیں جا پہنچتا ہے، اس سلسلے میں ایک گفتگو مجھے نہیں بھولتی جب کہ ہماری "بزمِ متحرّک" میں ڈاڑھی کی بات چھڑی۔ مولانا مودودی کہہ رہے تھے کہ (الفاظ یاد نہیں صرف مفہوم ذہن میں ہے) ڈاڑھی کو آج جو غیر معمولی اہمیّت دے دی گئی ہے اصولاً وہ نظامِ دین میں نہیں تھی، مجھ ایسا روزانہ بدستِ خود شیو بنانے والا اور ڈاڑھی کے بارِ گراں سے ڈرنے والا نوجوان یہ الفاظ سُن کر مطمئن بھی ہوا اور حیرت زدہ بھی!۔ اسی حیرت زدگی میں بے اختیار میں نے سوال کیا کہ کیا ڈاڑھی نہیں رکھنی چاہیے؟ جواب ملا کہ میرا مطلب یہ نہیں، رکھنی چاہیئے لیکن اس کو دینی حلقوں نے جو حد سے بڑھی ہوئی اہمیّت دے دی ہے وہ خود دین میں نہیں پائی جاتی۔ آج تو ایک مسلمان سے مذہبی حضرات کے ہاں جو اہم ترین اور اوّلین مطالبات کیے جاتے ہیں ان میں ڈاڑھی پیش پیش ہے[۱] اس گفتگو سے مجھے یہ بھی اندازہ ہوا کہ یہ شخص متوازن مزاج اور انصاف پسند ہے۔ انصاف پسندی اور توازن کی ایک اور اہم شہادت جو میرے سامنے آئی اس نے بھی مجھ پر گہرا اثر ڈالا۔ ان دنوں میرے دل میں مسلم لیگ

---

[۱] اس سلسلے میں یہ بیان کر دینا مناسب ہوگا کہ لباس، رہن سہن، پردے اور زندگی کے دوسرے پہلوؤں سے متعلق مسائل میں مروّجہ جامد اور انتہا پسندانہ مذہبی تصوّرات اور انکے خلاف نمودار ہونے والے ردِّ عملی نقطۂ نظر کے درمیان مجھے اس خطِ اعتدال کو پا لینے کا موقع ملا جو مدّتوں سے کھو چکا تھا۔ ایسی گفتگوؤں کے زیرِ اثر بنیادی طور پر میرا نقطۂ نظر بدل گیا۔ اگرچہ مجھے اس وقت اس تبدیلی کا پورا شعور نہ تھا۔

کے لیے دبی دبی سی ہمدردی موجود تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ چند دوستوں کی مبلّغانہ بحثوں نے خاکسار تحریک کے بارے میں کچھ جاننے اور سمجھنے کی تحریک بیدار کر دی تھی۔ مودودی صاحب سے کسی موقع پر میں نے علّامہ مشرقی کے نظریے اور ان کی پیدا کردہ تنظیم کے متعلق رائے دریافت کی۔ اس پر ایک لمبا سلسلۂ گفتگو ہماری بزم متحرک میں چھڑ گیا مولانا نے نظریۂ ارتقاء کی توضیح کر کے بتایا کہ درحقیقت علّامہ صاحب نے اپنی فکر اور تحریک کی اساس اسی نظریے پر رکھی ہے اور اوپر سے اسے اسلامی اصطلاحات کا جامہ پہنا دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مولانا نے مشورہ دیا کہ سُنی سنائی باتوں کے بجائے ہمیں علّامہ صاحب کے لٹریچر کو خود دیکھنا چاہیے اور ٹھوس طریق سے کوئی رائے قائم کرنی چاہیے۔ کتابیں مولٰینا کے پاس موجود تھیں۔ جن میں سے "تذکرہ" اور "اشارات"، کو میں نے پڑھا، دونوں کتابوں پر مولانا مودودی کے حواشی موجود تھے اور ان کو میں ساتھ ساتھ دلچسپی اور ذوق تجسّس سے پڑھتا گیا۔ ان حواشی میں کہیں تو کلمہ ہائے اعتراف اور کلمہ ہائے تحسین موجود تھے، کہیں بیزاری اور اختلاف کا اظہار، اور کہیں کہیں فکری لغزشوں پر سخت درجے کی گرفت پائی جاتی تھی۔ ان حواشی کو پڑھنے سے مجھے خاکسار تحریک کی ماہیت سمجھنے کے ساتھ ساتھ مودودی صاحب کی سیرت کے ایک اہم گوشے کو بھی زیادہ اچھی طرح جاننے کا موقع ملا۔ میرے سامنے ابتک زیادہ تر لوگ ایسے ہی تھے جو نظریاتی اور سیاسی میدان میں آ کر کسی کے مخالف ہوں تو اندھے مخالف ہوتے ہیں اور حامی ہوں تو غالی حامی! لیکن اس میدان میں مجھے پہلی بار ایک نئے کردار سے تعارف حاصل ہوا۔

یہ بات بھی میں نے سمجھ لی کہ یہ شخص "با زمانہ ساز" قسم کا آدمی نہیں ہے، نہ جامد اور منفی اور منفعل قسم کی فطرت پر اس کی شخصیّت بنی ہے، بلکہ یہ ایک اصول و مقصد رکھنے والے نایاب مردانِ کار کی طرح "با زمانہ ستیز" کے حوصلے رکھتا ہے۔ تھوڑی سی معلومات کی روشنی میں یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ اس نے ابتک سفرِ حیات با مقصد قربانیاں دیتے ہوئے کاٹا ہے اور آئندہ اس کے سامنے معاشی نقصانات اور سیاسی مخالفتوں کے سنگین ترمراحل ہیں لیکن یہ اپنی منزل سے منہ موڑنے والا نہیں ہے۔

مجھے یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ اس کے سامنے جو کچھ بھی اسکیم ہے (اور واقعہ یہ ہے کہ

اس کی عملی صورت میرے ذہن میں مشخّص نہیں ہوسکی تھی) وہ ایک لمبا پروگرام اور ٹھنڈا طریقِ کار اور کسان کا سا صبر چاہتی ہے۔ یہ ہتھیلی پر سرسوں جما کر کام کے نتائج کی فصل جلد از جلد کاٹ لینے والوں میں سے نہیں ہے اور نہ جوشیلے پن کا مریض ہے۔ جو ہماری قوم کا موروثی روگ بن چکا ہے۔

یہ رائے بھی میرے ذہن میں قائم ہوگئی کہ یہ جو کچھ بھی کرنا چاہتا ہے، اپنے ارادوں میں مخلص ہے اور اس کی متاعِ فکر وعمل منڈی کا مال نہیں ہے۔

سب سے زیادہ مجھے جس چیز نے متأثر کیا وہ میرے جیسے ایک دیہاتی نوجوان کو جس کا علمی یا عملی، دینی یا سیاسی، کسی بھی لحاظ سے کوئی مقام نہ تھا۔ مولانا مودودی کی نگاہوں میں ایک اہمیت حاصل تھی۔ میں نے کسی لمحے یہ محسوس نہ کیا کہ ایک بڑا آدمی کسی اونچے مقام سے مجھے دیکھ رہا ہے اور "بڑے آدمیوں" کے بارے میں میرا جو کچھ تصوّر چلا آرہا تھا وہ مودودی صاحب کے حق میں قطعی طور پر بدل گیا۔ وہاں بُعدِ مراتب کے بجائے میں نے قربِ اُخوّت محسوس کیا۔ یوں یہ حقیقت بھی مجھ پر واضح تھی کہ مولانا "پیرانِ کہن سے نومید ہیں" اور "برجواناں سہل کن حرفِ مرا" کی دعا کے ساتھ قوم کی نئی نسل کی طرف رُوئے سخن رکھتے ہیں۔

الغرض میرے لیے یہ ایک نیا کردار تھا جس کا عنوان تجویز کرنا مشکل تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا تھا کہ یہ ہمارے مستقبل کا "کردار" ہے۔ "اگلے وقتوں" کے لوگوں کے بالکل خلاف "یہ آنے والے وقتوں" کا کردار تھا۔ یہ کردار "مرعوب کن" نہیں، بلکہ جاذبیّت دار تھا۔ اس سے ڈر نہیں آتا تھا، بلکہ اس کے لیے محبّت واحترام کے جذبات پیدا ہوگئے تھے! ان سارے تأثرات کے ساتھ مودودی کی ذات اور اس کی فکر سے ایک گہرا رابطہ استوار کیے ہوئے میں نے دارالاسلام کو الوداع کہا۔

یہی ہے وہ ایک "آدمی"، جس کی شخصیّت کا مطالعہ کرنا پیشِ نظر ہے۔ مطالعۂ شخصیّت کا اصل مقصود اس جوہرِ سیرت کا سُراغ لگانا ہے جس کا پَرتو آدمی کی زندگی کے بعید ترین گوشوں تک جا پڑتا ہے اور جس کے سرچشمے سے زندگی کی کیاری کا ایک ایک ذرّۂ خاک سیراب ہوتا ہے۔ کسی کے جوہرِ سیرت تک پہنچنے کے لیے جب ہم ذہنی سفر کرتے ہیں

توسب سے پہلے سابقہ "مظاہر شخصیّت" سے پیش آتا ہے، اور آگے بڑھیں، تو اخلاقی اطوار سے دوچار ہوتے ہیں اور سب سے آخر میں جاکر نظریات وافکار اور اصول ومقاصد دیکھے جاتے ہیں۔ مولانا مودودی کی شخصیّت کے فکری پہلو کو تو میں نے ایک الگ مضمون میں پیش کردیا ہے۔ اخلاق واطوار پر یہاں براہِ راست بحث کرنے کا ارادہ نہیں۔ یہاں صرف مظاہر شخصیّت کو پیش کرنا مطلوب ہے۔ "مظاہر شخصیّت" سے میری مراد آدمی کے وہ مخصوص اسالیب واطوار ہیں جو بول چال، تحریر وتقریر، کھان پان، نشست وبرخاست اور "ذوقیات" کے اندر پائے جاتے ہیں اور جن کے ذریعے اس کے ذہن اور اس کی سیرت کی کتاب کو پڑھا جا سکتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آدمی لکھ کے جس ماحول میں رہتا ہے، جس بیٹھک میں بیٹھتا اور جس دفتر میں قلم چلاتا ہے، جس لباس کو پہنتا اور جن اشیاء کو اپنے استعمال میں رکھتا ہے، ان سب پر اس کی شخصیّت کی چھاپ پڑی ہوتی ہے۔ کوئی شخص فرنیچر اور دوسرے سامان کو جو ترتیب دیتا ہے، جس ڈھنگ سے وہ خطوط لکھتا ہے، جس طرز پر وہ دستخط ثبت کرتا ہے، اس کے اندر اس کی شخصیّت کی روح شامل ہوتی ہے۔ یہ سب مظاہر شخصیّت[۱] ہیں اور ان کا مطالعہ کر کے کسی شخص کے اصل جوہرِ سیرت کی قدر وقیمت مشخّص کی جا سکتی ہے اور اس کا اخلاقی مقام متعین کیا جا سکتا ہے، چاہے اس سے ملاقات کا موقع نہ ملا ہو۔ آدمی کی داستان عمر بھر اس کے ماحول اور اس کے املاک اور اس کے مستعملات پر کسی پُراسرار قلم سے مرقوم ہوتی رہتی ہے۔ مظاہر شخصیّت کے مطالعہ کے معنیٰ خفیہ رسم الخط میں لکھی ہوئی اسی داستان کو پڑھنے کے ہیں۔ ورنہ بجائے خود معلومات کہ فلاں کیا پہنتا اور کیا کھاتا ہے اور کیسے بیٹھتا ہے اور کیوں کر بولتا اور لکھتا ہے کوئی قدر وقیمت نہیں رکھتیں، اور ان کے

---

[۱] ملاحظہ ہو "مولانا مودودی۔ اپنی اور دوسروں کی نظر میں": "کچھ لوگ ہمیشہ ایسے پائے گئے ہیں جو بڑے آدمیوں کے مظاہر شخصیت کا چربہ اتارتے ہیں حالانکہ اصل نتیجہ خیز چیز اپنے اندر کسی اچھے جوہر سیرت کا پیدا کرنا ہے۔ اور اس کے نتیجے میں ہر آدمی کے اپنے مظاہر شخصیّت ایک امتیازی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ کسی کی شخصیّت کا لباس پہن کر ہم اپنا قدوقامت اس کے مطابق نہیں بنا سکتے، بلکہ ہمیں اپنے ہی قدوقامت کے مطابق لباس سج سکتا ہے۔" (اقتباس)

حاصل کرنے اور قلم بند کرنے اور دوسروں تک منتقل کرنے میں وقت اور قوت صرف کرنا کسی معقول آدمی کا مشغلہ نہیں ہو سکتا۔

آدمی کا سراپا اس کی شخصیّت کا نشیمن ہوتا ہے اور سراپا کو ایک نظر دیکھتے ہی انسانی کرداروں کا ایک رازداں اس کے اندر رہنے بسنے والی شخصیّت کا حدودِ اربعہ پا لیتا ہے۔ مولانا مودودی کا سراپا، بلکہ وجاہت دار چہرہ کسی بھی ماحول میں ہو ــــ گھر میں، دفتر میں ریلوے اسٹیشن پر، گاڑی کے کسی ڈبّے میں، جلسۂ عام میں ــــ بالکل ممتاز اور نمایاں رہتا ہے اور بتاتا ہے کہ وہ جس شخصیّت کا آئینہ دار ہے اس کے نمونے تقدیر نے بہت زیادہ تعداد میں نہیں بنائے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے اس مضمون کے آغاز میں مولانا مودودی کی ایک قلمی تصویر پیش کر دی جائے۔ یہ تصویر میں اپنے قلم سے کھینچنا چاہتا تھا مگر اس میں وقت زیادہ درکار ہے۔ وقت بچانے کے لیے میں اپنے صحافی دوست علی سفیان آفاقی کی مرتّبہ تصویر مستعار لے لیتا ہوں۔

> "چھوٹے بالوں کے پٹے جن میں درمیان سے مانگ نکلی ہوئی، کھلتا ہوا گندمی رنگ، چوڑا ماتھا، آنکھوں پر ہلکے سے نیلے رنگ کے شیشوں کی عینک (نہیں مولانا سفید شیشے استعمال کرتے ہیں۔ ن ۔ ص) دوہرا جسم اور مسکراتی ہوئی آنکھیں، چہرہ ہنس مُکھ، اور سفید سی ڈاڑھی پر لے جہاں تہاں سیاہی مترشح!"[1]
>
> (ماخوذ از "ابوالاعلیٰ مودودیؒ")

مولانا مودودی ان "بہ قیمت بہتر" لوگوں میں سے ہیں جن کی قامت پر توجہ نہیں دی جاتی۔ یوں قد بہت چھوٹا نہیں ہے، دوہرے بدن کی وجہ سے نظر کو مغالطہ ہوتا ہی

---

[1] یہ آفاقی صاحب نے دورِ اوّل نہیں دیکھا جب ڈاڑھی بالکل سیاہ تھی اور ذرا چھوٹی تھی اس کے حلقے میں کشادہ پیشانی والا روشن چہرہ عجیب منظر سامنے لاتا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ مولانا مودودی کی ڈاڑھی کے بال غیر معمولی تیز رفتاری سے سفید ہوئے ہیں اور بعد میں تو کوئی اِکّا دُکّا بال ہی سیاہ رہ گیا ہو گا۔

لیکن موزونیت اس درجہ کی ہے کہ مودودی صاحب کے سراپا میں کوئی بات کھٹکتی نہیں دوہرے بدن کے باوجود مولانا کی چال ڈھیلی ڈھالی اور مریل قسم کی نہیں ہوتی، بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص کسی خاص مشن پر جا رہا ہے۔ "چال"، کے بارے میں انہی دنوں تفہیم القرآن کے حاشیے میں خود مودودی صاحب نے بڑے کام کی باتیں لکھی ہیں۔ ملاحظہ ہو:

"مگر غور طلب پہلو یہ ہے کہ آدمی کی چال میں آخر وہ کیا اہمیت ہے جس کی وجہ سے اللہ کے نیک بندوں کی خصوصیات گناتے ہوئے سب سے پہلے اس کا ذکر کیا گیا؟ اس سوال کو ذرا تامّل کی نگاہ سے دیکھا جائے، تو معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کی چال محض اس کے اندازِ رفتار ہی کا نام نہیں ہے، بلکہ وہ درحقیقت اس کے ذہن اور اس کی سیرت وکردار کی اولین ترجمان بھی ہوتی ہے۔ ایک عیّار کی چال، ایک غنڈے بدمعاش کی چال، ایک ظالم وجابر کی چال، ایک خود پسند ومتکبّر کی چال، ایک باوقار مہذّب کی چال، ایک غریب مسکین کی چال اور اسی طرح مختلف اقسام کے دوسرے آدمیوں کی چالیں ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہوتی ہیں کہ ہر ایک کو دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کس چال کے پیچھے کس طرح کی شخصیّت جلوہ گر ہے پس آیت کا مدّعا یہ ہے کہ رحمان کے بندوں کو تو تم عام آدمیوں کے درمیان چلتے پھرتے دیکھ کر ہی بغیر کسی سابقہ تعارف کے الگ پہچان لو گے کہ یہ کس طرز کے لوگ ہیں۔ اس بندگی نے ان کی ذہنیّت اور ان کی سیرت کو جیسا کچھ بنا دیا ہے اس کا اثر ان کی چال میں نمایاں ہے۔ ایک آدمی انھیں دیکھ کر پہلی نظر میں جان سکتا ہے کہ یہ شریف اور حلیم اور ہمدرد لوگ ہیں، ان سے کسی شر کی توقع نہیں کی جا سکتی۔"

(ترجمان القرآن، ج ۴۶، عدد ۵)

میرا ذاتی تأثر یہ ہے کہ مولانا مودودی کی چال یہ ظاہر کرتی ہے کہ یہ شخص احساسِ ذمّہ داری کے عالم میں کوئی فرض ادا کرنے جا رہا ہے، مگر گھبراہٹ کے انداز سے نہیں،

پروقار طریق سے! ممکن ہے دوسروں کا تاثر کچھ اور ہو، لیکن اتنا بہر حال ہر کوئی محسوس کرلے گا یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ ھَوْنًا کے معیار پر یہ چال پوری اُترتی ہے۔

مودودی صاحب کے سراپا کا ایک جزو لباس بھی ہے اور میں پہلے ذکر کرچکا ہوں کہ وہ گھر اور دفتر میں رہتے ہوئے کیسا لباس پہنتے تھے۔ سردیوں میں کھلے پاجامے کے ساتھ دھاری دار قمیص اور اونی سوئٹر استعمال کرتے تھے، سر پر گرم اونی ٹوپی پہن لیتے تھے، پاؤں میں جرابوں کے علاوہ چمڑے کے موزے بھی ہوتے تھے اور باٹا کا کینوس کا بینوکٹ جوتا، گاہے گاہے سخت سردی ہوجانے پر سفید رنگ کی اونی قبا بھی اوڑھ لیتے تھے جسے "زیارت" سے آتے ہوئے ساتھ لائے تھے باہر جانا ہو تو تنگ موری کا چوڑی دار پاجامہ، موسم کے مطابق گرم یا سرد شیروانی اور قراقلی کی بنی ہوئی اونچی باڑھ کی سیاہ رنگ ٹوپی استعمال کرتے تھے۔ گرمیوں میں باہر جانے کا لباس کبھی کبھی شیروانی سمیت بالکل سفید ہوتا اور غالباً اس لباس میں مولانا مودودی صاحب کی شخصیّت پوری طرح نمایاں ہوجاتی تھی۔ وضو کے لیے لکڑی کی کھڑاویں موجود رہتی تھیں۔ لباس کے تنوّع کا دائرہ وسیع، لیکن شخصیّت کی ترجمانی اور زیبائش کے لحاظ سے ہمیشہ موزوں رہتا تھا۔ مودودی کے لباس کے اصل اجزاء تھے صفائی، سادگی اور حسنِ ذوق!!

آدمی حیوانِ ناطق ٹھہرا۔ نطق سے بڑھ کر اس کا کوئی ترجمان اور غمّاز نہیں ہوسکتا۔ نطق شخصیّت کے بہاؤ کی رودگاہ ہے۔ آدمی نے بات کہی اور اس کی حقیقت کھلی۔ ناطقہ کی تانت باجی تو زمانے بھر نے راگ پالیا۔ "تا مرد سخن نگفتہ" والی بات پرانی نہیں ہوئی۔ موضوعات کی پسندیدگی، زبان کا معیار الفاظ کا انتخاب، لہجہ کا اتار چڑھاؤ، بولنے کی رفتار، آواز کی پستی و بلندی بات چیت میں جذبات کی آمیزش اور اس کا تناسب وہ چیزیں ہیں جو پانچ منٹ میں ایک آدمی کی ساری مخفی حقیقتوں کا خود اسی کی زبان کی لاؤڈ سپیکر سے اعلانِ عام کردیتی ہیں۔ کسی کا ذہنی و علمی معیار کیا ہے، کسی کا ظرف کتنا ہے، کسی کا ذوق کس نوعیّت کا ہے، کسی میں سنجیدگی کس درجہ پائی جاتی ہے، کوئی کہاں تک بااصول ہے، یہ اور

اسی طرح کے دوسرے بہت سے سوالات ہیں جن کا جواب ایک شخص دو چار فقرے بول کر دے چکتا ہے، مگر بسا اوقات خود نہیں جانتا کہ اس نے اپنی کن کن حقیقتوں کو دوسروں کے سامنے رکھ دیا ہے۔

مولانا مودودی کی گفتگوؤں سے میں گزشتہ چودہ پندرہ برس کے زمانے سے بہرہ اندوز ہوتا رہا ہوں۔ مولانا کے اندازِ گفتگو پر چند باتیں جو مستقل تاثرات کی حیثیت میں میرے ذہن میں موجود ہیں، اس موقع پر بیان کرتا ہوں۔

عام طور پر دیکھنے میں آتا ہے کہ تحریر یا تقریر کے آدمی کو ہم جتنا بلند پاتے ہیں وہی آدمی مجلسی زندگی میں گفتگو کرتے ہوئے انتہائی پست ہو جاتا ہے۔ مثلاً اس کی تحریر یا تقریر میں اصول پسندی اور مقصدیّت ہوتی ہے، لیکن اپنی گفتگو میں ــــــ اس کا بے اصولا پن اور اس کی لامقصدیّت ــــــ صاف صاف نمایاں ہوتی ہے اسی طرح تحریر و تقریر میں جو سنجیدگی اور معقولیت کسی کی شخصیّت میں محسوس ہو رہی تھی، بے تکلّفانہ گفتگو کے ماحول میں ملمّع کی وہ ساری چمک دمک غائب ہو کر رہ گئی۔ تحریر و تقریر میں علمیّت و تفکّر کے کچھ آثار جھلملا رہے تھے، لیکن گفتگو کے دائرے میں سامنا ہوتے ہی یہ راز کھل جاتا ہے کہ وہ سب کچھ تصنّع کی کرشمہ سازیاں تھیں۔ اسی طرح تحریر و تقریر میں زبان کے ٹھاٹھ موجود تھے، لیکن بات چیت میں سب غائب۔

الغرض تحریر و تقریر کا آدمی ہمارے ہاں بالعموم اس آدمی سے بالکل الگ ہوتا ہے جس سے ہم مصافحہ کرتے ہیں، جس کے ساتھ بیٹھتے اور جس سے بات چیت کرتے ہیں، لیکن مولانا مودودی اس معاملے میں اپنی مثال آپ تھے کہ وہ نہ صرف تحریر و تقریر کے دو گونہ میدانوں میں ایک ہی سی حالت پر رہتے تھے، بلکہ اظہار کے ان وسیع میدانوں سے لوٹ کر جب کبھی عام بات چیت کے نسبتاً محدود دائروں کی طرف پلٹتے تھے تو بھی اپنی یکسانی کو برقرار رکھتے تھے۔ وہی بلندئ فکر، وہی سنجیدگی و وقار، وہی حسنِ گفتار، وہی غیر جذباتی لب و لہجہ، الفاظ کا وہی حسنِ انتخاب، ظرف کی وہی وسعت معلومات کی وہی بے کرانی، مقصدیّت و اصولیّت کا وہی زور، اور کلام کا وہی مزاج آپ کو عصری نشست کی ہلکی پھلکی بات چیت میں بھی ملے گا جو موصوف کی تحریر و تقریر

میں پایا جاتا تھا۔

برڑے لوگوں کی ایک خصوصیّت یہ ہوتی ہے کہ ان کے اندر دوسروں کے لیے بڑی زوردار جاذبیت پائی جاتی ہے اور جاذبیت کا یہ اثر ان کی گفتار میں پوری طرح نمایاں ہوتا ہے۔ جاذبیّت کے لیے بہت ساری چیزیں تباہ کن ثابت ہوسکتی ہیں، مگر ان میں سب سے ایک سب سے زیادہ خطرناک ہے۔ وہ ہے آدمی کی خودی کا متورّم ہوجانا! خودی جب متورّم ہوجاتی ہے، تو اس کی زندگی کے تمام پہلوؤں کے ساتھ ساتھ اس کی زبان اور اس کی گفت گو اس کے زہر سے متأثر ہوتی ہے۔ اس عالم میں آدمی کی "میں" کا بوجھ بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے اور وہ ہر موقع پر اپنے کو نمایاں کرتا ہے، اپنے آپ کو پیش کرتا ہے۔ اپنے آپ کو دوسروں پر ٹھونستا ہے۔ اپنے آپ کو اہمیّت دیتا ہے اپنے آپ کو کچھ تسلیم کرانا چاہتا ہے۔ متورّم خودی کے بوجھ کو اٹھانے پر کوئی دوسرا تیار نہیں ہوتا۔ لوگوں کو ایسے شخص کی گفتگو سے انقباض ہوتا ہے اور اس کے اردگرد سے چھٹ چھٹا جاتے ہیں۔ مولانا مودودی کو اللہ نے صحت مند خودی دی ہے۔ اس شخص نے اپنے آپ کو دوسروں پر ٹھونسنے اور اپنے آپ کو کچھ منوانے کی کوشش کبھی نہیں کی۔ میں نے بارہ پندرہ برس میں سینکڑوں مجالس میں مولانا مودودی کی گفت گوؤں کو سُنا ہے، مگر کبھی کسی گفتگو کے دوران میں ایسا نہیں ہوا کہ میرے یا دوسرے ساتھیوں کے ذہن نے مولانا کی اَنا کا بارِ گراں اپنے اوپر پڑتا محسوس کیا ہو۔ ایک رُخ یہ، اور دوسرا رُخ یہ کہ مولٰینا مودودی کی زبان پر کبھی کوئی فریب کارانہ کلمۂ انکسار بھی نہیں آیا۔ یہ بھی انسانی خودی کا ایک دوسرا رنگ ہے اور شاید پہلے سے کچھ زیادہ ہی خطرناک! مودودی صاحب سے ملنے والوں کو کبھی یہ ابتلا پیش نہیں آتی کہ انھیں ایک شخص کی مسلسل سُننی پڑے اور خود ان کو ما فی الضمیر کے کہنے کا موقع نہ ملے۔ یہاں ہر شخص کو بات کرنے کا کھُلا موقع ملتا ہے۔ جس میں نہ مودودی صاحب کی شخصیّت رکاوٹ بنتی ہے نہ جدید یا قدیم قسم کے مراسم و آداب!

ہمارے معاشرے کی ایک عام روایت بن چکی ہے کہ لوگ اختلافی گفتگوؤں میں ضرور ہی لڑنے جھگڑنے پر اُتر آتے ہیں۔ ہماری یہ قومی صفت صرف معمولی درجے

کے لوگوں میں نہیں، او نچے درجے کے مصنّفین، لیڈروں، وزیروں، حکّام، اخبار نویسوں اور مذہبی رہنماؤں سبھی میں پائی جاتی ہے۔ ہماری گفتگو کا بنیادی فارمولا یہ ہے کہ اپنی بات دوسرے سے منوا کے چھوڑنا ہے۔ اس کے لیے دو بڑے میتھڈ اختیار کیے جاتے ہیں۔ ایک وہ جو ذرا کم کم استعمال میں آتا ہے وہ لجاجت کا میتھڈ ہے۔ یعنی ہونٹ لٹکا لٹکا کے، خوشامد کرکرکے اور اپنے جذبات کے حق میں رحم کی اپیلیں کرکرکے مخاطب سے کوئی بات منوانا! دوسرا میتھڈ جو بھٹیار خانوں اور قہوہ خانوں سے لے کر پارلیمانی ایوانوں تک کثیرالاستعمال ہے، قوّتِ غضبیہ کو کام میں لانے کا میتھڈ ہے۔ یعنی آپ نے بات کہی، نہیں مانی گئی تو پھر ذرا زور دے کر اسے دہرایا، پھر نہیں مانی گئی، تو آواز اونچی ہوگئی، پھر نتھنے پھولنے لگے، ہونٹوں پر جھاگ آنا شروع ہوا، گردن کی رگوں کا ابھار بڑھ گیا۔ آخری حد نہ جانے کیا ہو!

مولانا مودودی اختلافی امور پر گفتگو کرتے ہوئے ان دونوں طریقوں سے دور ہٹ کر ایک تیسرا راستہ اختیار کرتے ہیں، ان کا میتھڈ افہام و تفہیم کا میتھڈ ہے یعنی مقصدِ کلام دوسرے کی بات کو سمجھ لینا اور اپنی بات سمجھا دینا ہوتا ہے! بارہا ایسا ہوا کہ مخاطب مولانا کا سارا استدلال سن کر اپنے موقف سے نہیں ٹلا۔ اسی پر قائم رہا، یا مولانا کے مقابلے میں کسی دوسرے عالم یا لیڈر کی رائے کو ترجیح دیتا رہا تو ایسے موقعوں پر مودودی صاحب ہمیشہ ٹھنڈے انداز سے یہ کہا کرتے ہیں کہ "آپ چاہیں تو وہ رائے رکھ سکتے ہیں!" اس فقرے نے بارہا مناظرہ پسند لوگوں کی اسکیموں کو درہم برہم کر دیا ہے۔ مولانا مودودی کو مناظرانہ انداز کی گفتگو سے شدید درجے کی نفرت ہے۔ وہ ایسی گفتگو کو اوّل تو اپنے خاص حکیمانہ اسلوب سے افہام و تفہیم کے میتھڈ پر لانے کی کوشش کرتے ہیں اور اکثر کامیاب رہتے ہیں، لیکن اگر کسی طرح سے کامیابی نہ ہو تو پھر "قَالُوْا سَلٰمًا"، قرآنی ہدایت کے مطابق بڑے حُسنِ فرار کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

معقول استدلال کو جب کوئی شخص محض حمق اور نامعقولیّت یا ضدّم ضدّا کی وجہ سے رَد کر رہا ہو، اور اندازہ ہو جائے کہ بار بار ایک ہی دلیل دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوسکتا، تو ایسی صورت میں مودودی صاحب بالعموم صاف صاف

اعترافِ شکست کرتے ہوئے کہا کرتے ہیں کہ میرے پاس جو دلائل تھے وہ میں نے بیان کر دیے۔ اگر آپ ان سے مطمئن نہ ہوں تو اپنی رائے پر قائم رہیے، اور کوئی دلیل میرے پاس نہیں ہے۔ کم لوگ اس طرح اعترافِ شکست کر سکتے ہیں۔

ہر لیڈر اور ہر عالم اور بڑے آدمی کو خبطیوں سے سابقہ پیش آتا ہے۔ خبطیوں سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے خیالات اور جذبات میں توازن نہیں ہوتا اور جن کو اپنے ذہن سے خود آگاہی نہیں ہوتی۔ نہ ان کو اپنے عالمِ افکار پر کوئی قابو حاصل ہوتا ہے۔ اس طرح کے غیر منظّم ذہن کے لوگ طرح طرح کے مسائل، قسم قسم کی کہانیاں رنگ رنگ کی بجھارتیں[1] لے کر مولانا مودودی کو بھی شرف ملاقات سے سرفراز فرماتے رہتے ہیں۔ نوعِ انسانی کی اس صنف سے اگر آپ بحث کرنے لگیں یا ان کے خیالات کو منظّم کرنے کی کوشش کے درپے ہو جائیں یا ان کو آپ ان کے عدمِ توازن سے آگاہ کرنے کی کاوش میں لگ جائیں تو پھر ان کی طبع اور زیادہ رواں ہوتی ہے۔ پھر ان سے گھنٹوں اور ہفتوں گفتگو کرتے رہیے، بلکہ برسوں دماغ لڑاتے رہیے، یہ اسی حالت پر رہیں گے جس پر تھے۔ مودودی صاحب ایسے آدمی کو دو چار باتوں سے جب پہچان جاتے ہیں تو بڑے بھاری ایثار سے کام لیتے ہیں، یعنی اُسے کھُلا موقع دیتے ہیں کہ بولتا چلا جائے اور خود چُپ چاپ بیٹھے سُنتے رہتے ہیں، کوئی اختلاف نہیں کرتے، کسی چیز کی تردید نہیں کرتے کسی بات پر لقمہ نہیں دیتے، بلکہ سراسر "تختۂ مشق" بنکر رہ جاتے ہیں۔ بچارہ خبطی کتنا ہی بڑا خبطی کیوں نہ ہو، مقابل سے کسی ردِّ سخن کے بغیر گھنٹہ دو گھنٹہ مسلسل بولنے کے بعد آخر ہمّت ہار دیتا ہے، چنانچہ ان تجربات سے مولینا مودودی کو ہم نے خود گزرتے دیکھا ہے اور جبھی یہ اندازہ کر لیا تھا کہ جو شخص اس شہادتگاہِ نفس سے یوں گزر سکتا ہے اسے جیل اور پھانسی لغزش نہیں دلا سکتے۔

ہم جو اتنی مدّت سے مولانا مودودی کے ساتھ رہے دو باتوں کی شہادت ہم بڑے وثوق سے دے سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ مودودی صاحب کو ہم نے ایک لمحے کے لیے بھی مغلوبُ الغضب نہیں دیکھا اور نہ آپ کو کبھی غضب آلود الفاظ میں بات کرتے سنا ہے۔ حد یہ کہ جن گوناگوں مخالفتوں اور الزامات اور گالیوں اور دوسری زیادتیوں

---

[1] پہیلیاں (ت۔م)

کا مولانا کو لمحہ لمحہ سامنا کرنا پڑتا تھا، ان کے ردِّ عمل کے طور پر بھی کبھی ایسا نہیں ہوا کہ مولانا کی زبان کا معیارِ پاکیزگی و سنجیدگی اپنی مقررہ حد سے نیچے گرا ہو۔ بے شمار گھٹیا الفاظ ہیں جن کو ادیب اور صحافی گفت گوؤں ہی میں نہیں، اخباری کالموں میں ہر روز استعمال کرتے ہیں، لیکن مولانا مودودی کے چمنستانِ تکلّم میں ان کانٹوں کی کوئی جگہ نہ ہوئی ان گنت اسالیب ہیں جو ادنیٰ قسم کی جذباتیت نے اپنے اظہار کے لیے وضع کر لیے ہیں اور ہمارے معزّزین اور شرفا دن رات ان کو استعمال میں لاتے ہیں، لیکن مولانا مودودی کے جہانِ ذوق میں ان کی سمائی قطعاً نہیں! مولانا کے حسنِ ذوق کا شعور رکھنے والے کسی آدمی کے سامنے آپ کوئی لفظ بول کے دریافت کریں تو وہ آپ کو بتا سکے گا کہ مولانا یہ لفظ بول سکتے ہیں یا نہیں ؟

ایک شخص جس کی مادری زبان دلّی کے شریف گھرانوں کی خاص بولی ہو، پھر اس بولی کو حیدر آباد کی علمی فضا نے سیراب کیا ہو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسے اسلام کے آداب و اخلاق نے ایک خاص مزاج دیا ہو، اس سے آپ کو کس اندازِ گفتگو کی توقع کرنی چاہیے حلقۂ یاراں ہو یا مجلسِ بیگانگاں، سوشل زندگی کے وسیع تردوائر ہوں یا گھر کی چار دیواری کے اندر کا حلقہ، بیوی بچّوں سے ربط ہو یا نوکروں اور ملازموں سے، مولینا مودودی کی گفتگو نفاست، سنجیدگی اور پاکیزگی کے معیّن معیار سے کبھی بھولے سے بھی نیچے نہیں گرتی!

مولانا کے اندازِ گفتگو کے بارے میں ایک خاص بات یہ ہے کہ بڑے جماؤ کے ساتھ ایک ایک لفظ ٹھہر ٹھہر کر بولتے ہیں۔ بقول ملک غلام علی صاحب (مولانا کے خاص معاونِ کار) اگر کوئی شخص چاہے تو پوری گفتگو معمولی رسم الخط میں قلم بند کر سکتا ہے۔ یہ اندازِ گفتگو وہی شخص لے کر چل سکتا ہے جو غصّے، تندی جلد بازی اور ذہنی اضطراب سے مغلوب نہ ہو۔ مولانا مودودی جیسی شخصیّت کا ایک مستقل ابتلا یہ ہوتا ہے کہ طرح طرح کے لوگ آ آ کر ذریعۂ امتحان بنتے ہیں۔ خبطی، ذہنی الجھنوں کے مریض، خود پسند، تیز زبان، مناظرہ باز، ہٹیلے، حمقا، غرضیکہ قسم قسم کی مخلوق مولانا کو تختۂ مشق بناتی ہے۔ ایسے لوگ بات کر کے مخاطب کا ذہنی سکون درہم برہم

کر دیے ہیں اور ان کے مقابلہ میں انضباط کو قائم رکھنا معمولی آدمیوں کے بس میں نہیں ہوتا لیکن مولانا مودودی، ایسے لوگوں کی گفتگوؤں کے ریلوں کے درمیان سنجیدگی و وقار کی چٹان بنے اپنے مزاج کو قائم رکھتے ہیں۔ غالباً اس سلسلے کے چند خاص کڑے "امتحانات" میں سے ایک وہ تھا جب ایک قادیانی پارٹی مولانا پر تبلیغ کرنے "دارالاسلام" پہنچی تھی۔ اس "امتحانِ صبر و وقار" کے موقع پر میں بھی شریکِ مجلس تھا، مگر چوں کہ یہ روداد پہلے سے ملک غلام علی صاحب بیان کر چکے ہیں اس لیے انہی سے الفاظ مستعار لیتا ہوں۔ وہ لکھتے ہیں:

"ایک مجلس میں مولانا اور ہمارے سامنے ان لوگوں نے اپنے فنِ مناظرہ اور علمِ کلام کے خوب خوب کرتب دکھائے۔ کئی گھنٹے تک الٹے سیدھے سوالات و جوابات کا سلسلہ جاری رکھا۔ ہمیں کوفت بھی ہوتی تھی اور غصّہ بھی آتا تھا۔ کبھی ہمارا جی یہ چاہتا تھا کہ ان سے رخصت اور معافی طلب کی جائے اور کبھی ہم اس پر آمادہ ہوتے تھے کہ انھیں ترکی بہ ترکی جواب دیے جائیں، مگر مولانا تحمل سے ان کی باتیں سنتے رہے، نرمی سے جواب بھی دیتے رہے اور حق کو ان پر واضح کرنے کی کوشش بھی کرتے رہے۔ آخر جب مولانا نے دیکھا کہ ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے، تو قادیانی حضرات سے دھیمے لہجے میں کہنے لگے کہ "میں نے اپنے ساتھیوں کو بڑی محنت سے کافی مدّت تک ضبط اور برداشت کی مشق کرائی ہے، خطرہ ہے کہ آپ لوگ میرے سارے کیے کرائے پر پانی پھیر کر نہ جائیں۔" اللہ بہتر جانتا ہے کہ یہ بات کام کر گئی یا "مبلغین" اتمامِ حجّت کرتے کرتے تھک گئے بہرحال اس کے بعد وہ تشریف لے گئے۔"

(مودودی۔ اپنی اور دوسروں کی نظر میں)

جو لوگ مولانا مودودی کو دور ہی سے دیکھتے ہیں اور بے تکلفی کے دروازے کے باہر ہی باہر جھانکتے ہیں، ان کو ایک کمی محسوس ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ مولانا گفتگو اور ملاقات

یں "بے پناہ"، قسم کی گرم جوشی نہیں دکھاتے۔ کوئی نیا آدمی ملنے آئے گا تو خوبصورتی سے
سلام کا جواب دیں گے۔ ہاتھ کی تھوڑی سی مہذبانہ جنبش اور بالائی حصّہ جسم کے بالکل خفیف
سے جھکاؤ کے ساتھ ہلکا سا مصافحہ کریں گے، نو وارد عام مجلس میں آکر بیٹھے تو تھوڑی دیر
کے لیے سکوت اختیار کرلیں گے تاکہ اگر وہ کوئی بات کرنا چاہتا ہو تو اسے موقع ملے۔ ورنہ
جو سلسلہ چل رہا تھا، وہی ازسرِ نو شروع ہو جائے گا۔ ملاقاتی خاص طور سے علیٰحدگی
میں خاص طور سے ملے تو دریافت مدّعا کے لیے سادہ انداز میں کہیں گے، فرمائیے! یا
پھر یہ سوال کریں گے کہ "آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں"؟ مولانا نے بطورِ خود کبھی معانقہ
نہیں کیا، البتّہ ہمارے پٹھان رفقاء اس معاملہ میں کبھی کبھی پیش دستی کر لیتے ہیں۔ ہاں
یاد آیا ــــــ جیل کے زمانے میں تنہائی اور رفقاء سے علیٰحدگی کے ردِّ عمل کی وجہ سے
مولانا معانقے کرنے لگے تھے۔ بعض لوگ مولانا کے طرزِ عمل کے اس ظاہری پہلو کو سرد
مہری سمجھتے ہیں اور مایوس ہوتے ہیں۔ خصوصیت سے پاکستان کے اندر پٹھان اور
پاکستان کے باہر اہلِ عرب اس کو شدّت سے محسوس کرتے ہیں، لیکن درحقیقت یہ مولانا
کے مزاج کا ایک مجبورانہ جماؤ تھا جو علمی کاموں میں انہماک کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ اس
مزاج کی سطح کے نیچے ایک حد درجہ ملنسار آدمی پایا جاتا ہے، چنانچہ دارالاسلام سے
لے کر اب تک مولانا کا حال یہ ہے کہ وہ رفقاء اور ملاقاتیوں سے ملے بغیر اور عصری مجلس
میں کچھ وقت بیٹھے بغیر رہ ہی نہیں سکتے۔ چاہے کیسے ہی ضروری کام اور اہم معاملات
درپیش ہوں۔ وہ "آدم گریز اور خانہ نشین اور اپنے کام سے کام رکھنے والے" آدمی
ہرگز نہیں ہیں۔ ملنے والوں سے وہ ملتے ہیں اور بات کرنے والوں سے وہ خوب باتیں
کرتے ہیں، مگر خواہ مخواہ کی زبان چلانے اور گپ لگانے کی صلاحیت ان میں نہیں ہے
پروفیسر سرور آفاقی کے فلسفے کی رو سے ایسا آدمی "عوامی" نہیں ہو سکتا۔

طبائع اپنے جوہرِ ستیر کے لحاظ سے اپنا ایک مستقل رنگ رکھتی ہیں۔ کسی میں حزن و
یاس، کسی میں اضطراب، کسی میں غضب و تنفّر، کسی میں شوخی و شرارت، اور کسی میں
مسخرہ پن کا بنیادی رنگ ہم نمایاں دیکھتے ہیں۔ مولانا مودودی کا رنگِ طبیعت وقار

کے ساتھ شگفتگی کے امتزاج سے بنتا ہے۔ سنجیدہ شخصیتیں جو علمی، تحقیقی اور فکری کاوشوں میں منہمک رہتی ہیں، بالعموم شگفتگی کا جوہر کھو بیٹھتی ہیں اور نری سنجیدگی آخر کار خشونت بن کر رہ جاتی ہے۔ دوسری طرف شگفتگی کا جوہر جن اشخاص میں اپنی حدود پھاندجاتا ہے وہ وقار کا رنگ کھو بیٹھتے ہیں۔ مودودی کی شخصیّت دونوں جوہر صحیح تناسب کے ساتھ اپنے اندر لیے ہوئے ہے، اس لیے حسنِ اعتدال ضائع نہیں ہوتا۔

مولانا مودودی پر مختلف ادوار گزرے اور گونا گوں احوال سے سابقہ پڑتا رہا لیکن تفریح اور بے تکلفی کے خاص الخاص لمحات میں بھی دامنِ وقار ہاتھ سے نہیں چھوٹا، اسی طرح جب میں پچھلی تاریخ کو دیکھتا ہوں تو بے شمار واقعات ایسے سامنے آتے ہیں جو ایک پیکرِ خاکی کے لیے پوری طرح غارت گرِ سکون ہونے چاہئیں تھے اور ان کا اثر لازماً مودودی کے دماغ پر رہا ہوگا، ـــــــ بلکہ کبھی کبھی تو ہم قریبی ساتھیوں کو ان پر رحم بھی آتا ــــــ لیکن نمازوں میں، دفتر میں، اجتماعی کھانوں میں، مجالسِ گفتگو میں اور سیر کے اوقات میں جب بھی سامنا ہوا تو ہمیشہ ایک ایسا چہرہ سامنے آیا جس پر گویا ایک غیر مرئی تبسّم کی افشاں چھڑکی ہو۔ مضمون نگارانہ اور مصنفانہ کاوش کے لمحات ہوں، جماعتی و تحریکی مسائل کی پیچیدگیوں کا دَور ہو، مخالفین کی شرارتوں اور اپنوں کی نادانیوں سے سابقہ ہو، کسی بھی حال میں اس چہرے کی شگفتگی کا رنگ نہیں مرجھایا۔ یہ شگفتگی گفتگو میں ہلکے ہلکے مزاح کا رنگ پیدا کر دیتی ہے۔ بے جا نہ ہوگا کہ اس موقع پر چند مثالیں بیان کروں جن سے مولانا کے مخصوص اسلوبِ مزاح کا اندازہ ہو سکے گا۔

ایک مذہبی طرز کے بزرگ اپنے اخبار میں کئی برس سے مولانا مودودی پر خدا واسطے کی عنایت فرماتے رہتے تھے۔ ایک صاحب نے کسی مجلس میں مودودی صاحب سے کہا کہ ایک مرتبہ آپ ان کے بارے میں بھی کچھ لکھتے تو مناسب ہوتا۔" "میں ان سے بالکل مایوس ہوں"، مودودی صاحب دھیمے انداز میں کہنے لگے۔ "میں نے ان کی شخصیّت کا خوب اچھّی طرح مطالعہ کیا ہے اس میں جزم کہیں نہیں ہے

بس زیر وزبر ہی زیر وزبر ہے۔"

مرکز کی گاڑی کی چھت پر سامان رکھنے کے لیے ایک مربع شکل کا جنگلہ لگوایا گیا تھا، یاد نہیں کب کی بات ہے، ہم مولانا کے ساتھ گاڑی کے انتظار میں لاہور کی کسی سڑک پر کھڑے تھے، دور سے اسی رنگ اور ماڈل کی کوئی گاڑی آتی دکھائی دی، کسی نے کہا کہ لیجیے گاڑی آ گئی۔ مولانا نے ایک نگاہ ڈالی اور کہا "نہیں ـــ اس کے سر پر وہ ملکۂ وکٹوریہ کا تاج نہیں ہے۔"

قیوم خانی دور میں پشاور جانے کے لیے مولانا مودودی گاڑی کے انتظار میں ہم کو ساتھ لیے پلیٹ فارم پر ٹہل رہے تھے اور جماعتی سیاسی امور پر بڑی اہم گفتگو ہو رہی تھی۔ ایک صاحب میری توجہ کی زد میں آ گئے جو ہمارے پیچھے پیچھے چلتے اور پھر جب ہم ایک سرے پر پہنچ کر مڑتے تو وہ پھر پیچھے ہو لیتے۔ گفتگو میں احتیاط کی ضرورت واضح تھی، مگر مولانا ساتھ لگے ہوتے "سائے" سے بے خبر تھے۔ میں نے توجہ دلانے کی مختلف تدبیریں سوچیں مگر بالآخر "ڈائرکٹ میتھڈ" ہی اختیار کرنا پڑا۔ انگریزی میں کہا (THERE IS A FIFTH PERSON BEHIND US) واضح رہے کہ ہمارا گروپ چار افراد پر مشتمل تھا، مولانا نے برجستہ کہا "نہیں۔ کہنا چاہیئے۔ A FIFTH COLUMNIST

ماہرالقادری صاحبؒ نے اپنے مضمون میں ایسا ہی ایک مزاح آمیز نکتۂ لطیف درج کیا ہے۔ جس زمانے میں علمائے کرام دستوری رپورٹ پر مشورت کر رہے تھے، ایک صاحب نے پوچھا: "علماء کی مجلسِ مشاورت کا کیا رنگ ہے؟" فرمایا "صبغۃ اللہ![1]"

۴۸ء میں پہلی گرفتاری سے کچھ ہی قبل مولانا نے فیصل آباد اور جھنگ کا سفر کیا تھا۔ بہت سے لوگ ساتھ تھے۔ میں بھی تھا۔ ایک مقام پر کار کسی ضرورت سے روکی گئی۔

---

[1] مسلم سوسائٹی کے مزاج کے بارے میں آیتِ قرآنی ہے: صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ترجمہ: "یہ اللہ کا رنگ ہے! اور اللہ کے رنگ سے اور کس کا رنگ بہتر ہو سکتا ہے؟"

چودھری محمد اکبر صاحب فطرت کے بلاوے پر لبّیک کہہ کر لوٹے تو مولانا نے پوچھا: کیا پانی کہیں سے مل گیا ہے؟" چودھری صاحب نے کہا: نہیں دوسری طرح کام چلانا پڑا۔" مولانا نے فوراً کہا: " اچھا تو یوں کہیے کہ ڈرائی کلیننگ کی ہے۔"

مرکز کی گلی فیروز پور روڈ سے جہاں ملتی ہے، پہلے وہاں نشیب تھا۔ بعد میں مٹی ڈلوا کر راستہ اونچا کیا گیا، جس کی چوڑائی بہت کم تھی۔ ایک دفعہ کہیں سے گاڑی پر آرہے تھے ڈرائیور نے جب گاڑی کو گھمایا مولانا نے کہا: " دیکھنا بھئی! احتیاط سے! کہیں فَاُمُّہٗ ھَاوِیَۃٌ ہی نہ ہوجائے۔[1]

(ماخوذ از " مودودی۔ اپنی اور دوسروں کی نظر میں")

ایک لطیفہ ــــــ جو ہے تو پرائیویٹ قسم کا، لیکن شاہکار درجے کا ہے، اسے راز نہیں رکھا جاسکتا۔ ایک موقع پر مولانا کی طرف سے چائے دی گئی۔ بسکٹ اور پیسٹری ساتھ تھی۔ مولانا نے باقر خاں کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا: افسوس ہے کہ ہم باقر خانی کا انتظام نہ کر سکے!" ــــــ خوب قہقہہ ہوا (حوالہ ایضاً) بعد میں معلوم ہوا کہ اس لطیفہ کی موجدِ اوّل بیگم ملک عزیز مرحومہ تھیں۔ ایک بار انھوں نے باقر خاں صاحب سے پوچھوایا تھا کہ آپ کی باقر خانی کا کیا حال ہے؟"

زمانۂ جیل کے لطائف میں سے ایک اور شاہکار عرض ہے جو حُسنِ تمثیل و تشبیہ کا بھی نادر نمونہ ہے۔ مولانا اختر علی خاں اپنی رہائی کے لیے ہر ہر لحہ بے چینی سے منتظر تھے اور کبھی کبھی مولانا سے ملتے تو اپنا دردِ دل بیان کرتے اور ان کی گفتگو سے کچھ سرمایۂ تسکین حاصل کرتے صورتِ واقعہ یہ تھی کہ اب مولانا مودودی کی اسارت کا تسلسل مولانا اختر علی خاں اور بعض دوسرے اصحاب کی رہائی میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ اسی حقیقت کو مودودی صاحب نے ایک لطیفہ میں سمو کر کہا: " بات یہ ہے کہ گلی میں ایک ٹرک پھنس گیا ہے اور اس کے پیچھے کاریں، بیل گاڑیاں، تانگے سبھی رکتے جارہے ہیں اور پورا ٹریفک جام ہوگیا ہے۔ ٹرک نکلے تو ٹریفک رواں ہو۔"

---

[1] وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِیْنُہٗ فَاُمُّہٗ ھَاوِیَۃٌ۔

لطائفِ تمثیل وتشبیہ کے سلسلے میں دو تین چیزیں قابلِ ذکر ہیں:

اضطراباتِ پنجاب ۵۳ء کی تحقیقاتی عدالت میں تحریری بیان میں مولانا نے اپنی پوزیشن کو حکومت کی زیادتی کے بالمقابل واضح کرنے کے لیے امرِ واقعہ کو یوں بیان کیا کہ "اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ جیسے ایک شخص سڑک سے ہٹ کر کھیتوں میں جاکر کھڑا ہو اور دوسرا شخص وہاں موٹر لے جاکر اس کو ٹکرا دے۔" ایک فقرے میں پوری تصویر آجاتی ہے۔

مولانا کو پتھری کی تکلیف ہے، کسی نے آپریشن کرانے کا مشورہ دیا تو کہنے لگے "ایک بار آپریشن کراچکا ہوں، مگر کیا کروں کہ میرے جسم میں پتھّر بنانے کی مستقل فیکٹری کام کررہی ہے"

اضطراباتِ پنجاب ہی کے سلسلے میں ۲۷ فروری ۵۳ء کو جو اخباری بیان دیا تھا اس میں ایک جملہ تھا کہ کیا اس حکومت میں اب ایک آدمی بھی ایسا نہیں رہا جو ایک تھانیدار کی سطح سے زیادہ بلند سطح پر سوچ سکے؟ ——— چار لفظوں میں شہری حقوق کی پامالی، جمہوری اصولوں سے بے نیازی، دھونس اور قوّت کے بے جا استعمال اور سیاسی سوجھ بوجھ اور حاکمانہ صبر وتحمّل سے بالاتر ہوکر اندھا دھند اقدامات کرتے چلے جانیکی پوری تاریخ بیان ہوگئی جو پاکستان بننے کے بعد سے نشو نما پا رہی تھی۔ ایک لفظ "تھانیدار" کے لطیف تمثیلی استعمال کو دیکھیے!

"جماعت کی پوری تاریخ اور لائحۂ عمل" میں ایک مقام پر واضح کرتے ہوئے کہ ہماری اصل کشمکش اشتراکیّت، مغربی الحاد اور فسق وا باحت کے خلاف ہے، جماعت کے خلاف مہم چلانے والے مولوی حضرات کے بارے میں لکھا ہے کہ "علمارِ کرام خواہ مخواہ بیچ میں آکر کھڑے ہوئے ہیں، یا کوریا[1] بنا کر لا کھڑے کیے گئے ہیں۔"

ایک خاص عنصر کے اندر مولانا مودودی دستوری مہم کے سلسلے میں کام کرنے کا نقشہ مجلسِ شوریٰ کے مشورے سے تیّار کررہے تھے۔ رفقار نے خطرناک پہلوؤں کی طرف

---

[1] اس زمانے میں کوریا امریکی ڈپلومیسی کے زیرِ اثر ایک تاریخی حوالہ بن گیا تھا۔ اس جملے میں جو تلمیح ہے وہ اس زمانے میں آسانی سے ذہن میں آتی تھی۔

اشارہ کیا۔ مسکرا کر فرمایا: "سانپوں سے کھیلنے جا رہا ہوں! ـــــ ہاتھ ٹھیک پڑ گیا تو کامیابی! نہ پڑا تو ڈسے جانے کا خطرہ واضح ہے۔"

ماہر القادری صاحب کا بیان کردہ ایک لطیفہ اور ہے، جی چاہتا ہے کہ اسے بھی لے لیا جائے۔ "مولانا نے اپنے صاحب زادے (غالباً فاروق نام ہے[1]) کو کراچی میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے چھوڑ دیا تھا، ایک دن ہم تینوں موٹر میں جا رہے تھے، مولانا کے صاحب زادے ان مشینوں اور کل پرزوں کا بار بار ذکر نکالتے تھے۔ میں نے کہا کہ ان کو اس فن سے بہت دلچسپی ہے۔ مسکرا کر بولے: باپ مولوی، بیٹا لوہار!"

("مودودی ـــــ اپنی اور دوسروں کی نظر میں")

سود حصہ دوم میں اشتراکیت پر ناقدانہ بحث کرتے ہوئے اس کی آہنی ڈکٹیٹرشپ کے بارے میں دو تین صفحے کا ایک نوٹ لکھا ہے۔ اس نوٹ میں مذکور ہے کہ جب کوئی کارکن اپنے گھر پر نہیں پہنچتا تو اس کی بیوی خود ہی سمجھ جاتی ہے کہ پکڑا گیا ـــــ ایک روز یکایک ایسا ہوتا ہے کہ اس کا بھیجا ہوا پارسل واپس آجاتا ہے۔ بس یہی اس امر کی اطلاع ہے۔ کہ اس کا خاوند لینن کو پیارا ہوا ـــــ اس کا فرض ہے کہ اچھی کامریڈنی کی طرح اس معاملہ کی بھاپ تک مُنہ سے نہ نکالے (ص۲۴۶[2]) ـــــ "لینن کو پیارا ہوا" اور "کامریڈنی" کی لطافت اس موقع پر ہر صاحبِ ذوق کو محسوس ہوگی۔

ہاں، وہ بھی تو ایک دلچسپ چیز تھی۔ "دارالاسلام" کے دور میں ایک مرتبہ ترجمان القرآن کا فرنیچر لاہور سے بذریعہ ریل گیا تھا۔ سرنا اسٹیشن سے اُسے دو فرلانگ دور لے جانا تھا۔ بالمعاوضہ حمّالی کا کوئی قابلِ حصول انتظام تھا نہیں، اس لیے ہم سب مدیر ترجمان القرآن سمیت اس مہم کو نکلے۔ کرسیاں، میزیں اور دوسری چھوٹی چیزیں تو ایک

---

[1] مولانا کے صاحبزادوں کے ناموں میں "فاروق تو بطورِ ردیف آتا ہے"، یعنی احمد فاروق، خالد فاروق، عمر فاروق دھلم جرّا۔

[2] پہلے یہ باتیں سرمایہ داروں کا مخالفانہ پروپیگنڈا قرار دے کر مسترد کر دی جاتی تھی، لیکن اب ـــــ خروشچیف اور بلگانن کے بیانات نے ان کی صداقت ثابت کر دی ہے۔ (آج تو روسی نظام کی تباہی نے خود ہی اپنی تردید کر دی ہے ۹۲ء)

ایک دو دو آدمیوں کے ذریعے جا سکتی تھیں، البتّہ ایک بڑی الماری کا بوجھ "اجتماعی مہم" چاہتا تھا۔ سو اسے کئی آدمی باری باری کندھا دیتے ہوئے لے چلے جن میں خود مولینا مودودی بھی شامل تھے۔ وہ کبھی ادھر سے سنبھالتے اور کبھی ادھر سے سہارا دیتے۔ اس موقع پر خوب کہا کہ "عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے۔"

بے شمار یاد رہ جانے والے اور بھول جانے والے لطائف و نکات میں سے یہ چند چیزیں ہی اس وقت عرض کی جا سکیں۔ ان سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مودودی کی شخصیّت کے عناصرِ ترکیبی میں شگفتگی کا کیا مقام ہے اور اس کی اصل تصویر ان ڈراونی تصویروں کے مقابلے میں کیسی ہے جن کو دور ہی دور بیٹھ کر بعض مصوّروں نے مرتّب کیا ہے۔ ان ڈراؤنی تصویروں کے ذریعے جن لوگوں نے مودودی کو دیکھا ہے ان کی نظر میں ایک ایسا کٹھ مُلّا اور مجسّمۂ خشونت بسا ہوا ہے کہ بسا اوقات وہ اس کی وجہ سے ڈرپوک بچّوں کی طرح راتوں کو چونک چونک اٹھتے ہیں۔

ایک صاحبِ دعوت کی، کم سے کم اس دَور میں یہ بہت بڑی کمزوری ہوگی کہ وہ قلم سے جہاد نہ کر سکتا ہو اور کاغذ کے میدان میں تگ و تاز نہ دکھا سکے۔ وہ لیڈری جو محض زبان کے چٹخارے پر چل جاتی تھی اس کا دور کبھی کا گزر چکا۔ ایسے بہت سے اہلِ زبان آج دانتوں میں زباں دابے دور دراز گوشوں میں پڑے ہیں۔ یہ لوگ کاغذ کے میدان میں ہر گئے۔ کیوں کہ رہوارِ قلم جس ٹھوس فکری غذا کے بل پر ترکتازیاں دکھا سکتا تھا وہ فراہم نہ تھی۔ تقریری لیڈری آسان ہے۔ تحریری لیڈری مشکل ہے۔ مودودی جس دعوت کو لے کر اٹھے ہیں وہ زبان و قلم دونوں کو استعمال کیے بغیر اپنا راستہ نہیں نکال سکتی۔ خدا کی عطا ہے کہ مودودی کو اس نے قلم کی طاقت سے بہرۂ وافر عنایت کیا ہے۔

قلم سے آدمی جو کچھ لکھتا ہے، اس کے معانی و مطالب سے قطع نظر، محض لکھنے کا ظاہری سٹائل اور اس کا رسم الخط بول کر کہہ دیتا ہے کہ لکھنے والا کیا ہے کیا نہیں ہے۔ آدمی کی ہر تحریر میں، خواہ وہ ایک سطر بھر کی کیوں نہ ہو اس کا اپنا ہاتھ اور اس کا اپنا قلم اس کی شخصیّت کے احوالِ پنہاں کاغذ پر نقش کرتا چلا جاتا ہے۔ ہماری تحریریں گویا ہماری خود نوشت سوانح عمریاں ہیں ـــــــ معنویّت کے اعتبار سے بھی اور ظاہری انداز کے اعتبار سے

بھی ۔ چنانچہ نفسیاتی مطالعہ و تجزیہ کا فن اب یہاں تک ترقی کر چکا ہے کہ ماہرین ایک آدمی کے لکھے ہوئے نام، پتے یا دو چار سطروں کے مشاہدہ سے اس کے احوال و اطوار کے تمام ضروری پہلو سامنے لا سکتے ہیں اور اچھے اندازے بالعموم اَسّی پچاسی فی صد صحیح نکلتے ہیں ۔

اسی نقطۂ نظر سے مولانا مودودی کی تحریر کا ایک ہلکا سا جائزہ لینا مدِّنظر ہے یعنی ہم انکی تحریر کی ادبیّت اور اس کی فصاحت و بلاغت پر نہیں، بلکہ اس کے ظواہر پر ایک نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔

مودودی صاحب کے لکھنے کا ہمیشہ ایک خاص ماحول ہوتا ہے ان کے لکھنے کا کمرہ ۔ جو دفتر بھی کہلاتا ہے ـــــ دوہری دیواروں پر مشتمل ہوتا ہے ۔ اینٹ گارے کی دیواروں کی اندرونی جانب ایک چاردیواری الماریوں کی ہوتی ہے جن میں دینی اور مغربی علوم کی کتابیں مولانا مودودی کی جائے نشست کے چاروں طرف صف بستہ حاضر رہتی ہیں۔ ایک طرف مبسوط کی جلدوں کی قطار ہے تو دوسری طرف انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کی رجمنٹ کھڑی ہے ۔ اس ہاتھ بخاری اور اس کی شروح ہیں تو اس ہاتھ دستوریات اور قانونیات پر اچھی اچھی انگریزی کتابیں ہیں۔ ادھر اگر اسلامی تاریخ پر بیش بہا قدیم عربی لٹریچر آراستہ ہے، تو ادھر یورپ کی سیاسی، مذہبی اور فکری تاریخ سے متعلّق انگریزی زبان میں جدید لٹریچر آراستہ ہے ۔ اس الماری میں قرآن کی بھاری بھرکم تفاسیر ہیں تو اس الماری میں بائبل سے متعلق سیروں وزنی مجلّات موجود ہیں. کہیں فقہِ اسلامی کی مستند کتابیں سجی ہیں تو کسی دوسری جگہ انگریزی دور کے محمڈن لاء پر چیدہ چیدہ تصانیف موجود ہیں ـــــ وہاں ابنِ خلدون جلوہ فرما ہیں تو یہاں افلاطون ۔ وہ ابنِ تیمیہ ہیں تو یہ کارل مارکس ۔

لکڑی کے فریم میں مرتب کی ہوئی کتابوں کی اینٹوں سے جو چاردیواری بنتی ہے اس کے درمیان ایک جہازی میز پھیلی ہوئی ہے ۔ اس جہازی میز پر بائیں جانب کاغذات رکھنے کا ایک چھوٹا سا خانہ دار ریک پڑا ہے ۔ ریک کے ساتھ چند کتابیں، مسوّدے، پروف، خطوط وغیرہ رکھے ہیں۔ سامنے ایک لمبا چوڑا گتّا پھیلا ہے اور اس پر لکڑی کا زیرِ مشق نشست کے بالکل سامنے رکھا ہے ۔ اس ”تختۂ نوشت“ کے ساتھ لگے ہوئے کلپ نے کاغذ کے تہ بہ تہ

تختے اپنے بھینچے ہوئے ہونٹوں میں پکڑ رکھے ہیں۔ اس سے آگے نکل پالش کیا ہوا قلم دان اور پیپر ویٹ، ایک کاغذ جاذب لگانے کا پیڈ، ایک پن گیر، ایک خاکستر دان، ایک گھنٹی ــــ مکمل سیٹ ــــ ترتیب سے رکھا ہوا ہے۔ دو تین شیشے کے پیپر ویٹ بھی کاغذات پر رکھے ہیں۔ ان چیزوں کو آپ ہمیشہ ترتیب سے رکھا پائیں گے اور ان میں سے ہر چیز کی ایک جگہ ہمیشہ متعین رہے گی۔ ملاقاتی رفقاء اگر آکر اس ترتیب کو بدل دیتے ہیں، تو ان کے جانے کے بعد مولانا کا ہاتھ سب سے پہلے ان کو اپنی صحیح جگہ پر پہنچا دیتا ہے۔ کسی چیز کا بے ڈھنگے پن سے رکھا ہونا مولانا مودودی کے ذہن پر فوری اثر ڈالتا ہے۔ کمرے یا برآمدے میں کوئی کرسی ٹیڑھی رکھی ہو، نماز کے لیئے بچھنے والی چٹائیاں غیر متوازی ہوں، میز پر کے کاغذات ترچھے رکھے ہوں وہ نگاہ پڑتے ہی اپنے ہاتھ سے پہلے ٹھیک کریں گے۔ دو ایک موقعوں پر کرسیوں یا چٹائیوں کے ترچھے ہونے پر مزاحاً فرمایا۔ "اس سے بچھانے والے کے ذہن کا ٹیڑھا ہونا واضح ہوتا ہے۔"

میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اگر مطالعۂ شخصیت کی صلاحیت رکھنے والا کوئی شخص مودودی صاحب کی عدم موجودگی میں ان کے کمرے میں داخل ہوا ور اسے کمرے کا ماحول صرف پانچ منٹ دیکھنے کا موقع ملے تو وہ مودودی صاحب کی آدھی سیرت تو ضرور صحیح صحیح لکھ دیگا اس پرسکون مگر خیال انگیز ماحول میں ــــ مودودی صاحب سوچتے اور لکھتے ہیں۔ وہ صبح ناشتے کے بعد اپنے وقت مقررہ پر آکر کرسی پر بیٹھ جائیں گے۔ پان کی ڈبیہ اور بٹوا ساتھ ہوگا۔ پان کھائیں گے اور دماغ میں فکر و کاوش کا پورا کارخانہ متحرک ہو جائے گا۔ بالعموم انکا چہرہ بتا دیتا ہے کہ اس وقت وہ کس مضمون یا کس مسئلے پر کاوش میں ہیں۔ جب پورا نقشہ ذہن میں مرتب ہو چکے گا، تو وہ قلم اٹھائیں گے، ورنہ یونہی الل ٹپ انھوں نے کبھی کچھ نہیں لکھا ــــ بلکہ پہلے سے سوچے بغیر کوئی بھی کام وہ نہیں کرتے۔ کیا عجب کہ وہ سونے اور کھانے کے لیے بھی پہلے سے سوچتے ہوں، پورا مواد اکٹھا کر لینے، حوالے جمع کر لینے اور سلسلۂ بحث کی کڑیاں دل ہی دل میں جوڑ لینے کے بعد وہ قلم کو حرکت میں لاتے ہیں۔ یوں سمجھیے کہ خط ہو یا ــــ مضمون یا کچھ اور ــــ پہلے وہ اسے اپنے دماغ کے اوراق پر لکھتے ہیں اور پھر اُن

اوراق کو دیکھ دیکھ کر کاغذ پر منتقل کرتے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے لکھنے میں بڑی روانی رہتی ہے اور زیادہ قطع و بُرید نہیں ہوتی۔

مولانا کا قلم بڑا کاغذ خور واقع ہوا ہے۔ ذوقِ نفاست کی وجہ سے وہ ہمیشہ اچھے چکنے اور دبیز کاغذ کو پسند کرتے رہے ہیں اور کئی کئی رِم بیک وقت خرید وا لیتے رہے ہیں، مگر اب کاغذ کی ـــــــ اور خصوصاً اچھے کاغذ کی ـــــ نایابی کے سبب وہ بات نہیں رہی، تاہم پھر بھی عمدہ سے عمدہ کاغذ موجود رہتا ہے۔ وہ فل سکیپ سائز کے پورے تختے پر لکھنے کے عادی ہیں۔ کاغذ کی پرچیوں اور چفتیوں پر کبھی نہیں لکھتے۔

لکھنے سے پہلے وہ شکن ڈال کر داہنی طرف کھلا حاشیہ چھوڑتے ہیں۔ میرے سامنے اس وقت مولانا کے دو قلمی مسوّدے ہیں۔ ایک ۱۹۴۷ء کا (تقریرِ اجتماعِ شمالی ہند منعقدہ دارالاسلام) دوسرا ماضی قریب کا (ترجمان القرآن کی ایک سابق اشاعت کے "اشارات") دونوں مسوّدوں کا حاشیہ اڑھائی اِنچ چوڑا ہے۔ ہمیشہ تقریباً اتنا ہی دیکھنے میں آتا ہے عجیب بات ہے کہ ۱۹۴۷ء والے مسوّدے کے ہر صفحے پر پوری اُنتالیس اُنتالیس سطریں ہیں، اور بعد کے مسوّدے میں سینتالیس سینتالیس ـــــــ یہ منظّم سطر بندی سفید کاغذ پر بغیر زیرِ مسطر کے، ذہن کی اقلیدسی مہارت اور اعصاب پر ان کے انضباط کی دلیل ہے۔ دونوں میں سے کسی مسوّدے کے اوراق کو ذرا فاصلے پر پھیلا دیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک ہی تحریر کی مشینی نقلیں ہیں، قطع و بُرید بہت ہی کم ہے، اور جو کچھ ہے بھی اس کا نصف حصّہ ایسا ہے جو نظرِ ثانی کرتے ہوئے ضروری محسوس ہوا۔ پورے اوراق میں تمام کی تمام سطریں بالکل سیدھی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ بائیں جانب سے عبارت صفحہ کے آخر تک جا کر اِنچ کے دسویں حصّے کی حد تک نیچے کو جھکاؤ رکھتی ہے۔ ہر پیراگراف واضح طور پر الگ سے شروع ہوتا ہے۔ حروف کی اشکال بالکل یکساں ہیں۔ نقطے، شوشے علاماتِ اوقاف اور واوین اپنی اپنی جگہ پر لازماً موجود ہیں۔ بلکہ الفاظ ضروری حرکات بھی اپنے ساتھ لیئے ہوئے ہیں۔ حلقہ دار حروف (مثلاً حد، لق، ظ وغیرہ) کے حلقے اندر سے لازماً خالی ہیں جیسے کہ ہونے چاہئیں۔ جہاں کسی لفظ کو کاٹا گیا ہے یا کوئی جزو بعد میں بڑھایا

گیاہے، وہاں ضرور ہی علامتِ اضافہ (٨) دی گئی ہے۔ گھنی سطروں کے باوجود بین السطور نمایاں ہیں۔

اس طرزِ تحریر کو دیکھتے ہی جو رائے قائم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ لکھنے والا بہت ہی متوازن مزاج آدمی ہے اور پورا پورا احساسِ ذمّہ داری رکھنے والا ہے۔ دوسروں کے حقوق و آرام کا لحاظ کرتا ہے۔ اس کی زندگی میں ضبط و نظم اور باقاعدگی ہے۔ وہ جذباتی آدمی نہیں ہے بلکہ مزاج میں مفکرّانہ ٹھہراؤ رکھتا ہے۔ وہ متحمل مزاج، صاحبِ عزیمت اور تلوّن سے خالی ہے۔ یہ اور ایسے ہی دوسرے اہم نتائج انسانی شخصیّت و کردار کا ہر راز دال پیدا کرسکتا ہے۔ یہاں اس کا موقع نہیں کہ ان نتائج کے حق میں پورا پورا استدلال کیا جا سکے پیشِ نظر شخصیّت خود ان پر گواہ ہے۔ مجھے صحافت کے دائرے میں کام کرنے کی وجہ سے قسم قسم کے رسم الخط دیکھنے کا موقع ملتا رہا ہے اور نئے لوگوں کی طرف سے جو خطوط اور نگارشات موصول ہوتی ہیں ان کے پسِ پردہ کام کرنے والی شخصیّت کا اندازہ کرنا پڑتا ہے اور بسا اوقات لفافے پر لکھا ہوا پتہ دیکھکر ابتدائی تأثر قائم ہو جاتا ہے۔ اونچی اور صاف ستھری شخصیّتوں کے رسم الخط کے چند اہم نمونے میری نگاہ میں ہیں۔ میری شہادت یہ ہے کہ مودودی صاحب کے طرزِ تحریر کے ہم پایہ کوئی دوسرا نمونہ میرے تجربے میں نہیں آیا۔

تحریر ہی کے سلسلے میں آدمی کے خطوط کا طرزِ انشا ربڑی اہمیّت رکھتا ہے۔ مودودی صاحب کے لکھے ہوئے خطوط دیکھنے کا خاص موقع مجھے حاصل رہا ہے، ایک زمانہ میں ترجمان القرآن اور مرکزِ جماعت کی ڈاک کا کام مولانا کی نگرانی میں میرے ذمے رہا ہے ان کی مستقل عادت یہ تھی کہ ڈاک خود دیکھتے تھے اور پوری توجّہ سے دیکھتے تھے اور مختلف شعبوں کے ناظمین کی رہنمائی کے لیے نشانات لگا کر مختصر ہدایات لکھ دیتے تھے۔ جن خطوط میں خود ان کو مخاطب کیا گیا ہوتا یا اسلام یا جماعت کے متعلّق اصولی مسائل دریافت کیے گئے ہوں ان کے جواب وہ اپنے قلم سے لکھتے تھے یا اِملا کراتے تھے۔ ورنہ کم سے کم جوابی مضمون کا خلاصہ اور اس کی ترتیب زبانی بتا دیتے تھے۔

اپنے قلم سے لکھے ہوئے خطوط میں مولانا مودودی کی چند مستقل روایات نمایاں

طور پر محسوس ہوتی ہیں۔ وہی حاشیہ چھوڑنے اور پیرے بنانے اور علامات ڈالنے کی باقاعدگی اور سطروں کی سیدھائی اور تحریر کی صفائی خطوط میں اور بھی زیادہ اچھّا معیار پیش کرتی ہے۔ ہر خط کی پیشانی پر تاریخ ضرور درج ہوتی ہے۔ بلا استثنیٰ تمام خطوط کا سرنامہ "محترمی ومکرمی!" (خواتین کے لیے محترمہ ومکرمہ' السّلام علیکم ورحمۃ اللہ" کے الفاظ پر مشتمل ہوتا ہے اس کے بعد تقریباً ہر جوابی خط کا آغاز "عنایت نامہ ملا" سے ہوتا ہے۔ خاتمہ ہمیشہ "خاکسار ابوالاعلیٰ" کے لفظوں پر ہوتا ہے جو خط کے نچلے بائیں کونے میں اوپر تلے لکھے ہوتے ہیں۔ خط کا پتا ہمیشہ "بخدمت شریف جناب" کے مقرّرہ الفاظ سے شروع ہوتا ہے اور زیادہ تر تین سطروں میں مکمّل ہوتا ہے۔ شہر یا مقام زیرِ خط کشیدہ ہوتا ہے۔ خط کے اس نقشے میں شاید برسوں سے کبھی کوئی تغیّر نہیں آیا۔ بے شمار خطوط کے سابق مطالعہ کے بل پر میں یہ کہتا ہوں کہ کسی خط میں مصنوعی ادبیّت اور غیر ضروری طور پر مزاح کا استعمال نہیں ہوتا اور نہ ضروری نفسِ مضمون پر غیر ضروری فقروں کا اضافہ کہیں محسوس ہوتا ہے۔ خطوط میں مضمون نگاری کے بجائے زیادہ تر گفت گو کا رنگ پایا جاتا ہے۔ عامیانہ گفتگو کا نہیں، عالمانہ گفتگو کا!

وہ لمبا عرصہ جس میں ڈاک میرے سپرد تھی، بالعموم بعدِ ظہر میں مولانا کے ہاں جاتا اور کبھی کبھی دفتر میں اور کبھی باہر آم کے بڑے پیڑ کے نیچے نشست رہتی۔ اہم علمی خطوط کے جوابات مولانا خود املا کراتے ——— کبھی آرام کرسی پر بیٹھے اور کبھی ٹہلتے ہوئے، کبھی کبھی تو مودودی صاحب مجھ سے خطوط پڑھوا کر پہلے سنتے بھی، لیکن اکثر محض یادداشت کی بنا پر بالکل اسی ترتیب سے جواب لکھوا دیتے جس ترتیب سے خطوں میں سوالات درج ہوتے تھے ——— اور کمال یہ کہ سوالات آیات اور احادیث اور فقہ کے مباحث سے متعلّق بھی ہوتے۔ پھر وہ اِملا ایسی روانی سے کراتے کہ کسی موقع پر جملے کا تسلسل اور بحث کا ربط نہ ٹوٹتا۔ بیچ سے اگر اٹھ کر جانا پڑتا یا کوئی صاحب آجاتے تو بعد میں اتنا پوچھتے کہ آخری فقرہ کہاں تک پہنچا۔ بعض اوقات کچھ خطوط میں اپنی میز پر ہی بھول آتا، لیکن مولانا اچانک کسی خط کے بارے میں دریافت کرتے اور مجھے اٹھ کر وہ لانا پڑتا؛ ہفتہ دو ہفتہ کی آئی ہوئی ڈاک کے ایک ایک خط کا ان کو متعیّن طور پر خیال رہتا اور اس کا نفسِ مضمون مستحضر رہتا، لیکن سارے خطوط اِملا ہی نہیں کراتے

جاتے تھے، بلکہ بعض کے متعلق مولانا صرف اشارات دے دیتے اوران کو لکھنے کی ذمہ داری مجھ پرڈال دیتے۔ اس احساسِ ذمہّ داری کی وجہ سے میں بھی پوری کاوش اور محنت کرتا۔ یہ مولانا کاایک مستقل طریقِ تربیت تھا۔

اکثر لوگ شرعی مسائل میں ”استفتار“ بھیجا کرتے۔ ایسے ہر استفتار کے جواب میں تمہیداً یا خاتمہ پر یہ ضرور لکھواتے کہ ”میں مفتی نہیں ہوں۔ فتویٰ نہیں دیا کرتا، صرف اپنی معلومات کے مطابق رائے عرض کرتا ہوں۔ فتویٰ مطلوب ہو تو کسی دارالافتار کی طرف رجوع کیجیے“ اور رائے مسئلے کی ٹیکنکل صورت بتانے کے بجائے اسکی اسپرٹ اور مقصدیّت کو نمایاں کرتی۔ خاص بات میں نے یہ نوٹ کی کہ مولانا مودودیؒ نے کبھی کسی سوال، اعتراض یا اختلاف کرنے والے کو نفرت اور تحقیر اور غیظ وغضب سے مخاطب نہیں کیا، بلکہ ایسی چیزوں کے آنے کو ہمیشہ کام کے حق میں مفید سمجھتے تھے، چاہے ان کے الفاظ اور انداز سخت ہی کیوں نہ ہوں، البتّہ مناظرانہ اور شرپسندانہ ذہن کا انھوں نے کبھی خیرمقدم نہیں کیا۔ ایسے لوگوں کو ہمیشہ نصیحت کرتے کہ مناظرہ بازیاں اور ٹیڑھے سوالات تلاش حق میں کبھی مدد نہیں دے سکتے۔ اختلافی معاملات میں بالعموم یہ لکھواتے کہ میرا مطالعہ یہ ہے' آپ کو یہ قرینِ حق معلوم ہو تو قبول کیجیے ورنہ جس کی رائے آپ کو صحیح معلوم ہو اسی کو اختیار کیجیے۔ فرقہ وارانہ جھگڑوں کے متعلّق خطوط کو بھی وہ خوش آمدید نہیں کہتے تھے اور معلمانہ انداز سے لکھواتے کہ ”ان جھگڑوں کے بجائے دین کی اصل حقیقت اپنانے کی ضرورت ہے، فقہی اور فروعی اختلافات کے لیے باہم دگر توسّع کے ساتھ معاملہ کرنا چاہیے۔“ مجھے ایک موقع بھی ایسا یاد نہیں کہ پوری خط وکتابت میں مولانا نے کسی کی تکفیر کی ہو یا تفسیق! بلکہ زجر و توبیخ کا مولویانہ انداز بھی کبھی اختیار نہیں کیا۔

چنانچہ مجھے ایک طرف اس خطوط نویسی کے زمانے میں مولانا کی سیرت کا دوسروں کے مقابلے میں زیادہ گہرا مطالعہ کرنے کا موقع مفت میں ملا۔ ساتھ ساتھ میری فکری تربیت ہوتی گئی اور نظامِ اسلامی سے متعلق علمی کاوش کے دروازے مجھ پر کھلنے لگے۔ شاید میرے اُسلوبِ نگارش پر بھی اس دَور کا اثر بہت زیادہ پڑا ہے۔

ہاں! ——— ہر بڑے آدمی کی طرح مولانا مودودی کو خطوط میں بڑے بڑے قصیدے بھی موصول ہوتے اور کبھی کبھار زہریلی گالیاں بھی لکھی ہوئی آتیں، مگر نہ کوئی قصیدہ مودودی صاحب کے مزاج پر اثرانداز ہو سکا اور نہ گالیوں کا ردِّ عمل بجز ایک بے نیازانہ تبسّم کے کچھ اور میرے سامنے آیا۔ اس ڈاک کے سوا جو علمی مسائل یا جماعتی معاملات سے متعلق ہوتی، بقیہ خطوط کو محفوظ رکھنے کا اہتمام مودودی صاحب نے کبھی نہیں کیا، ورنہ انبار جمع ہو جاتا۔ اہم محفوظ شدہ خط و کتابت اب "رسائل و مسائل" نامی مجموعے کی صورت میں مطبوعہ ہے۔

ان اشارات سے میں خود نتائج اخذ کرنے کے بجائے، یہ کام اس مقالے کے قارئین پر ہی چھوڑتا ہوں۔

ہر صاحبِ دعوت کو زبان کی ضرورت ہے۔ محض قلم کے بل پر علمی کام کیے جا سکتے ہیں مگر عوام کے قریب ہو کر ان کو سمیٹنے اور منظم کرنے اور کسی تحریک کو آگے لے چلنے کے لیے وہ آدمی موزوں نہیں ہو سکتا جو اسٹیج پر آ کر گنگ ہو جائے۔ مولانا مودودی گنگ نہیں ہیں خطیب ہیں

میں نے ان کا اوّلین خطاب دارالاسلام کی مسجد میں جمعہ کے موقع پر سُنا۔ اَن پڑھ دیہاتیوں کی کثیر تعداد کے اندر تھوڑے سے تعلیم یافتہ لوگ پٹھان کوٹ اور سجان پور کے قصبوں اور قلعۂ جمال پور کی مختصر سی آبادی سے آ کر شامل تھے۔ مولانا نے ان دنوں اردو زبان میں خطباتِ جمعہ کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ (اور اب وہ کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے) اذانِ ثانیہ پر وقار سے اُٹھے، منبر کے (غالباً) پہلے زینے پر کھڑے ہوئے آہستگی اور سادگی سے خطاب شروع کیا ——— ایسے جیسے لوگوں سے باتیں کر رہے ہوں، یہ مستقبل کا ایک بڑا مقرر تھا۔ سیدھے سادھے کلمات کا اثر اس خاموش فضا میں پوری طرح نمایاں تھا۔ بعد میں مودودی صاحب نے متعدّد مواقع پر کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اعلیٰ درجے کے علمی خطبے دیے۔ ارکانِ جماعت کے مختصر اجتماعات میں بار بار تقاریر کیں۔ سوالات کے جوابات دیے اور ہدایات دیں۔ آہستہ آہستہ ان کی خطابت آگے

بڑھتی جا رہی تھی۔ پاکستان بننے کے بعد انھوں نے بہت سے بڑے بڑے جلسوں میں تقریریں کی ہیں اور آئے دن یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اب وہ اپنی نوعیّت کے ممتاز مقرّر ہیں۔

انھوں نے اپنی دعوت کی نوعیّت کے لحاظ سے خطابت کے ایک نئے طرز کی نیو ڈالی ہے اور پُرانے خلافتی مکتبِ خطابت سے الگ ہو کر ایک نیا مکتبِ خطابت استوار کیا ہے۔ مولانا خطابت کو ایک ذمّے داری سمجھتے ہیں۔ اور ضروری قرار دیتے ہیں کہ ایک ایک لفظ پہلے سے غور کرنے کے بعد زبان پر لایا جائے۔ کیوں کہ ہزار ہا بندگانِ خدا پر اس کا اچّھا یا بُرا اثر پڑتا ہے اور اس سلسلے میں آدمی کو آخرت کی عدالت میں جواب دہی کرنی ہے۔ بے ہنگم اور بگٹٹ اور موضوع سے آزاد ہو کر پہاڑی نالوں کی طرح جھاگ اُٹھا اٹھا کر بہنے والی تقریر کو وہ تعلیم و تربیتِ عوام کے لحاظ سے مضر سمجھتے ہیں۔ ان کا سوچا سمجھا ہوا نظریہ یہ ہے کہ ہماری قوم میں سطحی جوشیلے پن کا مرض بڑھ گیا ہے اور ان میں سنجیدہ اور دعوت کو جذب کرنے کی صلاحیت کم ہو گئی ہے۔ اور خطابتی ساحروں نے ان کا مزاج حد درجہ بگاڑ دیا ہے۔ لہٰذا اب اسے جوشیلی اور بے ربط تقریروں کی مزید غذا دینے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ مودودی کے مکتبِ خطابت میں ایسی تقریر کی کھپت نہیں ہے جس میں چٹکلے، لطیفے، کہانیاں، قوالی، مسخرہ پن شورش انگیزی، شوریدہ سری، دریدہ دہنی اور فکری آوارہ گردی کے عناصر پائے جائیں۔ اس مکتبِ خطابت کی تقاریر، سادہ، رواں، سنجیدہ، مدلّل اور ٹھنڈی نوعیت کی ہوتی ہیں۔ انکی روح معلمانہ ہوتی ہے۔ مودودی صاحب نے عمر بھر میں کبھی کوئی ایسی بے سر و پا تقریر نہیں کی جو ایک محدود اور معیّنہ وقت کی حد سے آگے بڑھی ہوا ور ساری ساری رات ہوا میں طوفانی لہریں اُٹھاتے صبح کر دی ہو، پھر نہ نعروں کی بہار، نہ واہ واہ اور نہ سبحان اللہ کا ہنگامہ۔ نہ زندہ باد۔ مردہ باد کا شور۔ کہنے کی بات کہی اور اسٹیج سے رخصت ہو گئے۔

تقریر کے اس ٹھوس اسلوب کے تقاضے سے مودودی صاحب پہلے سے کئی کئی گھنٹے صرف کر کے تیاری کرتے ہیں۔ سوچتے رہتے ہیں، مواد اکٹھا کرتے ہیں۔ پھر سلپ لے کر ان پر تقریر کے مطالب کی کڑیاں مختصر اشارات کی شکل میں درج کر لیتے ہیں۔ جب یہ ہو چکتا ہے تو تقریر کے پورے "موڈ" میں آجاتے ہیں۔ تقریر کرنے سے پہلے کے تھوڑے سے وقفے میں انکے

چہرے پر ایک خاص رنگ پایا جاتا ہے۔جس کو قریب سے جاننے والے ساتھی ہی پہچان
سکتے ہیں۔ اپنے انہی اشارات کے ذریعے وہ اپنی پوری تقریر بعد میں کسی کو بٹھا کر لفظ بلفظ
کی ترتیب سے اِملا کرا دیتے ہیں۔ کئی بار ایسا ہوا ہے کہ ایک ہی تقریر مختلف مقامات پر کرنی
پڑی تو بالعموم ہر جگہ لفظ بہ لفظ دہرائی گئی اور اس کی ترتیب میں سرِ مُو فرق نہیں آیا۔

اسٹیج پر تقریر کرتے ہوئے ان کا جو کچھ مخصوص انداز ہوتا ہے اس کے امتیازی خدو
خال کو میں نے ایک خاص موقع پر تعیّن سے سمجھا۔ ہمارے ایک دوست کرداروں کا ڈرامائی
چربہ اتارنے میں ماہر ہیں۔ خصوصیّت سے مقررین کا تو وہ زندہ ریکارڈ بن کر حیرت میں ڈال
دیتے ہیں۔ انھوں نے ہمارے مجبور کن اصرار پر ایک مرتبہ بڑی جھجک کے ساتھ مودودی
صاحب کی تقریر کا ریکارڈ سنایا۔ اس ریکارڈ کو سننے کے بعد اب میں بآسانی بتا سکتا ہوں کہ
مودودی صاحب کے امتیازات کیا ہیں۔ وہ اسٹیج پر زیادہ تر ڈائس کے سہارے کھڑے
ہوتے ہیں اور کاغذات سامنے رکھ لیتے ہیں۔ سینے تک کا بالائی حصّہ کسی قدر آگے کی طرف
جھکاؤ لیے ہوئے ہوتا ہے۔ ایک ہاتھ غالبًا بایاں —— کمر کے پیچھے رہتا ہے۔ دوسرے
ہاتھ سے وہ شیروانی کے تیسرے یا چوتھے بٹن کو ذرا ذرا چھیڑتے رہتے ہیں۔ یہی ہاتھ کبھی
کبھی بڑی آہستگی سے مختصر سی اشاراتی حرکت کرتا ہے۔ لہجے کے اُتار چڑھاؤ کے ساتھ یہ
حرکت تیز یا سست ہوتی ہے۔ تقریر کی ابتدا دھیمی آواز اور انتہائی ٹھہراؤ سے ہوتی ہے اور
الفاظ میں شخصیّت کا وزن محسوس ہو رہا ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ آواز اور لہجہ چڑھاؤ کی طرف
جاتے ہیں۔ مگر بس ایک معیّن حد تک۔ اس حد سے آگے کوئی ایسا جملہ ہی جا سکتا ہے جس کے
پیچھے شدّتِ جذبات کام کر رہی ہو۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے اور بہت کم وقفے کے لیے یہ رنگ
آتا ہے اور تقریر پھر اپنے مقررہ معیارِ اعتدال پر آجاتی ہے۔ موضوع کے راستے پر مودودی
صاحب گویا بخطِ مستقیم چلتے ہیں اور اِدھر اُدھر کی آوارہ گردی نہیں کرتے۔ تقریریں دردمندی
کی روح ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ انھوں نے دستور اور جمہوریّت اور انتخابات اور دوسرے
اہم اور پیچیدہ مسائل پر جب کبھی خطاب کیا ہے، اپنی بات کو عام فہم بنا کے پیش کیا ہے
اور ہر پیچیدگی کا حسن وخوبی سے تجزیہ کر کے غیر تعلیم یافتہ سامعین تک کو متاثر کیا ہے۔ ان کا

اندازِ تفہیم اپنی مثال آپ ہے۔

اس طرح کی غیر رنگین اور "بے تفریح" تقریر جس میں مجمع کو اس کی دل پسند کوئی نہ کھلائی ہو، دو دو گھنٹے عوام کو بٹھا کر سنانا آسان نہیں۔ اس لیے کہ مودودی صاحب نے جلسوں اور اجتماعات کی ایک نئی فضا برسوں کی محنت سے پیدا کی ہے۔ پہلے اپنے رفقار کو اور پھر ان کے ذریعے عوام الناس کو ضبط و نظم اور سنجیدگی اور خاموشی کی تربیت دی ہے کھیل تماشے کا عنصر اجتماعات سے بالکل خارج کر دیا ہے۔ خصوصًا پابندئ وقت کے معاملے میں ایک نئی روایت قائم کی ہے۔ اس سلسلے میں ایک لطیفہ قابلِ ذکر ہے۔ گزشتہ کُل پاکستان اجتماع کے موقع پر جلسۂ عام بھی رکھا گیا تھا۔ لوگ آٹھ بجے سے جہاں گیر پارک میں جمع ہو چکے تھے اور کچھ ابھی آرہے تھے۔ سوا آٹھ بجے مودودی صاحب کی تقریر ہونی تھی۔ اگلی صفوں میں بیٹھے ہوئے ایک صاحب نے قریب کے دوسرے ساتھی سے پوچھا! "وقت کیا ہے"؟ انھوں نے جواب دیا: "ابھی آٹھ بج کر سولہ منٹ نہیں ہوئے ورنہ مودودی صاحب کی تقریر شروع ہو چکی ہوتی۔

بارہا ایسا ہوا کہ کسی مخالف طاقت نے شر پسند عنصر کو تیّار کر کے مودودی صاحب کی تقریر میں شرارت کرنے اور جلسہ خراب کرنے کے لیے بھیجا، لیکن جماعتِ اسلامی کے جلسوں کی سنجیدہ و منضبط فضا اور مودودی صاحب کی شخصیّت اور ان کے اندازِ تقریر نے ہمیشہ ایسی فضول کوششوں کو ناکام بنا دیا۔ اس سلسلے میں یہ بھی قابلِ ذکر بات ہے کہ مولانا مودودی (بلکہ ان کے رفقار بھی) اس طرح کے حالات سے کبھی بھی گھبراتے نہیں، بلکہ جرارت مندی اور اعتماد کے ساتھ ہر قسم کے حوادث کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو کر جاتے ہیں اور خدا ان کو عملاً بھی کامیابی دیتا ہے۔

جلسوں میں جا کر وہ سوالات کو ہمیشہ خوش آمدید کہتے۔ چنانچہ چِٹوں پر چِٹیں آتی ہیں اور ڈھیر کا ڈھیر جمع ہو جاتا ہے۔ بڑی حوصلہ مندی سے مولانا مودودی ان چِٹوں کو ایک ایک کر کے پڑھتے ہیں۔ اور فقرے میں حاضر دماغی سے ان کے ایسے پھڑکتے ہوئے جواب دیتے چلے جاتے ہیں کہ سامعین اثر لیتے ہیں۔ مثلاً گول باغ کی تقریر (۱۹۵۱ء) میں ایک صاحب نے سوال کیا کہ "جب دوسری پارٹیوں نے مل کر ایک متحدہ صورت اختیار کر لی

ہے تو آپ نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ کیوں بنائی ؟" مولانا نے فوراً جواب دیا کہ
"افسوس ہے کہ مجھے ڈیڑھ ہی اینٹ مل سکی ورنہ میں اس سے بڑی مسجد بناتا۔"

تقریر کے دوران میں (گردے کی تکلیف کی وجہ سے) وہ دو تین بار پانی پیتے ہیں نعرے لگائے جانے کو دل سے پسند نہیں کرتے، بس گوارا کرتے ہیں۔ تقریر کرنے کے بعد چند لمحے سستانے کے لیے کرسی پر بیٹھتے ہیں، پھر جلد روانہ ہو جانا چاہتے ہیں، لیکن لوگ آ آ کر مصافحہ کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ رفقا راستہ بناتے ہیں اور ان کو جلد از جلد بھیڑ سے نکال لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔

میں نے مولانا کی ریڈیائی تقریریں بھی سنی ہیں (جواب مطبوعہ صورت میں ملتی ہیں)، عام رائے یہ ہے کہ مولانا مودودی کی آواز ریڈیو کی ضروریات کے مطابق بہت ہی موزوں ہے آواز بہت صاف سنائی دیتی ہے، اچھی طرح پہچانی جاتی ہے اور تلفظ کی پوری صراحت محسوس ہوتی ہے۔ ریڈیائی تقریروں میں بولنے کی رفتار اکثر اوقات تیز رہتی ہے کیونکہ ۱۰ ریا ۱۵ رمنٹ میں وہ موضوع سے متعلق اپنی پوری بات کہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اب تو مولانا مودودی پر ریڈیو کے دروازے بند ہیں، کیونکہ "سیاسی آدمی" ہونے کا قصور پاکستان میں ایسا قصور ہے جس کے بعد آدمی سے خالص علمی اور فکری اور دینی استفادہ بھی کرنا حلال نہیں رہتا۔

سالانہ اجتماع کی تقریر کا بنیادی نقشہ بالعموم مجلسِ شوریٰ کے مشورے سے بنتا ہے۔ اور امیر جماعت ——— خواہ وہ کوئی ہو ——— اسی نقشے کی پابندی کرتا ہے۔ مولٰینا مودودی اتنی اونچی شخصیّت رکھنے کے باوجود اس پابندی سے استثنیٰ نہیں رکھتے۔ یوں بھی کسی مہم کے سلسلے میں دورے اور خطابات ہوتے ہیں تو ان کے لیے بھی مجلسِ شوریٰ ہی کے اندر باقاعدہ منصوبہ بنتا ہے اور تقریر کے اساسی خطوط معیّن ہو جاتے ہیں، البتّہ فوری اور ہنگامی اور متفرق مواقع پر، جبکہ جماعت کی پہلے سے بنی ہوئی پالیسی کے اندر کام کرنا ہوتا ہے مولٰینا مودودی (اور جو کوئی بھی امیر ہو) تازہ مشورہ کے بغیر خطاب کرتے ہیں۔ جماعت کا مؤسّس اور داعیِ اوّل بھی، اپنی امتیازی شخصیّت کے باوجود جماعت کے نظم

کی پابندی سے بالاتر نہیں ہے۔

نماز کے بھی گوناگوں اسٹائل ہیں اور ہر اسٹائل شخصیّت کا ترجمان ہوتا ہے۔ ریاکار آدمی کی نماز اور خدا ترس کی نماز، بے سمجھے بوجھے کی نماز اور شعوری نماز، زندگی سے ہم آہنگی رکھنے والی نماز اور اس سے تضاد رکھنے والی نماز، جذباتی آدمی کی نماز اور مستقل مزاج شخص کی نماز، عبادت کی نماز اور ارادے کی نماز، عامیانہ شخصیّت کی نماز اور کسی ممتاز شخصیّت کی نماز ایک دوسرے سے بالکل الگ الگ پہچانی جاتی ہیں۔

مودودی صاحب ہمیشہ پابندی سے مسجد میں نمازِ باجماعت ادا کرتے رہے ہیں، لیکن اب جب سے پتھری کی تکلیف اور نزلہ کے پے در پے حملوں نے عمر کے تیسرے مرحلے میں آکر ان کے اعصاب کو حددرجہ کمزور کر دیا ہے، وہ بیشتر نمازیں مرکز کے لان میں رفقاء مرکز اور ملاقاتیوں کے ہمراہ ادا کر لیتے ہیں۔ پھر بھی جمعہ کو ضرور محلّے کی مسجد (مسجد رسول پورہ) میں جاتے ہیں۔ ہر قسم کے خطیبوں کے خطبے سُنتے ہیں اور ہر سطح کے اماموں کی اقتدار کرتے ہیں۔ اس شخص کو جس کے آج دوستوں، دشمنوں کے حلقوں میں چرچے ہیں اور جس کے ساتھ حامیانہ اور مخالفانہ دلچسپیاں رکھنے والے ہزارہا انسان بیرونِ پاکستان کے مختلف ممالک تک پھیلے ہوئے ہیں اس کو آپ مسجد رسول پورہ کے کسی کونے میں ایک درویش بے نیاز کے انداز سے بیٹھا پائیں گے۔ اس کا سر جھکا ہوگا اور وہ خطبہ تفکّر کے ساتھ سُن رہا ہوگا۔ فرض نماز کے بعد دعا ہوتے ہی وہ اٹھے گا اور ایک موجِ نسیم کی طرح غیر محسوس طور پر چلا جائے گا۔

"دارالاسلام" کی مسجد کی امامت زیادہ تر مودودی صاحب کرتے تھے اب بھی مرکز میں یا جماعت کے اجتماعات کے موقعوں پر وہی مصلّے پر کھڑے ہوتے ہیں۔ وضو ہمیشہ گھر سے کر کے چلتے ہیں۔ سنتیں بھی گھر سے پڑھ کر آتے ہیں اور کبھی مسجد میں پڑھ لیتے ہیں۔ امامت کے لیے کھڑے ہوں، تو سیدھے کھڑے ہوتے ہیں، مگر مؤدّبانہ جذبات قیام کے اسلوب سے صاف جھلکتے ہیں۔ نماز کے لیے استقبالِ قبلہ کرتے ہی ان کے اندر ایک خاص طرح کا احساسِ ذمّہ داری پیدا ہو جاتا ہے۔ اُن کی نماز ہمیشہ معتدل ہوتی ہے، نہ غیر معمولی

طور پر طویل نہ جلد بازانہ! ـــــ سکون اور وقار ادائے ارکان میں شروع سے آخر تک جھلکتا ہے۔ قرارت کا انداز بالکل ہی خاص قسم کا ہے۔ ایک ایک آیت الگ الگ کرکے اور اس کے اجزائے مطالب کو واضح کرتے ہوئے قرآن پڑھتے ہیں۔ لہجے میں ـــــ ٹھیک معانی و مطالب کے مطابق اتار چڑھاؤ ہوتا ہے۔ نہ تو مصنوعی طریق سے سُر بناتے ہیں اور نہ بے روح طریق سے عام عبارات کی طرح آیات پڑھتے ہیں۔ کیفیت بالکل ایسی ہوتی ہے اور وہ ساتھ نماز پڑھنے والوں پر اثر انداز ہوتی ہے کہ جیسے کائنات کے فرماں روا کی خدمت میں کھڑے ہیں اور اپنے جذبات پیش کر رہے ہیں اور اُدھر سے لُطف وعنایت طلب کر رہے ہیں۔

مودودی کی نمازیں وہی تحریکی روح پائی جاتی ہے جو ان کے عملی کام میں ہے۔ اس میں دلوں کو بجھا دینے والا وہ جمود نہیں ہوتا جو ہماری نمازوں پر دورِ زوال سے پرتو افگن ہے اور جس کی وجہ سے اوّل تو نماز کی طلب ہی ختم ہوگئی ہے اور اگر اپنے آپ کو گھسیٹ کر لے جائیے بھی تو اُلٹی اُوس پڑ جاتی ہے۔ فرض پڑھنے کے بعد مختصر سی دعا ہوتی ہے اور امامت کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد سنتیں پڑھ کر مولانا مودودی جائے نماز سے الگ ہو جائیں گے اور دوسرے لوگ بھی منتشر ہونے لگیں گے۔ مودودی صاحب نوافل مسجد میں نہیں پڑھتے کیوں کہ قرآن وحدیث کے مطابق ان کا نظریہ یہ ہے کہ فرائض اجتماعی طور پر اور نوافل اخفار کے ساتھ ادا کرنے چاہئیں۔ مودودی صاحب کی امامت نہ بے جا طور پر بوجھل ہوتی ہے، نہ بے روح اور بے کیف ابلا مبالغہ عرض کروں گا کہ پہلی نماز جو میں نے مودودی صاحب کے ساتھ ادا کی اس کا "ذائقہ" پہلے کی تمام نمازوں سے مختلف تھا۔ اس امامت میں نئی شخصیّت جلوہ گر تھی۔ نماز اور قرارت کا یہ خاص اسلوب میں نے پہلے بھی اور بعد میں بھی کسی دوسرے میں نہیں پایا۔ اگرچہ دوسرے حضرات کی نماز اور امامت میں بھی طرح طرح کی خوبیاں اور اثر انگیزیاں محسوس کی ہیں۔ نماز کو صحیح تصوّر نماز بناتا ہے اور تصوّرِ نماز تصوّرِ خدا پر مبنی ہوتا ہے۔ مودودی صاحب کی نمازیں ان کا انقلاب آموز تصوّرِ خدا جاری و ساری رہتا ہے۔ افسوس ہے کہ

یہ چیز صرف نفسیاتی و روحانی تجربہ سے تعلق رکھتی ہے اور مقالاتی بحثیں اسکی متحمل نہیں ہیں۔
دارالاسلام میں، میں نے دوسرے رفقاء کے ساتھ مولانا کے حلقۂ درس میں قرآن اور
حدیث کا جو مطالعہ کیا ہے درحقیقت اس نے میرے ذہنی سانچے کو بڑی حد تک توڑ پھوڑ
کر موجودہ شکل دی ہے۔ مسلسل پانچ برس یہ حلقۂ درس ایک "اسٹڈی سرکل" کے سے انداز
پر ہماری ذہنی و اخلاقی تربیت کا ذریعہ بنا رہا ہے۔ درس بہت جگہ ہوتے ہیں، بہت سے
بزرگ درس دیتے ہیں، لیکن مجبوراً پھر وہی کہنا پڑتا ہے کہ مودودی صاحب کے درس کا
انداز بھی بالکل مختلف پایا۔

طریقہ یہ تھا کہ نمازِ فجر یا نمازِ عصر کے بعد تمام لوگ حلقہ زن بیٹھ جاتے اور اپنے اپنے
مصحف سامنے رکھ لیتے۔ اکثر اوقات ہم لوگ پہلے سے زیرِ درس آنے والے حصہ کا مطالعہ
کرلاتے اور اس کے بارے میں سوالات اور الجھنیں نوٹ کرلاتے۔ مولانا ہلکی آواز سے
تعوّذ اور تسمیہ کہہ کر آغاز کرتے، پھر سلسلۂ کلام کا خلاصہ ذہنوں میں مستحضر کر دیتے، پھر اگلی
آیات کا معنوی ربط سامنے لاتے۔ اس کے بعد ایک ایک آیت پڑھتے، اس کا سادہ، مگر
اثر انگیز اور جدید اردوئے مبین" میں ترجمہ کرتے، پھر خاص خاص اصطلاحی کلمات کی وضاحت
کرتے، جو مغالطے متعلقہ مضمون کے بارے میں عام طور پر پائے جاتے ہیں ان کو صاف
کرتے اور آخر میں احکام اور تقاضے واضح کرتے۔ پھر اگلی آیت، پھر اس سے آگے ——
—— اور اسی طرح تقریباً ایک رکوع ہر نشست میں ہو جاتا۔ اس درس میں کبھی بھی صرف
و نحو اور منطق اور ٹیکنیکل بحثوں کا پَرتو انھوں نے نہ پڑنے دیا۔ ان کا اسلوب عام آدمی
—— خصوصاً تعلیم یافتہ نوجوان —— کو سمجھانے کا ہوتا اور اسی کی ذہنی سطح،
دلچسپی اور الجھن کو وہ پیشِ نظر رکھتے۔ جس بحث سے جدید علوم اور جدید مسائل کا کچھ بھی
تعلق ہوتا، تو ساتھ کے ساتھ ان پر ضرور گفتگو کرتے۔ نیز مختلف فقہی نقطہ ہائے نظر کو
متقابلاً سامنے رکھ دیتے۔ صاحبِ درس کے سامنے اصل نصب العین یہ تھا کہ شرکاء
اپنے اندر قرآن کا انسانِ مطلوب پیدا کریں اور درسِ حدیث کے ذریعے اس کے تفصیلی
خدوخال نمایاں کریں۔

درس کی ایک ایک آیت اور حدیث پر ہر مرحلے میں سوالات کی بوچھار شروع ہوتی۔ سوالات ہر قسم کے ہوتے تھے۔ اونچے علمی قسم کے، سطحی، مذہبی گروہوں کے پیدا کردہ، جدید طبقوں کے اٹھائے ہوئے، ٹھنڈے انداز کے، جذباتی طرز کے ـــــ اور اکیلا مودودی ان سارے حملوں کو خندہ پیشانی سے چار جانب سے سینے پر لیتا۔ حکیمانہ و تفہیمانہ اسلوب سے ہر بات کی وضاحت ہوتی چلی جاتی۔ کسی معرکے کے مسئلے کے چھڑ جانے پر لمبی بحث کا سلسلہ چل نکلتا اور اس کی وجہ سے درس ایک ہی آیت یا حدیث پر رُکا رہتا۔ بحث میں نوعمر سائلین تیزی بھی دکھاتے اور باہر سے آنے والے مہمان بھی طرح طرح سے حصّہ لیتے، مگر صاحبِ درس ٹھنڈے انداز پر بار بار اصل حقیقت کو نمایاں کرنے کی سعیِ مسلسل کرتا چلا جاتا اور آخری جیت اسی کی ہوتی۔ جب خصوصیّت سے جہاں کہیں معاشی اور سیاسی بحثیں پیدا ہوتیں وہاں بڑی گرماگرمی پیدا ہو جاتی۔ کمیونسٹ پروپیگنڈے کے پھیلائے ہوئے تصوّرِ مساوات کی بنیاد پر تو ہم لوگ خوب خوب اُلجھے، بلکہ ندامت کے ساتھ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ دو ایک موقعوں پر ہماری طرف سے زیادتی تک ہی ہوئی، مگر وہ مجسّمۂ استقلال نہ کبھی گھبرایا، نہ کبھی بگڑا نہ ہم سے مایوس ہوا، کوئی اور ہوتا تو شاید لعنت ملامت پر اُتر آتا، حلقۂ درس سے نکال باہر کرتا، بلکہ سلسلۂ درس ہی کو برطرف کر کے بیٹھ رہتا، مگر کیا کرتے کہ وہ وہی مسکراتا چہرہ وہی ٹھنڈا مزاج اور وہی تفہیمی انداز ہمارے سامنے ہوتا۔ باہر سے مودودی صاحب کے نئے نئے عقیدت مند پیری مریدی کی روایات ذہن میں لیے ہوئے آتے اور ہماری بے تکلّفانہ اور آزاد بحثوں کو "غیر شرعی" اور غیر مودّبانہ سمجھ کر خفا ہوتے، کبھی تو حلقۂ درس ہی میں لوک دیتے۔ ہم چپ رہتے اور خود مولانا مودودی ہماری مدافعت کرتے اور ہماری آزادی اور ہمارے حقوق کی وکالت کرتے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بحث فلسفۂ ارتقاء کے سلسلے میں بہت طول پکڑ گئی تھی۔ اسی طرح ایک مرتبہ اَلسُّلْطَانُ ظِلُّ اللّٰہِ (حدیث) پر خوب خوب دماغ سوزی ہوئی۔ غالباً ایک یحیٰی صاحب تھے اور دوسرا میں تھا جن کو کسی علمی بنیاد کے بغیر اصرار تھا کہ یہ حدیث موضوع ہے اور قابلِ استرداد۔ مولٰینا مودودی نے بخلاف اس کے اس کا ایک ایسا مفہوم ہمارے سامنے رکھا جس پر کسی

پہلو سے اعتراض وارد نہیں ہوتا تھا۔ ان کا مطالعہ یہ تھا کہ اَلسُّلطَانُ کے معنیٰ یہاں بادشاہ نہیں، بلکہ سلطنت یا "حاکمیّت" ہیں۔ اور حدیث کا منشا، انھوں نے یہ واضح کیا کہ بادشاہت یا حاکمیّت یا اقتدار اللہ تعالیٰ ہی کے اقتدار کا ایک پَرتَو ہے، اور جو شخص بطورِ حاکم اس خدائی امانت وعطیّہ کو پاکر اس کی اہانت کرتا ہے خدا بھی اسے ذلیل کرتا ہے یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے علم خدا کا ایک عطیّہ ہے جو عالم علم کو نفسانیت کے لیے استعمال کرے وہ مجرم ہے۔ اس مفہوم نے نئے دروازے کھول دیے، مگر حدیث کا جو استعمال ہماری تاریخ میں ہو چکا تھا اور اس کی وجہ سے جو اضطراب عام طور پر نوجوانوں میں پھیلا ہوا تھا اس کی وجہ سے ہم اصرار کرتے تھے کہ ایسی حدیث کو آخر بنائے استدلال بنانا ہی کیا ضرور ہے۔ یحییٰ صاحب تو بڑی صفائی سے کہتے تھے کہ مولانا! جب معلوم ہے کہ ہمارے بادشاہوں کے حفظِ اقتدار کے لیے دنیا پرست عالموں نے حدیثیں گھڑی اور استعمال کی ہیں تو یہ جانتے ہوئے ایسی حدیثوں کو کیوں لیا جائے۔ صاحبِ درس نے بڑی مغز ماریوں کے بعد یہ اصول ہمارے ذہن نشیں کرایا کہ اگر کوئی حدیث روایت وسند کی صحت رکھتے ہوئے کوئی ایسی تاویل وتشریح قبول کرتی ہو جو دین کے اصولوں اور اس کے مجموعی تأثرات کے مطابق بیٹھ سکے تو پھر بلا وجہ اُسے رد کرنے کا کسی کو حق نہیں ہو سکتا۔ بہ ہر حال آزادانہ فضا میں ہم نے دین کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ سمجھا۔

درس ختم ہوتا، تو ہم سب اپنے اپنے مصحف لیے منتشر ہو جاتے کسی دن جاتے ہوئے اپنی کسی فکری غلطی اور کسی عملی کوتاہی کا شعور واحساس لے کر جاتے اور اس کی اصلاح کا جذبہ موجزن محسوس ہوتا۔ کسی دن دین کی کوئی نئی حقیقت دلوں کے دامن میں لیے ایک عجیب سی مسرّت کے ساتھ ــــ جسے مسرّتِ علم کہنا چاہیے ــــ مسجد سے نکلتے کسی دن ذہن کی کوئی الجھن اور زیادہ پیچیدہ ہو جاتی اور وہ اگلے دن سابق درس کے بارے میں از سرِ نو بحث چھڑنے کا محرّک بنتی۔ کسی دن مختلف الخیال رفقا، آپس میں بحث کرتے ہوئے نکلتے اور چوبیس گھنٹے میں فرصت کے موقع پر وہی بحث بار بار جاری رہتی یہاں تک کہ اگلے دن کا درس سامنے آجاتا۔ ایسا بھی ہوتا کہ درس کے بعد ہم لوگ

مودودی صاحب کو ان کے دفتر میں جا گھیرتے اور دماغ کی رہی سہی بھڑاس نکالتے۔ یہ سب کچھ ہوتا، مگر بدتمیزی کے رنگ سے خدا نے فضا کو پاک رکھا۔ کیوں کہ بنیادی کلمہ اور مرکزی نظریہ سب کو انضباط میں لیے ہوئے تھا اور سب طالبِ علم تھے نہ کہ مناظرہ باز نظریات لوٹتے اور بنتے، جامد خیالات پگھلتے اور نئی شکل اختیار کرتے۔ شخصیّت وکردار میں ایک تزلزل سا آتا رہتا۔ ذہنوں میں ہر روز نئے اُتار چڑھاؤ رہتے اور ہم محسوس کرتے کہ ہمارے اندر تخریب وتعمیر کا متوازی عمل جاری ہے۔ ہمارے اندر کا پُرانا انسان دم توڑ رہا ہے اور ایک نیا انسان اُبھر رہا ہے۔ مذہب کے زنگ آلود موروثی تصوّرات اُکھڑ رہے ہیں اور تحریکِ اسلامی کا نیا تصوّر دل ودماغ کے مطلع پر جگمگا رہا ہے۔ الغرض ہم نے مودودی صاحب سے جو چیز بھی قبول کی ہے، اپنی آزادیٔ رائے کو برقرار رکھتے ہوئے اور دلیل وعقلیّت کی بازیاں لڑ کر قبول کی ہے۔ عقیدت مندی کے ساتھ اٰمَنَّا وَصَدَّقْنَا شاید کسی ایک امر میں بھی نہیں کہا۔ مودودی صاحب نے بھی اس طریق تعلیم ودعوت کو سوچ سمجھ کر اپنایا تھا۔ وہ دراصل اندھے مرید نہیں چاہتے تھے کہ جن کا گلّہ بنا کر وہ اپنی عقیدت کے باڑے میں رکھیں اور ان کو اپنی کرامات کی چراگاہ میں چرا کر اس کے گوشت اور دودھ اور اُون سے فائدہ اٹھائیں اور پھر دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے یہ گلّہ اپنی اولاد کے لیے بطور ترکہ اور جائداد کے چھوڑ جائیں ——— وہ ایک سوچنے اور سمجھنے اور اپنے اندرونی جذبے سے حرکت کرنے والی طاقت پیدا کرنے کے اہتمام میں تھے جو اسلامی اصولوں پر ایک نئی دنیا بنانے کا پارٹ ادا کر سکے۔ ہمیں کبھی مغالطہ نہیں ہوا کہ ہم فی الواقع اس گراں بہا کام کے پوری طرح اہل بن گئے ہیں، احساس صرف یہ ہے کہ دارالاسلام کی تربیت نے ہمیں ایسے سوچنے سمجھنے والے پیروانِ اسلام میں بدل دیا ہے جن کا سرچشمۂ فکر قرآن وحدیث ہے اور جو اعتماد کے ساتھ مخالفانہ حالات کے مقابلے میں کھڑے ہو کر دورِ حاضر میں آگے بڑھنے کا راستہ خود بنا سکتے ہیں۔

اس درس کا سلسلہ کبھی کبھی مرکز میں اب بھی جاری رہتا ہے اور اب بھی سوالات اور بحثیں چھڑتی ہیں، مگر سچ یہ ہے کہ ہم دارالاسلام کے دَور کے درس کو ترس گئے ہیں۔

کتنا اچھّا تھا ہمارا وہ زمانۂ نا آشنائی! کتنے ناقابلِ فراموش ہیں وہ "اجنبیّت کے مزے"!

اب اس صاحبِ درس کی شخصیّت کا نقشہ آپ خود اپنے ذہن میں کھینچ سکتے ہیں۔

آیئے، اب ذوقیّات کے دائرے کی طرف!

مولانا مودودی کے ذوقیات کا شجرِ طیبّہ چلائے اور برفاب سے سیراب ہوتا ہے اور اس کی ٹہنیاں پان کے پتّوں سے آراستہ ہیں۔ پان مولانا کے ہاں مسرّت و تفریح کا ترجمان ہے اور یہی نازک سا برگِ سبز پریشانیوں کے بارہائے گراں اپنے کفِ حنائی پر سہارتا ہے، لیکن سب سے بڑھ کر یہ کاوش و تفکّر کی گھڑیوں کا رفیق ہے۔ دماغ میں جونہی سوچنے کی تحریک ہوتی ہے۔ معًا مولانا مودودی کا ہاتھ ڈبیہ بٹوے کی طرف بڑھتا ہے ادھر برگِ سبز پر زردہ چھالیہ ڈالا جا رہا ہوتا ہے اور ادھر خیالات ترتیب پانے لگتے ہیں پان کے چبانے کے لیے جبڑوں کی ہلکی ہلکی جنبش قلزمِ افکار کی نرم خیز لہروں سے بالکل ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ مودودی کی تحریروں میں کوئی شک نہیں کہ پان کے پتّے کی سبزی اس کے کرارے پن، چھالیا اور چونے کی تیزی اور زردے کی حرارت انگیز اور تحریک زا مگر لطیف تلخی کے سارے پہلو شریک رہتے ہیں۔

کل ہی مولانا مودودی سے احباب کی مجلس میں (جو سفرِ حج سے واپسی پر فورًا ہی مرکزی دفتر میں منعقد ہوئی) دریافت کیا گیا کہ کیا پان اس لمبے سفر میں ملتا رہا؟ فرمانے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے خاص انتظام یہ کیا کہ مفتی محمد شفیع صاحب کو ہم سفر بنایا۔ ان کے ساتھ پان کا ذخیرہ تھا اور وہ اسے دیر تک محفوظ رکھنے کا کوئی خاص طریقہ جانتے تھے؛ چنانچہ پان ملتا رہا کوئی چار دن کا فاقہ کیا ہو گا کہ مکّہ پہنچ گئے اور مکّہ کے بارے میں تو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ضمانت ہے ہی کہ یہاں رزق ضرور ملے گا۔ ایک صاحب نے پوچھا: "کیا مولینا! پان بھی رزق کی تعریف میں آتا ہے؟" ——— "اجی واہ، تو کیا روٹی اور سالن ہی کا نام رزق ہے" ——— مودودی صاحب خندہ آمیز انداز سے فرمانے لگے: "اصل رزق تو پان ہے۔"

ایک گفتگو ماہر القادری صاحب نے یوں روایت کی ہے:

"ایک بار پان کا ذکر چل نکلا۔ میں نے مولانا سے کہا کہ آپ تو بڑے شوق سے تمباکو کھاتے ہیں ـــــ مگر میرا یہ عالم ہے کہ چھالیہ میں تمباکو چھو بھی جائے تو اس چھالیہ کو نہیں کھا سکتا۔ اس کے جواب میں مولانا نے فرمایا کہ میں بھی پہلے تمباکو نہیں کھاتا تھا۔ ایک بار کسی صاحب نے تمباکو کا پان کھلا دیا (میرا خیال یہ ہے کہ پنواڑی نے غلطی سے تمباکو ڈال دیا تھا۔ ن۔ص) اور اس پان کو کھا کر مجھے گھمائی آئی۔ بس اس گھمائی کے بعد مجھے تمباکو کھانے کی عادت پڑ گئی ـــــ مگر اس عادت پر اتنا ہی قابو بھی ہے کہ جیل میں جاتا ہوں تو وہاں پان کی یاد نہیں آتی۔"

(مولانا مودودی ـــــ اپنی اور دوسروں کی نظر میں)

جیل جانے کا واقعہ بھی سن لیجیے جسے میں پہلے لکھ بھی چکا ہوں۔ پہلی مرتبہ کی گرفتاری (۴ اکتوبر ۱۹۴۸ء) کے موقع پر ضروری کارروائی اور تیاری ہو چکنے پر مولانا روانگی کے لیے نکلے، برآمدے میں رفقاء سے ملے، سیڑھیوں کے کنارے کھڑے ہوئے اور بہ طرزِ معمول پان طلب کیا: "ڈبیہ بٹوا کہاں ہے؟ آخری پان کھا لیا جائے۔" پوچھا کہ آخری کیوں؟ ہنستے ہوئے فرمانے لگے۔ "بس اب طلاق دے رہا ہوں۔" پان جیسے رفیق کے بارے میں یہ فیصلہ سن کر میں نے پوچھا کہ کیا جیل کے بعد بھی یہ طلاق جاری رہے گی؟ تو فرمایا: "نہیں یہ طلاق رجعی ہے، مغلظہ نہیں۔" اس پر سیّد نقی علی صاحب اور دوسرے لوگ خوب قہقہہ لگا کر ہنسے۔ یوں یہ شخص ہنستے ہنساتے مصافحہ کر کے نامعلوم مدّت کی قید کے لیے مسلّح پہرے میں جیپ گاڑی کے اندر بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔

(مولانا مودودی ـــــ اپنی اور دوسروں کی نظر میں)

مولانا کی رائے میں پان کی ترکیب و ترتیب الہامی ہے۔ فرماتے ہیں کہ ذرا اس کے اجزاء کے تنوّع اور ان کی باہمی مغائرت کو دیکھیے۔ کہاں کہاں سے یہ اجزاء لا کر جوڑ ملائے جاتے ہیں۔ انسانی ذائقہ محض عقل کی رہنمائی سے کہاں یہ ترکیب پیدا کر سکتا ہے۔

ایک بار (جب انگریزی دورِ حکومت تھا) کہنے لگے کہ ان انگریزوں نے اپنی

عادتِ بد کا تو اتنا اہتمام کیا ہے کہ گاڑی کے اونچے درجے کے ڈبّوں میں شراب کے پیگ رکھنے کے اسٹینڈ لگا رکھے ہیں تاکہ راستے میں بھی ـــــــ ضرورت ہو تو لیٹے لیٹے شراب کی چسکیاں لی جاتی رہیں، لیکن ان کم بختوں کو ہمارے پان کا لحاظ نہیں کہ اگالدان لگوا دیے ہوتے۔ اسلامی نظامِ حکومت کبھی آیا تو گاڑیوں کے ڈبّوں میں اُگال دان ضرور لگیں گے۔

دارالاسلام کے دور میں مولانا مودودی کے پاس ایک بڑا سا پاندان تھا جس پر نکل پالش کیا ہوا تھا۔ یہ بالعموم دفتر کی میز پر دکھائی دیتا اور جب مولانا مجالسِ شبانہ میں آبیٹھتے تو پاندان بھی ساتھ آتا۔ حُسنِ ذوق کا یہ نمونہ تاریخی حیثیت اختیار کر گیا، کیوں کہ مولوی منش لوگ باہر سے آتے تو ـــــــ سامنے تو نہیں ـــــــ اِدھر اُدھر دبی زبان سے کہتے کہ یہ پاندان خلافِ شریعت ہے۔ ہم لوگ مسکرا کے سُن لیتے۔ بعد میں یہ راز کھلا کہ ایسے حضرات اسے چاندی کا پاندان سمجھتے رہے تھے اور سونے چاندی کے برتنوں کو محسنِ انسانیّت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اُمّت کے لیے حرام ٹھہرایا ہے۔ خود "پان" بھی بعض لوگوں کے فتووں کا ہدف بنے بغیر نہ رہتا۔ کچھ لوگ اسے ناجائز نہیں کہتے تھے، مگر بڑی لجاجت سے مولانا سے درخواست کر دیتے تھے کہ عام تصوّرات کا لحاظ کرتے ہوئے آپ اسے ترک کر دیں، مگر مولانا مودودی دوسروں کو دکھانے اور دوسروں کو خوش کرنے کے لیے نہ کوئی چیز اختیار کرتے ہیں، نہ کچھ ترک کرتے ہیں۔ ایک پان ہی پر کیا موقوف، کوئی آکر میز کرسی کی نشست پر اعتراض کرتا، کوئی سفید اُجلے لباس پر ہی اپنے انوکھے نظریات کے دھبّے ڈال دیتا، بلکہ ایک مرتبہ تو ایک مہذّب قسم کے مہمان نے دورانِ گفتگو میں دیواروں کی سفیدی کو بھی خلافِ اسلام قرار دیا۔ مودودی صاحب ان امور میں بحث کرنے کے بجائے خوب صورتی سے طرح دے جاتے۔

ضمناً ایک ضروری بات یاد آئی۔ مولانا مودودی ذوقیات کے معاملے میں گھُٹے ہوئے مذہبی ذہنوں کے برعکس بڑے فراخ دل اور عالی ظرف واقع ہوئے ہیں۔ جامد تصوّرِ مذہب ہر ہر چیز پر اعتراض کی انگلی رکھتا ہے۔ خصوصیّت سے پان اور چائے اور

سگریٹ تو بہت ہی بڑے مظلوم ہیں۔ جماعت میں آنے والوں میں جو لوگ حقہ اور سگریٹ کے عادی تھے ان کی اکثر شامت آتی رہی ہے۔ خصوصاً مرکز میں جا رہنے والوں کو تو کسی نہ کسی نو وارد کی خشونت سے نت سابقہ رہتا۔ میں خود اس تلخ تجربہ سے گزرتا رہا، مگر میری اور اس طرح کے دوسرے رفقاء کی محفوظ پناہ گاہ مولانا مودودی ہوتے۔ وہ رسمی مسئلوں کو شریعت کا جزء نہیں مانتے اور ممنوعات کے دائرے کو خواہ مخواہ وسیع کرتے چلے جانے کے قائل نہیں، بلکہ ان کا مسلک یہ ہے کہ اباحت اور رخصت سے فائدہ اٹھانے کا حق کوئی کسی سے سلب نہیں کر سکتا۔ ابتداء میں احتراماً میں مولانا مودودی کے ساتھ بیٹھ کر سگریٹ نہیں پیتا تھا اور خطوط نویسی کے دور میں جب مولانا کے دفتر میں زیادہ دیر بیٹھنے سے اعصاب میں ہلچل ہونے لگتی، تو چپکے سے ان کے پاندان سے زردہ کے چند ریزے لے کر منہ میں رکھ لیتا۔ مولانا جب میری کمزوری سے آگاہ ہو گئے تو کسی مجلس میں بسلسلۂ "حدیثِ دیگراں"، اشارۃً واضح کیا کہ سگریٹ جسے پینا ہو وہ پیے، اس میں کیا حرج ہے۔ جب سے اب تک مولانا ہمارے سامنے پان کھاتے ہیں اور ہم ان کے سامنے سگریٹ پیتے ہیں۔ کسی طرف سے حملہ ہوتا ہے، تو ہم اس پناہ گاہ میں سمٹ جاتے ہیں۔ یوں اب کئی سال کی تربیت سے اس قسم کے جملہ معاملات میں جماعت کی مجموعی فضا انتہائی فراخ دل قسم کی ہو گئی ہے اور کوئی بھی اب خوردہ گیریاں نہیں کرتا۔

میں نے جیل کی ڈائری میں (جس کے چند ہی اوراق شائع ہوئے ہیں) لکھا ہے کہ اپنی چند روزہ رہائی کے دوران میں مولانا کے خلاف مقدمے کی کارروائی سننے ہم فوجی عدالت میں گئے۔ کارروائی ختم ہونے پر ملاقات ہوئی برسبیلِ تذکرہ میں نے بیان کیا کہ سگریٹ چھوڑ دیا ہے۔ مولانا ہنس کر فرمانے لگے، ایسے نہیں، جیل میں آئیے تو چھوڑ دیجیے باہر جائیے تو پھر پیجیے، پھر جیل آئیے تو پھر چھوڑ دیجیے۔"

مولانا مودودی چائے سے بھی رغبت رکھتے ہیں، لیکن مولانا آزاد کے ذوق سے آپ کا ذوق بالکل برعکس ہے۔ مودودی صاحب اس معاملے میں پنجابی نسخہ کے قائل ہیں، یعنی چائے کی پتی بھی بہت ہو، دودھ بھی بہت ہو، شکر بھی بہت ہو، چنانچہ

شکر کے تین چمچے آپ کے لیے پیالے کو میٹھا کرتے ہیں چائے کی گرمی کے ساتھ آپکو برفاب کی ٹھنڈک سے بھی گہری دلچسپی ہے۔ ٹھنڈا پانی مولانا مودودی کی اولین مرغوبات میں سے ایک ہے، مگر ٹھنڈے پانی کا مفہوم ان کے ہاں یہ ہے کہ آدھی برف ہو اور آدھا پانی، حتیٰ کہ جاڑے میں بھی وہ ٹھنڈے پانی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ یاد رہے کہ جب دارالاسلام کے زمانۂ خطر میں رات کو پہرے کا انتظام ہوتا تھا اور ڈیوٹی دینے والے گروپوں میں مولانا کی باری بھی جس رات آتی تھی، تو آپ برف کا انتظام کر لیتے تھے۔ گھنٹے گھنٹے بعد برف کی سل کو سوئے سے توڑا جاتا اور مولانا خود بھی برفاب پیتے اور دوسرے ساتھی بھی!

کھانوں میں مولانا مودودی کے گھر کا ایک خاص مرغوب کھانا "شب دیگ" ہے۔ یہ "شب دیگ" مولانا کی والدہ مکرمہ کی ہدایت و نگرانی میں (بالعموم عیدالاضحیٰ کے موقعوں پر) پکتی اور سارے رفقاء مولانا کے ساتھ مل کر کھاتے... واقعی یہ چیز خوب رہتی۔ تقسیم کے بعد کبھی کبھار اس قصۂ ماضی کی یاد تازہ کی جاسکی ہے۔

مودودی صاحب کے ذوقیات کے سلسلے میں کھانے کا ایک دلچسپ فلسفہ سُنیے۔ ابھی گزشتہ رمضان میں ہمارے ایک "پروفیسر" دوست نے سمن آباد میں مودودی صاحب کو دعوتِ افطار دی۔ یہ دعوتِ افطار مکمل کھانے سے کسی قدر زیادہ "ثقیل" تھی۔ دسترخوان فرش پر بچھا، لیکن چھُری کانٹا موجود! دو چار دوستوں نے چھُری کانٹا اٹھایا، مگر مودودی نے مشرقی وضع نہ چھوڑی۔ میزبان نے پلاؤ کے قریب چمچہ رکھ کر اپنا مشورہ پیش کیا۔ ساتھ ہی کسی صاحب نے پوچھا "چھُری کانٹے سے کھانا اسلامی نقطۂ نظر سے جائز ہے یا نہیں؟" فرمایا جائز کیوں نہیں، مگر دست و دہن کے درمیان اگر کوئی تیسری چیز حائل ہو جائے تو کھانے کا مزہ غارت ہو جاتا ہے۔" اب ایک لطیف سلسلۂ گفتگو پھڑکتے جملوں اور ہلکی مسکراہٹوں کے ساتھ چل نکلا۔ مودودی صاحب نے باتوں باتوں میں کھانے سے متعلّق ایک مکمل فلسفہ پیش کر دیا۔ خلاصہ یہ تھا کہ کھانے کا مزہ محض اُتنے تأثّر کا نام نہیں جو ذائقہ کے ذریعے حاصل ہوتا ہے بلکہ اس میں مختلف

حسّیات حصّہ لیتے ہیں۔ کھانے کا ایک رنگ اور اس کی ایک شکل ہوتی ہے جس سے آنکھیں بہرہ اندوز ہوتی ہیں، ایک خوشبو ہوتی ہے جس سے مشام متأثر ہوتا ہے۔ ان کے ساتھ مل کر ذائقہ کی حس لطف اندوز ہوتی ہے۔ کھانے میں لمس کا بھی ایک حصّہ ہے اور وہ ملتا جبھی ہے کہ انگلیاں براہ راست مس کریں۔ چھُری کانٹے اور چمچے سے کھائیے تو لمس کا یہ حصّہ غارت ہو جاتا ہے۔

ذوقیات کے دائرے میں بہت سی چیزیں قابلِ ذکر ہیں، لیکن اس مضمون کے لیے اتنا ہی حصّہ کافی ہے۔

کہتے ہیں اور ٹھیک کہتے ہیں کہ آدمی کے ساتھ بس کر ہی اسے جانچا پرکھا جاسکتا ہے خصوصیّت سے لیڈروں، وزیروں، علماء، مصنّفوں اور صحافیوں کو دور سے کبھی جانا ہی نہیں جاسکتا۔ کتابوں اور مقالوں، تصویروں اور بیانوں میں بالکل دوسرا آدمی جلوہ گر ہوتا ہے جو تمام محاسن و کمالات کا جامع معلوم ہوتا ہے اصل آدمی ستّر پردوں کے پیچھے بہت دور تاریکی میں چھپا دیکھ رہا ہوتا ہے کہ دنیا کس طرح بے وقوف بن رہی ہے۔ شہرت شخصیّت کا حجابِ اکبر ہے۔ مولانا مودودی کے ساتھ ہم نے رہ بس کر دیکھا ہے۔ ان سطور میں یہی دکھانا مطلوب ہے کہ وہ رفقار کے درمیان کس طرح رہتے سہتے اور گھُلتے ملتے ہیں۔ مطالعۂ شخصیّت کا یہی بہترین طریقہ ہے۔

اولین بات یہ ہے کہ مولانا مودودی اپنے ملنے والوں اور کسی طرح کا تعلق رکھنے والوں میں سے ایک ایک فرد کو پوری اہمیت دیتے ہیں۔ خصوصیّت سے کام کرنیوالے رفقار، چاہے وہ عمر، علم، منصب، کارکردگی اور دوسرے اوصاف کے لحاظ سے کسی بھی درجے کے ہوں، سب کے سب ان کی نگاہ میں ایک ہی طرح کی دوستانہ اہمیّت رکھتے ہیں اور ایک ہی طرح توجّہ حاصل کرتے ہیں۔ اپنے ہر ملاقاتی اور اجتماعات میں شریک ہونے والے تمام کارکنانِ جماعت پر وہ فرداً فرداً توجّہ صرف کرتے رہے ہیں۔ اب چوں کہ تعداد زیادہ ہو چکی ہے اور شرکائے اجتماع بہت زیادہ ہوتے ہیں اس لیے وہ دورِ اوّل والی بات تو نہیں رہی، پھر بھی ہر ایک سے انفرادی ربط رکھنے کی کوشش

مولانا ضرور کرتے ہیں۔ وہ تقریباً تمام ارکانِ جماعت کو فرداً فرداً نام اور شکل سے جانتے ہیں
بیشتر صورتوں میں ان کے ذہنی ارتقار کے مراحل اور ان کے جماعتی احوال کو سمجھتے ہیں، خوبیوں اور
کمزوریوں سے باخبر رہتے ہیں۔ مقامی جماعتوں کے حالات کی یاد تازہ رکھتے ہیں کئی کئی سال پہلے جن لوگوں کو
کبھی ایک بار دیکھا تھا ان کو دیکھتے ہی پہچان لیتے ہیں اور اسی طرح گزشتہ سلسلۂ واقعات کو مستحضر کر لیتے
ہیں۔ گردہ کے آپریشن کے بعد ان کا حافظہ اگرچہ متأثر ہوا ہے، اور اب کسی موقع پر کوئی چیز یاد دلانے کے لیے ان کو
ذراسی کاوش کرنی پڑتی ہے، لیکن متعلّقہ افراد کو اہمیت اور توجہ دینے کی خوبی جوں کی توں قائم
ہے۔ ہر ایک کو اہمیّت اور توجہ دینا خود پسندی، علیحدگی پسندی اور اپنی ذات میں سمٹے رہنے
کی عادت کے بالکل نقیض ہے اور مولانا مودودی کی شخصیّت کی مستقل جاذبیّت کا ایک سبب
یہی ہے۔

اسی کے ساتھ ساتھ وہ ہر ایک کو اعتماد میں لیتے ہیں، شریکِ مشورت کرتے ہیں اور
ذمّہ داریاں سونپتے ہیں۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ انھوں نے ساتھیوں سے بات چھپانے کی کوشش
کی ہو یا ان کے خلاف بے اعتمادی کا اظہار کیا ہو۔ ہماری ہزاروں کوتاہیوں کے باوجود مودودی
صاحب کی افتادِ مزاج میں کبھی کوئی تغیّر واقع نہیں ہوا۔ انھوں نے رفقار کے درمیان کبھی
اقرب اور ابعد کا امتیاز نہیں کیا۔ ایک کے خلاف دوسرے کے سامنے کسی طرح کا اظہار
تکدّر اور اظہارِ نفرت نہیں کیا۔ دارالاسلام کے دور سے لے کر اب تک ایسا ہوتا رہا ہے
کہ جب کبھی کسی سفر سے آمد ہوئی، کسی ملاقات اور گفتگو اور مشاورت سے فراغت ہوئی،
کوئی اجلاسِ شوریٰ ختم ہوا، تو مولانا مودودی کے گرد رفقار جمع ہو جاتے ہیں اور بے تکلفی سے
باتیں پوچھتے اور باتیں سُنتے ہیں۔

مولانا مودودی بحیثیت امیر اگرچہ کارکنانِ مرکز اور باہر کے ماتحت امرار کے لیے نیز
خاص طور پر دفتر ترجمان القرآن کے کارکنوں کے لیے "افسر" کی حیثیت رکھتے ہیں۔
لیکن برسوں کا تجربہ گواہ ہے کہ انھوں نے کبھی بھی افسرانہ اور تحکمانہ انداز سے نہ کوئی کام کسی کو
سونپا ہے نہ بازپُرس کی ہے اور نہ بالادستی کے اظہار کے لیے اس طرز سے نگرانی کی ہے
سارا معاملہ دوستانہ انداز سے چلتا ہے۔ اسی دوستانہ انداز کی چاٹ ہے کہ مولانا کے

ساتھ رہ کر کام کرنے کا ہر کسی کو شوق رہتا ہے اور کوئی اُن کا ساتھ چھوڑ کر جانے پر اس وقت تک آمادہ نہیں ہوتا جب تک جماعتی مصالح کا شدید تقاضا نہ ہو۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مولانا مودودی کے ہاں ہر شخص کو خصوصیّت سے رفقار کو اختلاف اور تنقید کا پورا پورا حق حاصل رہتا ہے۔ عام اصطلاح کے لحاظ سے چھوٹے سے چھوٹا آدمی اٹھے گا اور علیٰحدگی میں مولانا سے ملے گا اور رُو در رُو بات کہہ دے گا جو اس کے ضمیر کی بات ہو۔ تنہائی تک ہی محدود نہیں بلکہ عام مجالسِ گفتگو میں کوئی رفیق کسی بات پر کہہ دے گا کہ مجھے اس سے اختلاف ہے یا آپ کا نقطۂ نظر فلاں جماعتی اصول سے یا آپ ہی کے فلاں قول سے ٹکراتا ہے اور پھر اجتماع میں ——— رفقار اٹھ کر بے دھڑک سوالات کریں گے۔ جماعتی نظم میں اسلامی جمہوریت کا یہ پہلو بڑی ہی اہمیّت رکھتا ہے اور اس کی وجہ سے کسی بھی منصب پر آنے والا شخص ایک کڑے امتحان سے گزرتا ہے۔ چونکہ سب سے بڑا منصب مرکزی امارت کا ہے، لہٰذا مرکزی امیر پر معاملات و مسائل اور نزاعات کے بھاری بوجھ کے ساتھ تنقید کی اتنی بوچھار رہتی ہے کہ پہاڑ کا ساعزم درکار ہے تنقید کے حق کو اسلامی تقاضوں کے مطابق استعمال کرنے کی تربیت پاتے رہنے کے باوجود جماعت میں ہمیشہ ایسے نئے لوگ موجود رہتے ہیں (اور بعض دیرینہ ساتھی بھی اپنے مزاج کی وجہ سے ہمیشہ نئے رہتے ہیں) جو بے ڈھنگے پن سے تنقید کرتے ہیں، مگر مولانا مودودی اس بوچھار کا مقابلہ تحمل اور شگفتگی کے ساتھ کرتے ہیں اور ڈانٹ ڈپٹ یا تُرش رُوئی کا کبھی مظاہرہ نہیں کرتے۔ انھوں نے اسلامی اصول کے مطابق اپنی پوری زندگی کو ایک کھلی کتاب کی طرح جماعت کے سامنے رکھدیا ہے۔ اس کے کسی بھی صفحے کی کسی بھی عبارت پر ہر رفیق کو اظہارِ رائے اور تنقید، بلکہ کہنا چاہیے کہ باز پُرس کا حق حاصل ہے۔ چنانچہ جماعتی امور سے آگے نکل کر مولانا کے گھر اور ان کے بچّوں کی تعلیم و تربیت اور دوسرے شخصی معاملات تک پر متعدّد بار لوگوں نے کھُل کر گفتگوئیں کی ہیں۔ زندگی کو اس طرح سب کے سامنے رکھدینا اور تنقید و اعتراض کا حق دے دینا کوئی آسان کام نہیں ہے، جسے آسان معلوم ہو وہ اُسے کر کے دیکھے۔ اس مقام تک شاید آج کوئی لیڈر اور عالمِ دین مشکل ہی سے

رسائی رکھتا ہو گا۔ اور رفقا نے جس شخص کو بار بار اعتراضات کی چھلنیوں چھان کر اور تنقید کے چھاجوں پھٹک کر دیکھا ہے وہی اس کی صحیح قدر پہچانتے ہیں۔ مولانا مودودی کو مصنوعی زندگی سے سخت گریز ہے۔ لباس وضع قطع اور دوسرے پہلوؤں میں لوگوں نے ان کو طرح طرح کے مشورے دیے ہیں، لجاجت سے اصرار کیا ہے، لیکن مولانا نے کسی کو خوش کرنے کے لیے کبھی کوئی ایسی تبدیلی اپنے اندر نہیں کی جس کے لیے دین خود تقاضا نہ کرے اور ضمیر کے اندر حس کے لیے تحریک نہ ہو۔ بعض لوگ چاہتے تھے کہ آپ نوافل پڑھا کریں بعض کو اصرار تھا کہ ڈاڑھی زیادہ لمبی رکھیں، بعض کا مشورہ تھا کہ سر کے بالوں کی ہیئت بدل دیں، بعض کا تقاضا رہا کہ اسلوبِ نگارش اور طرزِ گفتگو میں تبدیلیاں کریں، اور کچھ یہ چاہتے کہ لباس میں پیوند لگایا کریں۔ لیکن مولانا مودودی دوسروں پر اثرانداز ہونے کے لیے کسی ادنیٰ سی ترمیم پر بھی کبھی راضی نہیں ہوے۔ ساتھ ہی انھوں نے اپنی کسی عادت اور اپنے کسی معمول کو کبھی کسی سے اخفا میں رکھنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ ڈرامائی کردار بننے پر کبھی ایک لمحہ بھی تیار نہیں ہوئے۔

رفقا کی عزّتِ نفس کا مولانا کو ہمیشہ خیال رہتا ہے۔ وہ ان کا پورا احترام کرتے ہیں اور اسلامی آداب کے ساتھ ان سے مساویانہ معاملہ کرتے ہیں۔ انھوں نے کبھی کسی رفیق کو ملامت نہیں کی، بُرا بھلا نہیں کہا، غضب ناک ہو کر سخت گیرانہ معاملہ نہیں کیا۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ ان کی تربیت سے تغافل برتا ہے۔ تربیّت ہمیشہ مدّ نظر رہی بس اس کا منصوبہ جداگانہ نوعیّت کا تھا۔ مولانا مودودی کے طریقِ تربیّت کا ایک جز تو وہی اعتماد میں لینا، احترام ملحوظ رکھنا ذمّہ داریاں سونپنا اور دوستانہ سطح پر معاملہ کرنا ہے اس کے ساتھ ساتھ وہ کریم النفسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے چھوٹی چھوٹی چیزوں پر گرفت نہیں کرتے اور اہم ترکوتاہیوں پر وہ ایک خفیف سے اشارے یا بالواسطہ طرز کے ایک جملے کے ذریعے ہنستے مسکراتے احساس دلا دیتے ہیں۔ اس سے آگے کا معاملہ ہو تو بغیر کسی گرما گرمی کے پاس بٹھا کر تفصیل سے بات سمجھا دیتے ہیں۔ اظہارِ ندامت پر فراخدلی سے معاف کرتے رہتے ہیں۔ اگر کسی رفیق یا ملازم کی اصلاح سے لمبے تجربے کے بعد وہ بالکل

مایوس ہو جائیں ـــــــ اور ایسی صورتیں پورے گزشتہ دور میں شاید دو ہی چار پیش آئی ہیں۔ ـــــــ تو خوبصورتی سے معاملہ ختم کر دیتے ہیں۔ مولانا مودودی کا یہ طویل المیعاد طرزِ تربیت نتائج کے لحاظ سے بہت کامیاب رہا ہے۔ خصوصًا انھوں نے اپنی بیگم صاحبہ کی زندگی میں جو انقلاب پیدا کیا ہے، وہ حیرت ناک ہے۔ ہماری یہ بہن ایسے خاندان سے آئیں جس میں مغربیّت تیزی سے چھا رہی تھی۔ مولانا مودودی کی والدہ مکرّمہ کے اصرار سے یہ رابطہ قائم ہوا۔ شادی کے بعد جب مولانا مودودی کے نظریات وعزائم زیادہ اچھّی طرح واضح ہونے لگے اور پھر جب وہ ایک ایسے راستے کی طرف مڑ گئے جو دنیوی کامرانیوں کے باغ و بہار سے نہیں، بلکہ فقر و فاقہ کے خارزار سے ہو کر گزرتا تھا اور وہ خارزار عملاً دار الاسلام کی بے رونق اور سادہ دیہاتی زندگی کی صورت میں بالکل سامنے آگیا، تو ان محترم بہن کے سارے خواب درہم برہم ہونے لگے۔ وہ گویا عیش و مسرّت کی ایک دنیا سے ایثار و امتحان کی بالکل ایک دوسری دنیا میں منتقل ہو گئیں۔ دل و دماغ میں جو ہلچل ایسے انقلاب سے ہونی چاہیئے تھی وہ ہوئی۔ لیکن مولانا مودودی ٹھنڈے دل سے ایک ٹھنڈی اسکیم کے تحت ان کی دلجوئی کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ وہ کچھ درس سُنتے سُنتے، کچھ لٹریچر پڑھتے پڑھتے، اور خاص ماحول میں رہتے رہتے آخر کار اپنی جگہ سے ہل گئیں۔ پھر جو وہ ایک بار آگے بڑھیں، تو ایسی جگہ آپہنچیں کہ جہاں ان کے اندر ایک نئی شخصیّت پیدا ہو گئی۔ بالکل اسی طرح مولانا مودودی اپنے بچّوں کو مارنے اور بُرا بھلا کہنے اور بات بات پر ٹوکے بغیر مشفقانہ انداز میں تربیت دینا پسند کرتے ہیں۔ کبھی اچانک کوئی غلط حرکت کریں، تو ایک آواز آئے گی ہاآں ـــــــ ہائیں ـــــــ یا اونہہ ہونہہ ـــــــ بس یہی مولانا مودودی کا عصائے تربیت ہے جسے وہ بچّوں پر استعمال کرتے ہیں[1]۔

رفقاء نے ہمیشہ مولانا کی شخصیّت سے درسِ عزیمت و استقلال لیا ہے۔ موقع بموقع مولانا ہی کی ذات نے ان کی ہمّت بندھائی ہے۔ ڈرپوک اور کمزور شخصیّتیں اپنی کمزوری اپنے

---

[1] بچوں کے موجودہ حالات کو دیکھ کر بعض اوقات ان کے خیرخواہ پریشان ہوتے ہیں۔ اصل میں وجہ خرابی یہ ہوئی کہ مولانا مودودی بچوں کو کافی وقت نہ دے سکے اور خاندان کے بعض دوسرے مغرب زدہ عناصر نے بچوں کو کئی بار ساتھ رکھ کر غلط اثرات ڈال دیے۔ بچے بچارے معرضِ کشمکش میں رہے اور متضاد اثرات میں گھر گئے۔ ورنہ یقینًا وہ بہت بہتر ثابت ہوتے اور خود مولانا کے کام کو آگے بڑھاتے۔

اپنے ساتھیوں میں منتقل کر دیتی ہیں اور اسی طرح عزیمت و استقلال کے پیکر قریبی لوگوں پر بھی اپنے اس جوہر کا پَرتو ڈال دیتے ہیں۔ دارالاسلام کے دورِ خطر میں مولانا مودودی آس پاس کی بستیوں کی فضا درست رکھنے کے لیے ہمارے گروپ مرتب کر کے بھجواتے تھے اور تاکید کرتے تھے کہ کوئی شخص ایک چھڑی اور ایک چاقو تک ساتھ لے کے نہ جائے۔ کیوں کہ مسلّح ہو کر امن و سلامتی کی دعوت دینا بے معنیٰ ہے، اور ہم بے دھڑک علاقے میں گھوم آتے حالانکہ ہمیں معلوم تھا کہ نفرت و کدورت اور فتنہ و فساد کی بارود ہر آبادی کے نیچے بچھ رہی ہے۔ جب دورِ فساد شروع ہو گیا تو اس عالم میں مولانا مودودی نے بہ نفسِ نفیس بستی کی حفاظت کے لیے فوجی نظام تجویز کیا اور بہترین منصوبہ بنایا۔ خود وہ اس نظام کے کمانڈر تھے اور تمام انتظامات میں حصّہ دار رہے۔

جن دنوں کشمیر کے نام پر ہمارے خلاف "جہادِ اکبر" لڑا جا رہا تھا، لاہور کے ایک روزنامے نے (جسے جماعتِ اسلامی سے خدا واسطے کا بیر رہا ہے) ایک زہریلا نوٹ لکھا اور جھوٹ کی کڑیاں ملا ملا کر فتویٰ دیا کہ یہ لوگ غدّار ہیں، میں تسنیم کے ادارے میں شریک تھا۔ مولانا سے مشورہ لینے گیا کہ اس پر تردیدی نوٹ چاہیے مولانا مزاحاً کہنے لگے تردیدی کیوں ـــــ صاف صاف کہیے کہ ہم اقراری مجرم ہیں ـــــ بس اتنے سے فقرے نے مجھے اور دوسرے شرکائے مجلس کو متاعِ عزم و ہمّت سے مالا مال کر دیا اور اس وقت میرے ذہن میں ایک مصرع نمودار ہوا "ہم لوگ اقراری مجرم ہیں!" اگلی صبح تک نظم مکمل ہو گئی۔ پھر جب یہ ہنگامہ اور بڑھا اور جوابی کام کرنے کے لیے اخبارات کی طاقت بھی ہم سے چھین لی گئی، تو طے پایا کہ شہر کے ہر حصّے میں جلسے کر کے اپنی بات واضح کی جائے، سوال یہ تھا کہ ابتدا کس حصّے سے کی جائے۔ مودودی صاحب کہنے لگے کہ سب سے پہلے "خطرناک ترین" موقع کو لیجیے، اور وہ موچی دروازہ تھا۔ ان کے اس مشورے نے جو خاص رُوح کارکنوں کے اندر پھونک دی اس کا آج تک ہمیں اندازہ ہے۔

اور پھانسی کی کوٹھڑی میں! ـــــ اعزّہ و رفقا ملنے جاتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہے؟ "جی ہاں! عینک کے خانے اور خلال کے چند تنکوں

کی ہے"۔ یہ تھا اس شخص کا جواب جس کے لیے پھانسی کا پھندا تیار ہو رہا تھا۔ مولانا مودودی نے رحم کی اپیل کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس سلسلے میں دریافت کرنے پر جو تین وجوہ آپ نے بیان فرمائے ان میں سے ایک یہ تھا کہ اگر میرے جیسے آدمی نے بھی جان بچانے کے لیے رحم کی اپیلیں کرنا پسند کر لیا تو پھر اس ملک میں غیرت و حمیّت کا بالکل خاتمہ ہو جائے گا۔

اور جب فوجی عدالت میں مقدمہ چل رہا تھا ـــــــ مولانا کے وکیل نے ایک راہ یہ سجھائی کہ آپ "تسنیم" کے شائع کردہ بیان کو اپنانے سے انکار کر دیں، لیکن مولانا کی سیرت نے اس مشورہ کو مسترد کر دیا اور جب عدالت میں پوچھا گیا تو آپ نے کسی قدر زور دے کر کہا کہ "ہاں یہ پورا بیان میرا ہے!"

مولانا اپنے رفقاء کے درمیان اس سادہ زندگی کی وجہ سے بھی محبوب ہیں جو ان کا تعلق مساویانہ اخوّت کی بنیادوں پر جوڑتی ہے۔ ان کا لباس ہمیشہ سادہ رہا اور بسا اوقات تو ان کے کُرتے اور پاجامے پر خوبصورتی اور مہارت سے لگے ہوئے باریک پیوند بھی ہم نے دیکھے ہیں۔ لیکن یہ نمائشِ فقر سے ہمیشہ خالی پائے گئے۔ ان کے ہاں کھانے بار بار کھانے کا موقع ملا اور دعوتوں میں شرکت کی، لیکن کھانا ہمیشہ سادہ پایا۔ دفتر میں میز کرسی ہمیشہ رہے، لیکن صوفوں اور قالینوں کو کبھی بار نہ مل سکا۔ کبھی کوئی ماما یا کوئی بچہ گھر میں ملازم رہتا ہے، لیکن تمام کاموں کے لیے نوکروں کا بیڑا کبھی بھرتی نہیں ہوا۔ اس سبب سے مولانا مودودی کو دن میں کئی کئی بار خود ہی اٹھ کے گھر جانا پڑتا ہے، اور بچے دروازے پر دستک دے کر بلا وا دیتے رہتے ہیں۔ مولانا مودودی اپنے ہاتھ سے بہت سارے کام کر لیتے ہیں اور ایسے کاموں کی فہرست بہت دلچسپ ہے مگر تفصیل کا موقع نہیں۔ یہ سادہ زندگی ان کے لیے رفقاء سے مساویانہ رابطہ رکھنے کو آسان بناتی ہے ـــــــ دارالاسلام میں ہر روز شام کو کبھی کرسیوں پر، کبھی چٹائیوں پر اور کبھی کنارِ جُو پتھروں اور گھاس پر تکلف برطرف کر کے برادرانہ محفل جمتی اور مولانا مودودی اس میں "یکے از ما" بن کر بیٹھتے۔ رات کو اجتماعی کھانا ہوتا اور گوناگوں کھانے یکجا ہو جاتے اور باہم دگر "دست درازیاں" ہوتیں۔ اجتماعی کھانے کی رُوحِ رواں ہمیشہ مودودی صاحب رہے

وہ نہ ہوتے تو کھانا پھیکا ہو جاتا۔ اب لاہور میں صرف عید کے موقع پر اس اجتماعی کھانے کی یاد تازہ کی جاتی ہے۔

اجتماعات کی صورت میں کئی برس تک مولانا ایک عام رکن کی طرح قیام وطعام کے عام انتظام میں حصّہ دار ہوتے۔ فرش پر سوتے اور سب کے ساتھ مل کر رہتے۔ اب گردوں کے آپریشن کے بعد ان کی کمزوری کا لحاظ کر کے ان کے رفقاء نے پرہیزی کھانے کا انتظام شروع کیا ہے اور ان کو اجتماع گاہ میں قیام گاہ کا ایک گوشہ الگ کر کے دے دیا جاتا ہے تاکہ وہاں وہ ضروری امور کے لیے سوچ سکیں، تقریر کی تیاری کر سکیں اور آرام لے سکیں، مگر آرام کہاں! اسی طرح وہ سفر میں جب بھی رفقاء کے ساتھ جاتے ہیں، تو اسی درجے میں سفر کرتے ہیں جس میں سب کے لیے سفر کرنا ممکن ہو ـــــ اور یہ تیسرا درجہ ہی ہو سکتا ہے۔ دونوں کُل پاکستان اجتماعات (۱۹۵۱ء، ۱۹۵۵ء) میں کراچی تشریف لے گئے، تو اسی آخری درجے میں سفر کیا۔ کسی ایک موقع پر کہیں ان سے کسی ملاقاتی کی جانب سے سوال کیا گیا کہ "ہیں! آپ اور تھرڈ کلاس میں؟" فرمایا! "اگر چوتھا درجہ ہوتا تو اسی میں سفر کرتا۔"

اندازہ کر لیجیے کہ یہ کیسی شخصیّت ہے اور اس کے ساتھ اس کے رفقاء کی وابستگی کس نوعیّت کی ہو گی!

ہاں ـــــ اس سادہ زندگی کے پس منظر میں وہ ایثار کام کر رہا ہے اس زمانے میں اپنی مثال آپ ہے۔ جب اپنا نصب العین معیّن کر کے آپ فرض کے راستے پر چل پڑے، تو بار بار ایسے مواقع آئے کہ ترجمان القرآن سے کبھی ایک حلقہ کے خریدار لوٹ جاتے، کبھی دوسرے حلقہ کے۔ لیکن مودودی کے ایمان نے اس ٹوٹ پھوٹ کی کبھی پروا نہیں کی۔ آخر میں مسلم لیگی حلقوں کے ناراض ہونے کا تو رسالہ کی خریداری پر نمایاں اثر پڑا۔ مگر حق کا وہ سپاہی اپنے موقف سے نہیں سرکا۔ حالات کی اس گردش میں بار بار مولانا مودودی فقر و فاقہ کی بالکل سرحد پر پہنچتے رہے ہیں، اور دوسری طرف تنِ تنہا بہت ساری ذمہ داریاں اٹھانے کی وجہ سے رات کو دو دو بجے تک بیٹھ کر کام کرنے کے عادی رہے ہیں۔ ترجمان کے مقالات کے مجموعے کتابی شکل میں آئے اور دوسری کتابیں شائع ہوئیں تو یہ لٹریچر

حد درجہ مقبول ہوا اور کئی کئی ایڈیشن اب تک نکلے ہیں۔ آمدنی کا یہ جائز اور وسیع ذریعہ تھا۔ اور اس سے مولانا مودودی اپنی مالی حالت کو ہمیشہ کے لیے مضبوط بنا سکتے تھے، لیکن انھوں نے یہ کتابیں تحریک کے لیے وقف کر دیں۔ اس وقت دو چار کتابوں کے علاوہ باقی کئی کتابیں جن کی تعداد پچاس ساٹھ کے قریب ہوگی، سب جماعتِ اسلامی کی ملک ہیں اس ایثار کے ساتھ دوسرا ایثار یہ تھا کہ جماعت اور تحریک کے عائد کردہ مختلف فرائض کا بار شروع سے بلامعاوضہ اٹھایا۔

حالاں کہ یہ شرعاً اور اخلاقاً ناجائز نہیں تھا کہ مولانا اپنا پورا وقت دیتے ہوئے بقدرِ کفالت جماعت سے معاوضہ یا کم سے کم وظیفہ لیتے۔ اس کے لیے اصرار بھی کیا گیا، لیکن وہ قرض اٹھا اٹھا کر تو کام چلاتے رہے، یہ صورت بالکل قبول نہیں کی۔

سوچیے کہ ہمارے پاس کتنی ایک مثالیں ایسی موجود ہیں!

اس موضوع کے سلسلے میں ضروری ہے کہ مولانا مودودی کا پارٹ مجلسِ شوریٰ میں دکھایا جائے جو بیرونی دنیا کی نگاہوں سے بالکل اوجھل ہے۔

مودودی صاحب ہمیشہ مقررہ وقت پر پہلے سے "ایوان" (جو بیشتر ان کا دفتر ہی ہوتا ہے) میں موجود رہتے ہیں۔ لوگ آتے اور بیٹھتے جاتے ہیں۔ ماحول بڑا سنجیدہ ہو جاتا ہے۔ سابق کارروائی سنائی جاتی ہے، ایجنڈا پڑھا جاتا ہے اور اکثر اوقات تمام ارکانِ شوریٰ باری باری اپنے اپنے علاقوں کے تحریکی حالات کے بارے میں معلومات پیش کرتے ہیں۔ پھر مسائل پر بحث شروع ہوتی ہے۔ مولانا مودودی بحث کے دوران میں "نقطہائے نظر" کو سمجھنے کے موڈ میں پُرسکون طریق سے بیٹھے رہتے ہیں۔ ابتدائی عام بحث کے بعد آہستہ آہستہ دو یا زیادہ اختلافی آرا متعیّن شکل میں سامنے اور ضرورت ہو تو ان کو مولانا مودودی بصیرت مندانہ تجزیہ کے ساتھ بیان کر دیتے ہیں۔ اب ان آرا کے حق میں مختلف افراد (جو کبھی مستقل گروہ بندیوں کی شکل اختیار نہیں کرتے) انفرادی طور پر استدلال کرتے ہیں۔ بحث اگر انضباط سے ذرا ادھر اُدھر ہو تو مولانا ٹھنڈے انداز سے از سرِ نو تجزیہ کر کے اسے پھر راہِ راست پر ڈال دیتے ہیں۔ اگر لوگ زیادہ بولنے

لگیں تو کسی موقع پر یکایک مولانا اٹھیں گے اور مسکرا کر کہیں گے۔ "اچھا، حضرات! آپ بحث جاری رکھیے، میں ذرا ڈبیہ بٹوا لے آؤں۔" اس پر اکثر چہرے مسکرا اٹھتے ہیں اور لطیف ترین انداز کی اس "تنبیہ" کو سمجھ کر بحثیلے پن کا از خود سدّباب کر لیتے ہیں۔ مولانا مودودی نہ تو اس دوران میں اپنی رائے کو سامنے لاتے ہیں اور نہ کبھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ پہلے سے وہ کوئی چیز طے کیے بیٹھے ہیں جسے منوانا چاہتے ہیں۔ واقعی صورت ہوتی بھی یہی ہے کہ وہ دوسروں کی بحث سے بہت کچھ اخذ کر کے وہیں کے وہیں اپنی رائے کو آخری شکل دیتے ہیں۔ اپنے منصب کے زور سے انھوں نے کبھی کسی بات کو نہ پیش کیا ہے، نہ منوایا ہے۔ وہ اگر کوئی نقطۂ نظر رکھتے ہوں تو وہ بحث کے بعد کسی موقع پر دل نشین انداز میں دلائل و وجوہ کے ساتھ اسے پیش کر دیتے ہیں۔ پھر کچھ وہ اپنے رفقائے شوریٰ سے اخذ کرتے ہیں اور کچھ ان کا نقطۂ نظر قبول کیا جاتا ہے۔ اس طرح لین دین سے متفقہ فیصلے طے پاتے ہیں۔ دو یا تین اختلافی رجحانات کے درمیان جب بحث بہت طول کھینچ جاتی ہے، تو مولانا مودودی ان کے مابین نقطۂ اعتدال پیدا کر کے اس خوش اسلوبی سے پیش کرتے ہیں کہ بحث کا طوفان چھٹ چھٹا جاتا ہے۔ شوریٰ کی تاریخ میں گنتی کے مواقع ایسے آئے ہیں جن پر رائے شماری سے فیصلہ ہوا ہو، ورنہ عمومی معمول، بلکہ روایت یہ ہے کہ باہمی افہام و تفہیم کے بعد اتفاقِ رائے اور اطمینانِ قلب و ذہن کے ساتھ ہی معاملات طے پاتے ہیں۔ مجلسِ شوریٰ میں مولانا مودودی کا ایک اہم پارٹ یہ رہتا ہے کہ جب بھی بحث کی فضا بوجھل ہونے لگتی ہے، تو وہ ایک تبسّم انگیز فقرے سے اس کو ہلکا پھلکا بنا دیتے ہیں۔ یہ حقیقت باہر کے لوگوں کو معلوم نہیں ہوگی کہ ہمارے ہاں اگرچہ تمام مسائل پر ارکانِ شوریٰ باہم بھی اور امیرِ جماعت سے بھی گفت گوئیں کرتے رہتے ہیں، لیکن "ایوان" کے باہر نہ امیر کی طرف سے یہ کوشش کی جاتی ہے کہ وہ پہلے سے اپنے ہم خیال تیار کر کے لائے اور نہ ارکانِ شوریٰ علیحدگی میں امیر کو متاثر کرنے کی کوشش کرتے ہیں، بلکہ یہ سارا کام ایوان کے اندر ہی ہوتا ہے۔ اس سبب سے نہ گروہ بندی پیدا ہوتی ہے، نہ سازشیں! —— اور ہر فرد یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ تمام کارروائی میں برابر کا حصّہ دار ہے اور اس کی رائے

ویسی ہی قیمتی اور اس کا استدلال ویسا ہی اہم ہے جیسے کسی اور کا، اور خود امیر کا!

ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص میرے مطالعۂ شخصیّت میں اچھّے ہی اچھّے پہلو دیکھ کر مجھ پر قصیدہ گوئی کا الزام رکھّے۔ میں کسی کو روک نہیں سکتا، مگر اتنا حسنِ ظن اپنے آپ سے ضرور رکھتا ہوں کہ قصیدہ گوئی کے لیے میرا مزاج بنایا ہی نہیں گیا، مگر دوسری طرف میرا مزاج یہ بھی نہیں ہے کہ خواہ مخواہ کا تکلّف کرکے کچھ ٹیڑھ کسی کے اندر نکالوں۔ مودودی صاحب کی شخصیّت کا مجموعی ڈھانچہ بہت ہی صاف ستھرا اور نفیس ہے اور اس میں کوئی بنیادی اور اہم قسم کی کوتاہی یا فساد موجود نہیں ہے۔ یوں وہ انسان ہیں، رائے قائم کرنے، فیصلے دینے، معاملات کو سمجھنے اور تدابیر اختیار کرنے میں غلطیاں کرتے ہیں۔ ہم سب ایسی غلطیوں پر ان سے بحث بھی کرتے ہیں اور اگر ہمارے دلائل مضبوط ہوں تو مولانا مودودی قائل ہوکر تبدیلی بھی قبول کرتے ہیں۔ لیکن جہاں تک ان کے اخلاق و کردار کی ساخت کا تعلق ہے اس میں کوئی رخنہ تلاش کرنے میں ناکامی ہوتی ہے۔ کمزوریاں ان میں ہوں گی، مگر آخر تحریک کی بھٹی میں پڑکر اپنے رفقار کے ساتھ ساتھ خود مودودی صاحب بھی تو بنے ہیں۔ اور وہ تو ہم سب سے پہلے (۳۲ - ۱۹۳۰ء میں) اپنی اس سُلگائی ہوئی بھٹی میں از خود پڑے تھے اور اس میں تپتے ہوئے ان کو آج ۲۵، ۲۶ سال ہوچکے ہیں ——— میں اپنے ضمیر کے سامنے بہر حال مطمئن ہوں کہ میں نے عقیدت مندی کے رنگ سے نہیں، بلکہ یہ تصویر واقعیّت اور حقیقت کے رنگ سے مرتّب کی ہے ——— اور اتنی اچھی تصویر سامنے ہونے کے باوجود میں کہتا ہوں کہ مودودی ہرگز کوئی فرشتہ نہیں، وہ معصوم نہیں، وہ انسان ہیں اور غلطیاں، کوتاہیاں اور کمزوریاں رکھنے والا انسان ہے۔

اہلِ دل و نظر ہر چند کہ خلوت پسند بھی ہوتے ہیں، مگر جلوت بھی ان پر لازم ہوجاتی ہے۔ وہ ایک طرف بے ہمہ بھی ہوتے ہیں، دوسری طرف با ہمہ بھی۔ ایک قدم باطن کے غارِ حرا میں، دوسرے ظاہر کے کوہِ صفا پر، آگے کا اشارہ ہو تو وادیٔ قبا بھی ہے، اور اس سے آگے مرحلۂ کدا بھی! (مکّہ کا ایک میدانی حصّہ جہاں فتح مکّہ کے وقت ایک جھڑپ ہوئی)

آج کے دور میں دنیا بھر کے مسلم معاشروں کی نوجوان قوّتیں اسلامی انقلاب کے

عَلَم ہائے تحریک اٹھائے اگر صف در صف موجوں کی طرح اُمڈ رہی ہیں تو اس میں ایک بڑا حصّہ اس خادمِ ملّت سیّد کا بھی ہے جسے لوگوں نے جتنا گھٹانا چاہا اتنا ہی بڑھتا گیا۔

اس کا حوصلہ دیکھیے کہ برسوں کی دل ہلا دینے والی تحریروں کے پھیلے ہوئے دائرۂ اثر کو دیکھ کر جب پکارا کہ لوگو! آؤ دھارے کے ہلاکت انگیز رُخ کو بدل ڈالیں تو ۱۹۳۸ء میں صرف ۵ آدمی لبیک کہنے والے تھے۔ پھر اس نے ۱۹۴۱ء میں دعوت دی تو ۷۵ افراد آگے بڑھے، اور اس نے ۷۵ افراد کے ایک مختصر دستے کو لیکر طاغوتی قوتوں سے جہاد شروع کر دیا اور آج پاکستان میں لاکھوں اور پاکستان سے باہر کروڑوں افراد اس کی ایک ایک نگاہ کے ساتھ گردش کرتے ہیں۔

عشقِ بلاخیز کے قافلۂ سخت جاں کا یہ سیّد پیش رو ہے مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ جو اہلِ تصوّف کے مشہور خانوادے "چشت" کے چمنستان کا ایک پھول ہے!

مولانا مودودی نے اسلام کے بنیادی حقائق اور اس کے نظامِ دستور و تہذیب کے ہر پہلو کو واضح کرنے کے لیے عظیم الشان تصنیفی و تحقیقی کام کیا۔ جو ہزاروں صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس کے لیے تنہا نشینی لازم تھی، مگر انھوں نے انسانوں کو چھوڑ کر اپنے آپ کو پوری طرح کتابوں کے حوالے کرنے سے انکار کیا۔

بلاشبہ ہزاروں آدمی ان سے ملے ہوں گے اور لاکھوں افراد نے ان کی تقاریر سُنی ہوں گی، بے شمار جماعتی شوراؤں اور مشاورتوں میں انھوں نے شرکت کی ہوگی مگران رابطوں کے باوجود ایک کمی ایسی رہ جاتی ہے جس کے لیے محفل آرائی ضروری ہوتی کوئی نہ کوئی نشست ایسی بھی ہونی چاہیے جس میں ایجنڈے کے بغیر باتیں ہوں، ہر درجے کا ہر شخص اپنی بات کہہ سکے اور ہر طرح کے موضوعات پر قدرے ہلکی پھلکی گفتگو ہو سکے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ساتھ اس طرح کی محفل آرائی کرتے تھے، ایسی مجالس میں نو وارد بھی آتے، منافقین بھی ہوتے اور کبھی یہودی بھی پہنچ جاتے، کتنی ہی شکایتیں اور کتنی ہی حکایتیں لوگ بیان کرتے اور کتنی ہی عنایتیں ہو جاتیں۔ بعد میں ائمہ وعلماء کے گرد لوگوں کو ہم جمع ہوتے دیکھتے ہیں۔ قریبی دور میں

نظر ڈالیے تو حکیم اجمل خاں، مولانا ظفر علی خاں، مولانا محمد علی جوہر، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کے گرد محفلیں جمع ہو جاتیں۔ ڈاکٹر اقبال کا معاملہ تو عجب تھا، ایک مجلسِ مسلسل جاری رہتی بوڑھے اور نوجوان، علماء اور عامی، جدید اور قدیم، ملکی اور غیر ملکی سب طرح کے لوگ آرہے ہیں اور جارہے ہیں۔ علی بخش چلم تیار کرتا رہتا ہے اور اقبال اپنے ملنے والوں کی ضرورت کے مطابق ایک موضوع سے دوسرے موضوع کی طرف اور پھر تیسرے اور چوتھے مبحث کی طرف جارہے ہیں۔ فلسفے کی باتیں، دین کی باتیں، شاعری کی باتیں، لطیفے، شہر کے قصّے، کھانوں کا تذکرہ، بیماریوں اور دواؤں کا قصّہ۔ غرضیکہ ان محفلوں کی گفتگو ایک گلدستۂ گل و گلاب ہوتی۔

مولانا مودودی جب دارالاسلام (پٹھان کوٹ) میں آکر مقیم ہوئے تو وہاں شام کی محفل کا سلسلہ چلا۔ عصر کے بعد درسِ حدیث ہوتا اور مغرب کے بعد مجلسِ عام!

اس مجلس کے مستقل شرکاء تو مقیمینِ دارالاسلام ہوتے ــــــ صدرالدین اصلاحی عبدالجبّار غازی (مرحوم) روسی ترکستان کے مہاجر، اعظم ہاشمی (مرحوم) حافظ عطاء الرحمٰن (مرحوم)، سیّد عبدالعزیز شرقی صاحب، چراغ دین صاحب، راجہ احسان الحق صاحب، مولانا عظمت اللہ صاحب، نقی علی صاحب مرحوم، ملک غلام علی صاحب، محمد یحییٰ صاحب مرحوم، محمد حامد صاحب، میاں طفیل محمد صاحب، سیّد مراد علی شاہ صاحب، اور بعد میں امین احسن اصلاحی صاحب بھی آگئے اور پھر تربیت و تفہیم کے لیے عارضی قیام کرنے والے مہمان، جیسے سیّد صبغۃ اللہ بختیاری، جنوبی ہند کے محمد علی صاحب، ولتنا کیم کے شیخ محمد عبداللہ صاحب مرحوم، نجات اللہ صدّیقی صاحب، ابوالعرفان (مرحوم) بھی باعثِ رونق ہوتے۔ مزید برآں ایک دو دن کے لیے آنے والے مہمان ہوتے جن کی فہرست بیان کرنا مشکل ہے۔ مولانا مسعود عالم ندوی آکر دو چار روز ٹھہرتے تو مجلس کی اہمیّت و دلچسپی بڑھ جاتی۔ کبھی ملک نصر اللہ خان عزیز، کبھی عبدالحمید صدّیقی، کبھی صفدر حسین صدّیقی، کبھی عبدالمجید قریشی چکر لگاتے۔ اسی طرح سردار اجمل لغاری اور امین لغاری، چودھری علی احمد خان

---

[1] [2] [3] [4] [5] [6] [7] [8] [9] [10] یہ سب حضرات وفات پا چکے ہیں۔ خدا مغفرت کرے۔

اور محمد باقر خاںؒ، چودھری محمد اکبرؒ (سیالکوٹ والے)، چودھری محمد اشرف خاں، خان سردار علی خاںؒ اور سردار محمد اکبرؒ (ڈھوک شرفا والے) بھی آتے۔ نقی نواب، محمد شفیع دہلوی عبدالوحید خاں اور ان کے برادر اکبر کا جانا بھی یاد ہے۔ ایک بار اےؒ۔ آر۔ صوفی صاحب ریلوے کے افسر تھے تو ان کا ریلوے سیلون سرنا اسٹیشن پر جا کر رکا تھا، وہیں انھوں نے مع خاندان ایک آدھ دن قیام کیا۔ ایک دن غلام احمد پرویز جنھوں نے بعد میں سُنّت کی تشریعی حیثیت پر معرکہ چھیڑا، تشریف لے گئے۔ اسی طرح دارالاسلام کی محفلِ شام میں قادیانی مبلغین نے بھی ہم پر "تبلیغ" کی۔ جرمن نومسلم اسد صاحب، چودھری نیاز علی خاں مرحوم اور ان کے بھائی بھی کبھی کبھار اس محفل میں آتے (یہ دونوں حضرات بیشتر دن کو آیا کرتے تھے)

سارے نام ذہن میں یکایک تازہ ہو بھی نہیں رہے اور اس مقام پر سب کا اندراج ممکن بھی نہیں۔ اس محفل میں مرکزی موضوع تو مولانا کی پیش کردہ تحریکِ اقامتِ دین اور اس وقت کی حکومت اور سیاسی تحریکات .... سے عہدہ برآ ہونے کا ہوتا۔ پھر خود تصوّرِ اسلام اور نظامِ اسلامی کی روح اور صحیح اسلامی سوسائٹی کے خدوخال پر گفتگو ہوتی رہتی، نیز اس دعوت کو پھیلانے اور اس کے لیے مردانِ کار تیار کرنے سے متعلق مسائل چھِڑتے، لیکن باہر سے آنے والے مخالفین اپنے اعتراضات اٹھاتے، حامیان اپنی مشکلات بیان کرتے، کارکنان اپنی الجھنوں اور پیچیدگیوں کے حل جاننا چاہتے، کام کی کچھ نئی تجاویز و تدابیر زیرِ بحث آتیں اور ان امور پر سارے شرکائے محفل کچھ نہ کچھ حصّہ لیتے۔ مولانا بحیثیت داعئ اوّل اپنا نقطۂ نظر واضح کرتے۔ پھر کچھ باتیں متفرّق ہوتیں۔ مثلاً پٹھانکوٹ کا کوئی قصّہ، قریبی آبادی میں کسی جرم کی تفصیل، چودھری نیاز علی کے قلعے (قیام گاہ) کا کوئی تذکرہ، جنگِ عالمگیر کے تازہ احوال، پھر لطیفہ گوئی، قصّہ بیانی، اسلاف یا اکابرِ وقت کے واقعات کا ذکر، آبادی کے کسی مریض کے متعلّق گفتگو، گرانی، ارزانی کا بیان —— اور کیا کیا کچھ!

پھر عشاء کی نماز ہوتی، کھانا بھی کبھی اجتماعی ہوتا، کبھی تو عشاء کے بعد بھی محفل جاری رہتی غرضیکہ یہ محفل اچھا خاصا ایک تربیتی مدرسہ تھی۔ تفریح کی تفریح اور تفہیم کی تفہیم!

اب کئی سال سے ۵۔ اے ذیلدار پارک (مولانا کی اقامت گاہ) میں نمازِ عصر کے بعد محفل آرائی ہوتی ہے۔ حالات کے ساتھ ساتھ اس کا رنگ بھی بدل گیا ہے، مگر طرز وہی ہے نوجوان طلبہ اور نو وارد مہمان (مالی اور دماغی لحاظ سے مختلف سطحوں کے) جن میں کچھ مخالف بھی ہوتے ہیں، مولانا کے گرد جمع ہوتے جاتے ہیں اور جس کے سامنے جو بات ہوتی ہے وہ کہتا ہے اور جواب پا لیتا ہے۔ یہاں بھی موضوعات کی رنگا رنگی ہے۔ سیاسی حالات بھی سامنے آتے ہیں، دینی حقائق اور فقہی مسائل بھی اور سائنس و فلسفہ جیسے موضوعات بھی چھڑ جاتے ہیں اور کچھ عام قسم کی سرسری باتیں بھی۔ مولانا اب بھی لطیفہ گوئی کرتے ہیں اور نہیں تو کسی کی بات سن کر اس سے لطیفہ پیدا کر لیں گے جو حضرات مولانا کے حالات کو سمجھتے ہیں انھیں اندازہ ہے کہ اس وقت عمر و صحّت کے جس مرحلے سے مولانا گزر رہے ہیں اس میں یہ اللہ کا کرم ہے کہ وہ چند گھنٹے پڑھنے لکھنے کا کام کر لیتے ہیں۔ سیرت کی کتاب کی تکمیل ہو رہی ہے۔ اس کے بعد کچھ اور کام شروع ہو جائے گا۔ بیچ میں چھوٹے چھوٹے متفرّق کام بھی آ جاتے ہیں۔ ترجمان القرآن کے مواد پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ پڑھنا بھی ہوتا ہے، خاص رپورٹیں اور معلومات بھی اُن کے سامنے دنیا بھر سے آتی ہیں اور کچھ بین الاقوامی ملاقاتی اور کچھ پاکستان کے لوگ، جماعت کے لیڈر بھی اور بیرونی کارکن بھی مولانا سے خصوصی وقت لیتے ہیں۔ خط و کتابت کا دائرہ بھی وسیع ہے۔ اس حالت میں اگر ہر شخص مولانا کے کام یا آرام کے اوقات میں ملنے کی کوشش کرے تو ان کی صحت متأثر ہو گی یا کام متأثر ہو گا۔ سمجھ دار حضرات اختصار میں بات کرنے کے اہم مسئلوں کے استثنیٰ کے ساتھ، مولانا کے قیمتی وقت سے خواہ مخواہ حصّہ نہیں لیتے۔ محض شوقِ زیارت و ملاقات یا رسمی بات چیت کے لیے ان کا وقت لینے کے معنی یہ ہیں کہ دین و ملّت کے لیے دعوت کے جو برگ و بار ان کے دماغ .... سے حاصل ہو رہے ہیں ان میں کمی ہو جائے۔ وہ جس کام میں مصروف ہوتے ہیں وہ ہمارا ہی کام ہوتا ہے اور ہمارے ہی لیے ہوتا ہے۔ ہر شخص اگر اس طرح کرے تو کام بھی ٹھپ اور صحت کی کشتی بھی گرداب میں! پس ذی شعور حضرات عصر کی محفلِ عام میں شرکت ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ کچھ وہ لوگ بھی ہوتے ہیں جو

مولانا کو دیکھنا چاہتے ہیں یا فیضِ نگاہ کے طالب ہوتے ہیں، ان کا مقصد بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ اور کچھ اپنی بات بھی کہنا چاہتے ہیں یا مولانا سے چند کلمات سننا چاہتے ہیں یا دعا کرانا چاہتے ہیں، ان کا مدّعا بھی پورا ہو جاتا ہے۔ میرا اپنا یہ حال ہے کہ قربتِ دیرینہ اور ربطِ مستقل رکھنے اور قریب رہنے کے باوجود خصوصی وقت (وہ بھی چند لمحات کسی ضروری کام کے لیے) دس دس پندرہ پندرہ دن بعد ہی لیتا ہوں۔

مجھے اِس بات کی بڑی مسرّت ہے چوہتّر سال[1] کے ایک بزرگ جواں ہمّت کے گرد زیادہ تر نوجوانوں کا ہجوم ہوتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک تو پاکستان میں اٹھنے والی پہلی نسل "نوجوان بگاڑ" ہنگاموں کے باوجود دین کی محبت سے مالامال ہے۔ دوسرے یہ کہ "جنریشن گیپ" کا جو فتنہ انگیز تصوّرِ مغرب سے ہمارے معاشرے میں درآمد ہوا ہے وہ اسلام سے محبّت رکھنے والے ہمارے نوجوانوں کے ذہنوں کو زیروزبر کرنے میں ناکام رہا ہے۔ یہ تصوّر سیدھا قرآن کے معیارِ صداقت سے ٹکراتا ہے جس نے بیشتر انبیاء ــــــ خصوصًا نبیٔ آخر الزّماں صلی اللہ علیہ وسلم پر دعوت وقیادت کا بار چالیس سال کی عمر میں ڈالا، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دورِ قیادت چالیس سال سے ترسیٹھ سال تک پھیلا ہوا ہے۔

ایمان ــــــ اور خصوصًا شعوری ایمان ــــــ جن لوگوں میں کار فرما ہوتا ہے ان کا تصوّرِ شباب وشیب ہی بدل جاتا ہے۔ اہلِ ایمان میں جوان ہر وہ شخص ہے جو باطل کی قوتوں کے آگے جھکنے پر تیار نہ ہو، ــــــ جوان وہ ہے جو راستے کو مشکل یا طویل دیکھ کر کنّی نہ کاٹ جائے اور اپنے مقصد اور پروگرام ہی میں ردّوبدل نہ کر دے، جوان وہ ہے جو عمر اور صحت کے ہر مرحلے میں جتنی قوتِ کار سے جو کام راہِ حق میں لے سکتا ہو، عزیمت کے ساتھ اسے سرانجام دے۔ اس طرح بوڑھا ہر وہ شخص ہے جو طاغوت کا زور دیکھ کر خم کھا جائے۔ جو وقت کے غلط رجحانات کے دباؤ کو سہار نہ سکے اور ان کی رَو میں بہنے لگے اور جو مالی حالت، عمر، صحت یا کسی بھی طرح

[1] یہ حصّہ مضمون لکھتے وقت کی عمر ہے۔

کی مشکلات کے باعث جتنا اور جیسا کچھ حصّہ خدا کے دین کے لیے ادا کر سکتا ہو، اتنے سے بھی ہمّت ہار دے۔

یہ ہے معیارِ شیب وشباب ـــــــ خواہ کسی کی عمر کچھ ہی کیوں نہ ہو! کتنے ہی نوجوان ہیں جو درحقیقت بوڑھے ہیں اور کتنے ہی بوڑھے ہیں جو حقیقت میں جوان مجاہد ہیں۔ کتنے ہی صحت مند مریض اور کتنے مریض تندرست وتوانا ہیں، کتنے ہی دولت مند قلاّش اور کتنے ہی مفلس غنی ہیں۔ جسم کا بڑھاپا، جسم کی بیماری، جسم کی مجبوریاں الگ شئی ہیں۔ یہ تو انسان کا "ٹول باکس" ہے۔ ہتھیار کند یا شکستہ ہو سکتے ہیں۔ اصل سوال یہ ہے کہ انسان کی رُوح یا شخصیّت بوڑھی یا بیمار یا کند یا شکستہ یا مجبور ہوئی ہے یا نہیں روح توانا ہے تو جسم کی معذوریاں اس رعنائی وبرنائی میں فرق نہیں لا سکتیں ـــــ سو مبارک ہیں عمر کے وہ نوجوان، جو دل کے ایک "جوانِ توانا" سے نئی ایمانی ورُوحانی قوّت حاصل کرنے کے درپے ہیں۔ مولانا سے ماضی قریب ہی میں کسی نے کہا کہ اب تو آپ بوڑھے ہیں، مولانا نے تنک کر تردید کی کہ "میں بوڑھا ہرگز نہیں ہوں!" واہ، کیا بات کہی، اور کس انداز سے کہی!

بالعموم اس طرح کی عام محفلوں کی متفرق گفتگوؤں کا ریکارڈ نہیں رکھا جاتا کیوں کہ بہت سی باتیں وقتی حالات سے متعلق ہوتی ہیں اور بعد کے حالات میں ان کا صحیح مفہوم واضح نہیں ہوتا، لیکن مجھے مسرّت ہے کہ ریکارڈ رکھا جارہا ہے۔ بڑی تحسین کے مستحق ہیں اس محفل کا ریکارڈ رکھ کر اسے مرتّب کرنے، اور شائع کرنے والے نوجوان!

مودودی کی شخصیّت کا یہ مطالعہ وتجزیہ ختم کرتے ہوئے میں علی سفیان آفاقی کے چار لفظوں کو دہراتا ہوں کہ "مولانا مودودی کی زندگی اس اعتبار سے دلچسپ ہے کہ وہ ایک انسان کی زندگی ہے۔" (ابوالاعلیٰ مودودی) اور ان الفاظ ہی کی روشنی میں تعصب کی اُن دیواروں پر ماتم کرنا چاہتا ہوں جن کو لوگوں نے خود اپنے اور مودودی کے درمیان کھڑا کر رکھا ہے اور مخالفانہ پروپیگنڈہ کرنے والوں کو اذن دے رکھا ہے کہ ان دیواروں پر نت نیا پلستر لیپتے رہیں۔ مودودی صاحب سے جسے اختلاف ہو وہ اختلاف کرے

جو ان کے مذہبی تصوّر کو غلط سمجھتا ہو وہ اپنا کلامی اور فقہی نقطۂ نظر پورے زور سے سامنے لائے، اور جسے ان کے سیاسی پروگرام سے بُعد ہو وہ سیاسی دائرے میں ان کا پورا پورا مقابلہ کرے، مگر وہ اپنی نوعیّت کے "انسان" اور ایک تاریخی شخصیّت ہونے کے لحاظ سے ساری ملّت کی متاع ہیں، بلکہ انسانی دنیا کے بنیادی سرمایۂ شخصیّت و کردار کا ایک جزو! ——— اور ان کی ذات میں علم اور عمل کے کچھ نہ کچھ ایسے پہلو موجود ہیں جن میں سے ہر ایک کی ہمیں ضرورت ہے۔ انہی پہلوؤں تک رسائی حاصل کرنیکا راستہ نکالنے کے لیے ان کا مطالعۂ شخصیّت مفید ہے، ورنہ محض ایک شخص جس کا نام ——— ابوالاعلےٰ مودودی ہے کسی دوسرے سے قابلِ ترجیح نہیں ہے۔

(ماہنامہ "نقوش" شخصیّات نمبر، حصّہ دوم۔ اکتوبر ۱۹۵۶ء)

ایک انقلابی مُفکرؒ

"زمانہ با تو نہ سازد تو بازمانہ ستیز" کے الفاظ میں انسانی کردار کا جو آئیڈیل اقبالؒ نے پیش کیا تھا اسے واقعی انسانی پیکر میں دیکھنے کی تمنّائے بے تاب مدّت تک حسرتِ ناکام رہی اس مصرع کو ہزاروں نوجوانوں کی طرح میں نے بھی برسوں گنگنایا ہے، لیکن اپنے گردوپیش دنیا وہ دیکھی جس کے چیدہ اور ناموَرترین افراد کو "حدیثِ بے خبراں" پرکاربند پایا۔ بالآخر اقبال کا وہ آئیڈیل گوشت پوست کے ایک پیکر میں ملا جو تنِ تنہا اپنے فکروعمل کا سرمایہ لے کر میدان میں نکلتا ہے اور یہ عزم کرکے نکلتا ہے کہ کوئی میرے پیچھے آئے یا نہ آئے مجھے بہرحال ایک متعیّن نصب العین کی طرف ایک مقررہ راستے سے قدم بہ قدم بڑھتے جانا ہے اور پھر واقعی وہ پوری شانِ یکتائی کے ساتھ ترجمانُ القرآن کا ایک ٹمٹماتا دیا لیے ناسازگار حالات کی تاریکیوں میں مخالفتوں کے جھکڑوں میں، غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کے بگولوں میں کئی سال رواں دواں رہتا ہے، اپنی منزل کا سراغ خود لگاتا ہے، اپنا راستہ آپ بناتا ہے، اس راستے پر سنگِ میل خود نصب کرتا ہے، پھر اِکّا دُکّا مسافر رفیقِ راہ بنتے ہیں۔ ان سے وہ پہلے ہی قدم پر کہہ دیتا ہے کہ جسے میرے ساتھ چلنا ہو وہ پہلے سے منزل کی دوری، راستے کی صعوبت اور مہم کے مردآزما ہونے کا پورا پورا اندازہ کرکے چلے، جسے بھی پیشِ نظر مقصد کی سرزمین پر میرے ساتھ قدم رکھنا ہو وہ واپسی کی کشتیاں جلا کر آئے ، جو آگے کو قدم اُٹھائے وہ یہ طے کرکے اٹھائے کہ آگے بڑھا ہوا قدم واپس نہیں لیا جا سکتا، چنانچہ کچھ ساتھی چلتے ہیں، کچھ تھوڑی دور جا کر ہمت ہار دیتے ہیں، کچھ نئے ہم سفر آملتے ہیں، مگر وہ کٹنے والوں اور جڑنے والوں سے بے نیاز ہو کر اپنی ایک ہی دُھن میں، ایک ہی چال سے، ایک ہی رُخ پر گامزن رہتا ہے، آہستہ آہستہ ایک کارواں کا کارواں اس کے جِلو میں متحرک نظر آتا ہے۔ یہ شخص جو دنیا بھر پر چھائی ہوئی عالمگیر فکر اور مشرق و مغرب کے ایک ایک چپّے پر کوسِ لِمَنِ الملک بجانے

والی جہانی تہذیب کو چیلنج کرنے کے لیے ایک دن اس طرح بے یارو مددگار اور بے ذریعہ و وسیلہ آگے بڑھتا ہے، اور زمانے کی طاقتوں کو بالآخر مجبور کر دیتا ہے کہ وہ اس کی دعوت کو وزن دیں۔ یہی ہے مودودی! ——— بازمانہ ستیز، کی زندہ تصویر!!

آئیے اس کردار کو خود اس کے اپنے لفظوں میں پڑھیں۔ "ترجمان القرآن" کا ساتواں سال شروع ہونے پر اس کا جو اداریہ مارچ ۱۹۳۹ء میں لکھا گیا تھا۔ اس کا ایک حصّہ یہ ہے۔

"یہ تمنّائیں دل میں پال رہا ہوں اور چھ برس سے اپنے جسم کی ساری طاقتیں انھیں حاصل کرنے کے لیے خرچ کر رہا ہوں، مگر بدقسمتی سے اکیلا اور تنہا ہوں میری طاقت محدود ہے، وسائل مفقود ہیں، اور جو کچھ کرنا چاہتا ہوں وہ نہیں کر سکتا، ساتھ دینے والوں کو ڈھونڈتا پھرتا ہوں، مگر وہ کم یاب ہیں۔ کروڑوں مسلمانوں کی اس بستی میں اپنے آپ کو اجنبی اور غریب پاتا ہوں، جس جنون میں مبتلا ہوں اس کا مجنوں مجھے کہیں نہیں ملتا۔ برسوں سے جن لوگوں تک اپنے خیالات پہنچاتا رہا ہوں ان کے بھی جب قریب جاتا ہوں تو وہ مجھ سے دور نظر آتے ہیں۔ ان کی دُھن میری دُھن سے الگ، ان کی گرویدہ گری کے مرکز میرے مرکزِ گرویدگی سے جُدا، ان کی روح میری روح سے نا آشنا، ان کے کان میری زبان سے بے گانہ، یہ دنیا کوئی اور دنیا ہے جس سے میری فطرت مانوس نہیں، جو کچھ یہاں ہو رہا ہے اور جن نظریات، جن جذبات، جن اغراض و مقاصد اور جن اصولوں کی بنا پر ہو رہا ہے سب کے خلاف بغاوت کا علم بلند کرنے پر مجبور ہوں۔ میں اس کے اجزاء میں سے بعض کا باغی اور بعض کا حامی نہیں ہوں، بلکہ کُل کا باغی ہوں۔ میں ترمیم کا خواہشمند نہیں ہوں بلکہ موجودہ زندگی کی پوری عمارت کو توڑ ڈالنا چاہتا ہوں اور اس کی جگہ خالص اسلامی اصولوں پر دوسری عمارت بنانے کا خواہاں ہوں۔ اس کُلی و ہمہ گیر بغاوت میں کوئی مجھے اپنا ساتھی نہیں ملتا، ہر طرف مجھے جزوی باغی ہی ملتے ہیں جو اس بُت خانے کے کسی نہ کسی بُت سے کو لگائے بیٹھے ہیں، ہر ایک کا

مطالبہ یہ ہے کہ سب بتوں کو توڑ دو مگر میرے بُت کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھنا۔
ایسی حالت میں ناگزیر ہے کہ جزئی باغی کسی نہ کسی مرحلہ پر پہنچ کر مجھ سے الگ ہو جائیں میرا ساتھ صرف کلی باغی ہی دے سکتے ہیں اور وہ کم یاب ہیں جب تک وہ نہ ملیں، اپنے محدود وسائل اور اپنی محدود قوت سے محدود پیمانہ پر میں تنہا جو کچھ کر سکتا ہوں وہی کرتا رہوں گا۔"

میں کہتا ہوں کہ اگر ذہن و کردار کا مطالعہ کرنے والی کوئی مردم شناس نگاہ مودودی کے بارے میں اِن الفاظ کے سوا اور کوئی چیز نہ پائے تو محض اس ایک اقتباس سے اسکی شخصیّت کا مقام دریافت کیا جا سکتا ہے، اس کے کیرکٹر کی تصویر مرتب کی جا سکتی ہے۔ اس کی نفسیاتی ساخت کا تخمینہ تیار کیا جا سکتا ہے، اور اپنے دور کی تاریخ میں اس کا مرتبہ معلوم کیا جا سکتا ہے۔

مودودی ان لوگوں میں سے نہیں جو اپنے کسی نفسیاتی مرض کے زیرِ اثر اپنے لیے سب سے الگ ایک راستہ نکالتے ہیں، جن کا احساسِ کہتری یہ ردِّ عمل دکھاتا ہے کہ وہ بڑا بننے کے درپے رہتے ہیں، جن میں "خود امتیازی SELF IMPORTANCE کا ایک طوفان موجزن رہتا ہے اور وہ ان کو وقت اور معاشرے اور ماحول کے خلاف ضدّم ضدّا میں مبتلا کر دیتا ہے اور جو دوسروں پر اپنی "ذات"، کو ٹھونسنے کی مختلف تدبیریں اختیار کرتے رہتے ہیں، یا جو اپنے لیے شخصیّت گر PERSONALITY BUILDER بن کر ہر میدان میں تماشائے فردِ واحد ONE MAN SHOW دکھانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ بخلاف اس کے یہ شخص نفسیاتی لحاظ سے معیاری صحت و توازن کا ایک نایاب نمونہ ہے اور اس کا سارا جہاد ایک ایسے اصول آئیڈیل اور آئیڈیالوجی کے لیے ہے جس کے فکری و عملی تقاضوں کی کسوٹی اس نے اپنے ذہن کو کبھی قرار نہیں دیا، وہ اپنی ذات کی تعمیر میں نہیں تاریخ کی تعمیر میں مصروف ہے۔

مودودی کی شخصیّت پر قلم اٹھانے کا حق مجھے پہنچتا ہے، لیکن میرے لیے سب سے بڑی پیچیدگی یہ اندیشہ ہے کہ میں شخصیّت کے ساتھ گہری محبّت رکھنے والوں، اس سی

ہر طرح کا استفادہ کرنے والوں اور اس کی مشفقانہ رفاقت میں برسوں سے کام کرنے والوں میں سے ایک فرد ہوں، اس لیے اگر میں کچھ لکھوں گا تو چاہے وہ مبالغہ سے کتنا ہی پاک اور قصیدہ آرائی سے کتنا ہی بالاتر کیوں نہ ہو، اس پر "مریداں می پرانند" کا فقرہ بآسانی چست کیا جاسکتا ہے، مگر جب واقعہ یہ ہے کہ نہ یہاں کوئی "پیر" ہے جو "مریدوں" کی بے پَر کی اُڑائی ہوئی باتوں کے بل پر اُڑنے کا آرزو مند ہو، اور نہ کوئی مرید ہیں جو کسی بے بال و پَر "پیر" کو اڑانے کے درپے ہوں، تو سوچتا ہوں کہ آخر میں کیوں دین و ملّت، زبان و ادب اور تاریخ کی ایک ایسی خدمت انجام دینے سے باز رہوں جس کے بارے میں میں سمجھتا ہوں کہ اپنی استطاعت کی حد تک میں ادا کرسکتا ہوں۔ یہ شخص جو منبر سے دار تک کہ ہر مرحلے سے گزر گیا ہے اور جس کا نام لاکھوں افراد کی زبان پر ہے، لوگ اسے جاننا بھی چاہتے ہیں کہ یہ کون ہے، کیا ہے! اس سوال کا جواب اگر اسے جاننے والے ــــ قریب سے جاننے والے .... برسوں ساتھ رہ کر جاننے والے بھی نہ دیں گے، تو اور کون دے گا۔ لوگ اس کے متعلق متضاد باتیں سنتے ہیں۔ وہ اپنے وقت کا بے مثل مفکر ہے اور وہ ایک رجعت پسند مُلّا ہے! وہ موجودہ نظام کو بدل ڈالنے کے لیے زور کررہا ہے اور وہ جاگیرداروں کا حامی ہے! وہ اسلامی دستور چاہتا ہے اور ملک کا غدّار ہے! وہ امریکی ایڈ کا مخالف ہے اور وہ امریکہ سے خفیہ ایڈ حاصل کررہا ہے۔ ــــ ان متضاد باتوں کے درمیان لوگ "ککّے بکّے" ہوکر یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ پھر آخر اصل حقیقت کیا ہے! مان لینا چاہیے کہ مودودی صاحب جیسے افراد کے ساتھ ہمیشہ یہی ہوتا ہے، وہ سب سے زیادہ معروف ہوتے ہیں اور سب سے زیادہ نامعلوم! وہ سب سے زیادہ قریب بھی ہوتے ہیں اور سب سے زیادہ دور بھی! وہ سب سے بڑھ کر آشنا بھی ہوتے ہیں اور سب سے بڑھ کر اجنبی بھی! وہ انسانیت کے اوّل درجہ کے خادم ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ پرلے درجے کے مجرموں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ایسے افراد کو اس مظلومی سے پوری طرح تو بچایا جانہیں سکتا، تاہم ان کو جاننے پہچاننے والوں کا فرض ہوتا ہے کہ نہ جاننے والوں کو صحیح معلومات بہم پہنچائیں۔

میں ان سطور کو لکھتے وقت اس فتنہ سے پوری طرح خبردار ہوں جسے شخصیّت پرستی

کہا جاتا ہے، HERO-WORSHIP لیکن کوئی بھی شخص جو پورے شعور کے ساتھ ایک مرتبہ خدا پرستی اختیار کر لیتا ہے، وہ پھر کبھی کسی "پرستی" میں مبتلا نہیں ہوتا۔ میں نے اپنے جذباتِ عبودیّت کے لیے ایک ہی بارگاہ پالی ہے، اور اب اس پر میرا ایک سجدہ مجھے ہزاروں سجدوں سے نجات دلا دیتا ہے۔ دوسرے خود مولانا مودودی کی تعلیم و تربیت سے جو چیزیں ان کے ساتھیوں اور ان کے قدردانوں اور ان کے محبّت کرنے والوں میں نمایاں طور پر پیدا ہو جاتی ہیں ان میں سے ایک یہی ہے کہ شخصیّت[۱] پرستی کی پستی سے آدمی بسا بلند ہو جاتا ہے۔ تیسری اہم حقیقت یہ ہے کہ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو اقبالؒ کے پیغام کی روشنی میں اقدام کرتے کرتے مودودی تک آپہنچے ہیں اور جنھوں نے مودودی سے اوّلین تعارف ہوتے ہی محسوس کیا کہ شاید وہ "دگر دانائے راز" یہی ہو جس کے نمودار ہونے کی دلی حسرت[۲] اقبالؒ کے لبوں پر آخری گھڑیوں میں آئی اور جس کے لیے اس نے دعا کی تھی ؎

اگر می آید آں دانائے رازے
بدہ اورا نوائے دل گدازے
ضمیرِ اُمّتاں را می کند پاک
کلیمے یا حکیمے نے نوازے

۱؎ میں نے اور میری طرح کے بہت سے اور لوگوں نے مولانا مودودی کے مقابلے میں اپنے نظریات کی سرزمین کے ایک ایک چپّے پر دفاعی جنگ لڑی ہے اور ایسے ہی لوگوں کو خود مولانا مودودی نے ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ ہم لوگوں نے شعبدے اور کرامات دیکھ کر بعت نہیں کرلی، بلکہ جو کچھ مانا ہے عقل و استدلال کے معرکے لڑ کر مانا ہے، اور آئندہ بھی ہم سے جو کچھ بھی منوایا جا سکتا ہے اسی طرح منوایا جا سکتا ہے۔

۲؎ اقبالؒ جیسا حقیقت شناس آدمی تاریخ اور معاشرۂ انسانی کے قوانین کی روشنی میں خوب سمجھتا تھا کہ جن شعور کی شعاعیں میں نے ماحول میں بکھیر دی ہیں اور جن جذبات کو میں نے چھیڑ دیا ہے اب علمی میدان میں ایک تحریک کی شکل اختیار کیے بغیر نہیں رہ سکتے (باقی حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

اقبالؒ کا سرچشمۂ فکر سے پوری طرح سیراب ہو جانے کے بعد کوئی شخص مشکل ہی سے شخصیّت پرست ہو سکتا ہے!

میری دوسری مشکل یہ ہے کہ مولانا مودودی کی شخصیت پر مجھ جیسا قریبی آدمی اگر چند سرسری تاثرات دے کر رہ جائے، تو اس سے بڑی مایوسی ہوگی، لیکن اگر میں مطالعۂ شخصیّت کا حق ادا کرنا چاہوں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ جس شخص سے فکر و عمل کی کئی دنیائیں پے در پے ظہور پذیر ہو رہی ہوں، جس نے زندگی کے ہر مسئلے اور ہر موضوع پر بے شمار لٹریچر میدان میں ڈال دیا ہو، جس نے ایک ہمہ گیر تحریک تغیّر اُٹھا کھڑی کی ہو، اس کا مطالعہ کس گوشے سے کس طرح شروع کر کے کس پہلو پر جا کر کس طرح ختم کیا جائے۔ پھر اس کام کے لیے بڑا وقت چاہیئے جو مجھے میسّر نہیں۔ بہت سوچا، بہت سوچا آخر یہ ٹھانی کہ جس موقع پر جتنا کام ممکن ہو اتنا کر دینا چاہیئے اور بقیہ کو آئندہ کے لیے اٹھا رکھنا چاہیے۔ سو اب! ع

سامنے مہماں کے جو کچھ تھا میسّر رکھ دیا

بڑے آدمی

بڑے آدمی کون ہوتے ہیں؟ ان کی تعریف کیا ہے؟ اس سوال کے مختلف جواب سوچے جا سکتے ہیں، مگر تمام ممکن جوابات کا اگر کوئی جوہر نکالا جا سکتا ہے تو وہ یہ ہے کہ ہر وہ فردِ انسانی جو انسانیت کو خیال اور عمل کے کسی بھی دائرے میں اپنے پاس سے کچھ دے کے جاتا ہے، جو زندگی کو نئی ذہنی اور اخلاقی صلاحیّتوں سے

(باقی صفحہ گزشتہ کا) اور اس تحریک کے لیے کوئی نہ کوئی شخصیّت ایک پیغامِ انقلاب لے کے اٹھے گی۔ چنانچہ یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اقبالؒ مرحوم اپنے آخری ایّام میں نوجوان نسل کو پیشِ نظر نصب العین کیلیے تیار کرنے کی جو اسکیم رکھتے تھے اس کے لیے واحد رفیقِ کار جو انھوں نے منتخب کیا وہ مولانا مودودی تھے اقبالؒ ہی کے بلاوے پر مولانا پنجاب آئے، مگر اُدھر خود اقبالؒ کو عالمِ جاوید سے بلاوا آ پہنچا۔

آراستہ کرتا ہے، جو تاریخ کی شاہ راہ پر نئے نقوشِ قدم بناتا اور نئے چراغ روشن کرتا ہے' بڑے آدمیوں کی صف میں شامل ہے۔ جو لوگ دُوسروں سے فائدہ اُٹھاتے ہیں اور انسانیت کی کوئی خدمت انجام دینے کے بجائے اُلٹا اسے چرکے لگانے میں عمر گزار دیتے ہیں (اور ایسے لوگ مجرموں سے لے کر وزیروں، لیڈروں، صحافیوں اور ادیبوں تک کی صفوں میں پھیلے ہوئے ملتے ہیں) وہ بنیٔ نوعِ انسان کا سب سے ذلیل اور گھٹیا عنصر ہوتے ہیں۔ ان سے اوپر دوسرا عنصر آتا ہے جو جتنا فائدہ انسانی کارناموں سے اٹھاتا ہے اپنی صلاحیتّوں کی حد تک اس کے جواب میں زندگی کی قابلِ قدر خدمات سرانجام دینے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر وہ خال خال پائے جانے والے افراد ہمارے سامنے آتے ہیں جو جتنا کچھ لیتے ہیں اس سے کئی گنا زیادہ دے کے جاتے ہیں۔ اور وہ کچھ دے کے جاتے ہیں جو ہر آدمی کے پاس نہیں پایا جاتا۔ اُنہی کو ہم بڑے لوگ کہتے ہیں۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ مولانا مودودی کی شخصیّت کا ایک نمایاں مقام اسی آخری قسم کے خال خال پائے جانے والے افراد کی صف میں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بہت سے لوگوں کو مجھ سے اختلاف ہو، وہ اپنے اختلاف پر قائم رہ سکتے ہیں۔ میں اپنی رائے دوسروں سے منوانے کے لیے یہ سطور نہیں لکھ رہا، نہ میری زندگی کے مشن کا یہ کوئی جزُ ہے کہ میں مودودی کی عظمت دوسروں سے تسلیم کراؤں!

مودودی میرے نزدیک ویسے ہی گوشت پوست کا ایک متحرّک پیکر ہے جیسے پیکر اس کرۂ ارضی پر اربوں کی تعداد میں زندگی کی راہ پر رینگ رہے ہیں۔ میں اسے کوئی فوق الانسانی مخلوق نہیں سمجھتا، میں اسے ایک معصوم اور بے عیب ہستی نہیں مانتا، میں اسے تنقید سے بالاتر تسلیم نہیں کرتا، میں اسے یہ حق نہیں دیتا کہ وہ میری خودی کا خراج مجھ سے لے سکے۔ میں اس کے سامنے اختلافِ رائے کے فطری حق سے کبھی دست بردار نہیں ہو سکتا، میں اسے ایک بُت بنا کر پوجنے پر تیّار نہیں ہوں، بلکہ وہ میرے ذہن میں بُت بن کر رہنا چاہے، تو میں اسے ایک آن میں چور چور کر کے رکھ دُوں، البتّہ میں اس کا احترام کرتا ہوں، اس کی عزّت میرے دل میں ہے، میں اس سے محبّت رکھتا ہوں، کیونکہ

میں یہ سمجھتا ہوں کہ اُس کے پاس کچھ نہ کچھ ایسا ہے ...... بہت کچھ ایسا ہے ..... جو میرے پاس نہیں ہے، وہ میں نے اُس سے لیا ہے اور اُس سے لینا ہے، وہ مجھے کسی اور سے نہیں مل سکتا۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس کے پاس وہ کچھ ہے جو میرے ملک کو، میری قوم کو، میرے معاشرے کو، اور کرۂ ارضی پر بسنے والی میری محبوب انسانی برادری کو اس سے لینا ہے۔ بس یہی چیز ایک بڑے آدمی کی علامت ہوتی ہے، اور یہی چیز دوسروں کو مجبور کر دیتی ہے کہ اُسے بڑا آدمی مانیں۔ اور یہی چیز ہوتی ہے جس کے لیے بڑے آدمیوں کی زندگی کا مطالعہ کیا جاتا ہے، ان کی شخصیّتوں کو کُریدا جاتا ہے، ان کی تحریروں کو چھانا پھٹکا جاتا ہے، ان کے کارناموں کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ بڑے لوگوں سے ہماری کوئی دلچسپی ہے تو صرف یہ کہ کیا کیا استفادہ ہم ان سے کر سکتے ہیں، اُن کی سیرت اور ان کے کارنامۂ حیات میں ہمارے لیے کیا ہے، زندگی کے لیے کیا ہے؟ وہ ہمارے امن و مسرّت کے خزانہ میں کیا دے سکتے ہیں، وہ ہماری ترقی میں کیا مدد بہم پہنچاتے ہیں، وہ ہماری قوتوں میں کون سا اضافہ کرتے ہیں۔ اس مدّعا سے ہٹ کر محض اکابر پرستی HERO-WORSHIP کے گھٹیا ذوق کی تسکین میں جا پڑنا دنیا کے فضول ترین کاموں میں سے ہے۔

البتّہ صاف بات یہ ہے کہ میں کسی کی غلط فہمی کے اندیشے سے مودودی کے متعلّق اپنے گہرے اور حقیقی تصوّرات کو مصنوعی جھوٹے انکسار کے خراد پر چھیل کر پیش نہیں کر سکتا۔

اُس شخصیّت کا عُنوان

مودودی کی شخصیّت کو اگر ہم کوئی عنوان دینا چاہیں، تو اس میں بڑی مشکل پیش آتی ہے، وہ بیک وقت ایک اونچا مصنّف، ایک ادیب، ایک عالمِ دین، ایک ماہرِ تنظیم، ایک انقلاب پسند داعی، اور ایک سیاسی لیڈر ہے، تاہم میری ذاتی رائے یہ ہے کہ ہم اُسے ایک انقلابی مفکّر REVOLUTIONARY THINKER قرار دے کر اس کی خدمات کے بہت سارے پہلوؤں کو ایک عنوان کے تحت جمع کر سکتے ہیں۔

تھوڑا بہت سوچتا ہر انسان ہے، مگر ہر سوچنے والے کو مفکر نہیں کہہ سکتے، مصنف ہمارے اندر بے شمار ہیں، مگر ہر مصنف کو ہم مفکرانہ بلندی پر نہیں رکھ سکتے۔ لیڈروں کی ہمارے درمیان کمی نہیں، مگر ہر لیڈر کے ذہن سے کسی جامع فکر کے جھرنے نہیں پھوٹتے۔ کسی دور اور کسی ملک و قوم کے حالات میں مفکرانہ عظمت تک صرف وہ لوگ پہنچ سکتے ہیں جو سوچنے کی عامیانہ اور پٹی ہوئی راہوں کی غلامی سے آزاد ہو کر ایک خاص اصولی و مقصدی نقطۂ آغاز سے چلتے ہیں، اور اپنی سمتِ سفر اپنے اصول و مقصد کے کمپاس کے ذریعے متعین کر کے سوچنے کی نئی راہیں کھول دیتے ہیں۔ بنے ہوئے حالات کے فریم میں اپنے ذہن کو نصب رکھ کر ہر آدمی سوچتا ہے، لیکن یہ سوچنا سوسائٹی اور انسانیت کو کچھ نہیں دے سکتا۔ بنے ہوئے حالات کے فریم کو توڑ کر ان حالات کا ناقدانہ جائزہ کسی خاص درجے کی ذہنی بلندی سے لیتے ہوئے سوچنا وہ سوچنا ہوتا ہے جو فکر و عمل کی نئی دنیائیں بنا کے انسانیت کے سامنے رکھتا ہے، اور یہی سوچنا ہے جو کسی سوچنے والے کو مفکرانہ مقام پر لا کھڑا کرتا ہے۔ مولانا مودودی ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جنھوں نے بنے بنائے حالات کے اندر اپنے آپ کو رکھ کر سوچا ہو اور یہ سوچا ہو کہ ان حالات میں بہتر سے بہتر جگہ کیسے بنائی جا سکتی ہے۔ وہ ان لوگوں میں نہیں ہیں جو ماحول کے سکّہ بند قدری پیمانوں، خیر و شر کے تقسیم کے معیاروں اور فکر و نظر کے زاویوں پر اندھا ایمان لا کر اپنی ذہنی قوّت کو حرکت میں لاتے ہیں، اور اپنے سارے کارنامے اس اہتمام سے سرانجام دیتے ہیں کہ وہ ان پیمانوں، معیاروں اور زاویوں کے لحاظ سے قابلِ قدر ٹھہریں۔ مولانا مودودی اپنے ماحول، اپنے معاشرے اور اپنے گرد چھائے ہوئے حالات کے فکری قفس کا، اس کی تیلیوں کا اور اس کے اندر پھڑپھڑانے والے طیورِ پرشکستہ کا جائزہ لیتے ہیں۔ ان کا آزادانہ فکر ایک بجلی بن کر اس قفس کو پھونک ڈالنے کے لیے چمکتا ہے۔ ان کا فکر طیورِ پرشکستہ کو نئے بال و پر دینا چاہتا ہے وہ قفس کی جگہ ایک نیا شاداب چمن آراستہ کر دینا چاہتا ہے۔ مولانا مودودی ماحول کے سکّہ بند پیمانوں، تاریخ کے مُہر کردہ معیاروں اور معاشرہ کے بنائے ہوئے فرسودہ زاویوں پر ایمان لانے سے انکار کر کے سوچتے ہیں۔ وہ ان کے بالمقابل دوسرے پیمانے، دوسرے

معیار اور دوسرے زاویے رائج کرنے کے لیے سوچتے ہیں۔ اس طرح جب کبھی کوئی شخص بنی بنائی دنیا کو قبول کرنے سے انکار کر کے ایک نئی دنیا کا نقشہ سوچنے لگ جاتا ہے، تو اسے ہم انقلابی مفکّر قرار دیتے ہیں۔

مربوط اور جامع فکر

مولانا مودودی کا مفکّرانہ کارنامہ کیا ہے ؟

زندگی کے مختلف اجزار کو الگ الگ رکھتے ہوئے، ان میں سے کسی ایک یا دو چار کے متعلق ہر ذہین آدمی سوچتا ہے اور بڑے کام کی باتیں سوچ لیتا ہے جن سے زندگی مستفید ہوتی ہے۔ بے شمار جج، وکلار، صحافی، شعرار، ادیب، مصنّف، اساتذہ، فلسفی اور لیڈر ہر معاشرے میں اسی طرح کی فکری خدمات انجام دے کر اس کے لیے ذریعۂ ترقی بنتے رہتے ہیں، لیکن زندگی کو ایک کُل کی حیثیت سے سامنے رکھ کر سوچنا، اس کے تمام اجزار کو مربوط صورت میں اکائی قرار دیکر سوچنا، اس کے ہر پہلو کو اس شعور سے سوچنا کہ یہ دوسرے پہلوؤں پر اثر ڈال کر اور اُن سے اثر لے کر کام کر رہا ہے یہ ہر ذہین آدمی کا کام نہیں ہوتا۔ اس کارنامے کے لیے بڑی ہمہ گیر نگاہ درکار ہوتی ہے۔ اس کے لیے زندگی کی وسعتوں کا احاطہ کر لینے والا ذہن مطلوب ہوتا ہے، اس کے لیے آدمی کے علم کا پٹیا سمندر کا سا ہونا چاہیے۔ مولانا مودودی کی خصوصیّت یہی ہے کہ وہ زندگی کے کسی ایک مسئلے اور کسی ایک پہلو پر محدودیّتِ نظر کے ساتھ غور نہیں کرتے، بلکہ وہ کسی جُزئی مسئلے پر بھی لکھتے یا بولتے ہیں، تو اُسے ہمیشہ کُل کے اندر رکھ کر سوچتے ہیں۔ انسانی زندگی کی ایک جامع اسکیم کا فریم ان کے پاس ہے جس میں کسی مسئلے کی ٹھیک جگہ متعین کرنے کے بعد ہی وہ اظہارِ رائے کرتے ہیں۔ انھیں کہیں بھی جزئی مسائل کی فکر نہیں ہوتی، ہمیشہ اپنی جامع اسکیم کے فریم کی سلامتی کا وہ خیال رکھتے ہیں۔ متفرق چیزوں پر سوچنا اور متفرق خیالات دے جانا کوئی بڑا کارنامہ نہیں ہو سکتا۔ بڑا کارنامہ ہمیشہ ایسے سوچنے والوں کا ہوتا ہے جو نظریۂ و فکر کا ایک ننّھا بیج لیتے ہیں، اس سے ایک کونپل پھوٹتی ہے، وہ

تنا بنتی ہے، تنے سے شاخیں نمودار ہوتی ہیں، شاخوں سے پتّے، پھول اور پھل ظہور پانے لگتے ہیں۔ یوں وہ ہتھیلی پر جو باغ کا باغ "جما" لیتے ہیں اس کی کسی چھوٹی سے چھوٹی کونپل اور کسی حقیر سی پتی پر بھی آپ ان کے خیالات کو دیکھیں تو اندازہ ہو گا کہ وہ اپنے سارے باغ کو سامنے رکھ کر اس کونپل اور اس پتی پر رائے ظاہر کرتے ہیں۔ دوسرے لوگ وہ ہوتے ہیں جو کہیں سے کوئی ٹہنی توڑ لاتے ہیں، کہیں سے کچھ پتیاں اکٹھی کر لیتے ہیں، کہیں سے دو چار پھول حاصل کر لیتے ہیں اور ان سب کو اکٹھا کر کے ایک فکری گلدان میں سجا دیتے ہیں۔ ٹہنی سَرو کی ہے تو پتیاں سرس کی اور پھول نرگس کے! اب وہ اپنے گلدستہ کے ایک ایک جزء پر خیالات ..... اور قیمتی خیالات ..... کا بڑا قیمتی یادگاری سرمایہ چھوڑ جائیں گے، مگر زندگی کوئی گلدستہ تو ہے نہیں، زندگی تو ایک مربوط شے ہے، وہ جڑ سے لے کر کونپل تک ایک ہی مجموعی وجود رکھتی ہے۔ اسے بدلو گے، تو پورا بدلو گے، قائم رکھو گے، تو مجموعی طور پر قائم رکھو گے۔ کسی درخت کی جڑیں، کسی کا تنا، کسی کی شاخیں کسی کے پھول پتے جمع کر کے تم زندگی کا ایک نیا درخت نہیں اُگا سکتے۔ نیا درخت تو ہمیشہ کسی نئے نظریے سے اُگے گا جو اپنا سب کچھ اپنے ساتھ لے کر آئے گا۔ ٹھیک اسی طرح مودودی کی فکر ایک نظریہ سے اُگ کر اپنے تنے پر کھڑے ہونے والے، اپنی شاخیں اپنے اندر سے نکالنے والے، اپنی کونپلیں اور پھل پھول اپنے فطری تقاضوں کے مطابق خود بہم پہنچانے والے اور اپنی ہی جڑوں سے غذا حاصل کرنے والے ایک مکمّل درخت کی سی ہے۔ درخت! ..... زندگی کا درخت! .... اسلامی زندگی کا درخت!!!

مودودی کے وسیع لٹریچر کے مطالعہ کو نکلیے تو آدمی حیرت میں ڈوبا رہ جاتا ہے کہ ایک آدمی، اتنا زیادہ مصروف آدمی، پچاس کی عمر میں اتنا ٹھوس، علمی اور معیاری لٹریچر اسلام کے بارے میں ایک انسائیکلو پیڈیائی علم کا مظہر ہے، مگر صرف لٹریچر کی وسعت اور ضخامت ہی حیران کن نہیں، اور زیادہ تعجّب میں ڈالنے والا وہ غیر معمولی تنوّع ہے جو بحث د فکر کے موضوعات میں پایا جاتا ہے۔ عقائد اور نظریاتِ اخلاق اور سیرت، قانون اور دستور سیاست اور معیشت، معاشرے اور تمدّن، تاریخ اور فلسفۂ تاریخ، نظامِ تعلیم اور کلچر،

ادب اور آرٹ، فقہ اور قضا، سرمایہ داری اور اشتراکیت، تھیا کریسی اور سیکولر ڈیموکریسی، نیشنلزم، سود اور بنکنگ، مالیات اور تجارت اور سیاست کے وقتی مسائل اور دوسرے بے شمار موضوعات پر معلومات بلکہ ان کے ساتھ اجتہادی نقطۂ نظر، اجتہادی نقطۂ نظر کے ساتھ ساتھ ایک جذبۂ انقلابیت، پڑھنے والوں کو مودودی کے ہاں سے ملتا ہے۔ سب سے بڑا کمال یہ کہ زندگی کے مختلف شعبوں، پہلوؤں، موضوعات اور مسئلوں پر ہزاروں صفحات کا یہ لٹریچر جس فکر کو سامنے لاتا ہے وہ ایک ہی نظریے کے سرچشمے سے ظہور پاتی ہے۔ تمام کی تمام متفرق بحثیں ایک ہی جڑ سے پھوٹتی ہیں، ایک ہی مقصد ہر جگہ بول رہا ہے، ایک ہی آئیڈیالوجی کی روشنی ہر جگہ پھیلتی نظر آتی ہے۔ اس کے دفتر کا شیرازہ ایک ہی طرزِ فکر نے باندھ رکھا ہے۔ یہ ہے وہ وجہِ عظمت جس نے مودودی کو ایک امتیازی درجے کا مفکر بنا دیا ہے میں نہیں جانتا کہ اس طرز کا کوئی "مفکر" ہمارے ہاں شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے بعد سے اب تک پیدا ہوا ہے۔ ہمارے دور کا یہ "مفکر" پوری کائنات کو ایک منظم واحد ادارے کی حیثیت سے دیکھتا ہے اور اس کے اندر فطرتِ انسانی کی ایک ایسی جگہ تجویز کرتا ہے کہ کائناتی کُل کے ساتھ بالکل ہم آہنگ رہے، پھر انسان کی پوری کی پوری نوعی تاریخ کو وہ بسا اوقات سوچتے وقت اس طرح سامنے رکھ لیتا ہے جس طرح جغرافیہ کا ایک معلّم کرۂ ارضی کے ماڈل کو اپنی میز پر رکھ لیتا ہے۔ اس ہزار سالہ تاریخ کے کسی بھی دور کو وہ باقی سارے ادوار سے مربوط رکھ کر زیرِ غور لاتا ہے، پھر اس دَور کے اندر اگر کسی ملک، قوم اور معاشرے کو دیکھتا دکھاتا ہے، تو دور کی پوری بیک گراونڈ کے ساتھ، وہ اجتماعی زندگی کے جس مسئلے کو لے گا تو اس کے پورے مسئلے میں لے گا۔ آدم تا ایں دم وہ حقیقت کو ایک ہی پاتا ہے۔ اس کا ظرفِ مکان اور ظرفِ زمان دونوں بہت ہی وسیع ہیں، مگر نہ اتنے کہ وہ ایک تخیّلاتی آفاقیت میں کھو کر رہ جائے۔ وہ عملی آدمی ہے اس لیے وہ جہاں ایک طرف وسعتِ نظر اتنی زیادہ رکھتا ہے، وہاں دوسری طرف توجّہ کو جس پوائنٹ پہ چاہتا ہے پوری طرح مرتکز FOCUS: کر کے قائم کرتا ہے۔ آئیے ہم اس کے جامعانہ زاویۂ نگاہ کو اس کی اپنی دو ایک عبارتوں میں سے خود اخذ کریں:

"کائنات علیحدہ علیحدہ مستقل الوجود اجزار پر مشتمل نہیں، بلکہ وہ ایک کُل ہے جس کے تمام اجزار ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں۔ زمین کا ایک ذرّہ مرّیخ و عطارد کے ذرّات سے ویسا ہی تعلق رکھتا ہے جیسا میرے سر کا ایک بال میرے ہاتھ کے رونگٹے سے رکھتا ہے۔ گویا پوری کائنات جسد واحد ہے اور اس کے اجزار میں باہم ویسا ہی ربط ہے جیسا ایک جسم کے اجزار میں ہوتا ہے۔ پھر جس طرح کائنات کے اجزار میں ربط اور تسلسل ہے اسی طرح ان واقعات میں بھی ربط اور تسلسل ہے جو اس کائنات میں پیش آتے ہیں، دنیا کا کوئی چھوٹا یا بڑا واقعہ بجائے خود ایک مستقل واقعہ نہیں ہے بلکہ وہ تمام کائنات کے سلسلۂ واقعات کی ایک کڑی ہے۔ اور اس کُلّی مصلحت کے تحت صادر ہوتا ہے کہ جس کو پیش رکھ کر خداوندِ عالم اپنی اس غیر محدود سلطنت کو چلا رہا ہے۔"

(تفہیمات حصّہ اوّل: مضمون "کوتاہ نظری" ص ۱۴)

"آپ دیکھیں گے کہ سارا عالم اور اس کا ایک ایک ذرّہ ایک زبردست نظام میں جکڑا ہوا ہے۔ اور ایک قانون ہے جس پر خاک کے ایک ذرہ سے لے کر آفتابِ عالم تاب تک ساری کائنات طوعًا و کرہًا عمل کر رہی ہے۔ کسی شے کی مجال نہیں کہ اس قانون کے خلاف چل سکے۔ جو چیز اس سے ذرّہ برابر سرتابی کرتی ہے وہ فساد اور فنا کی شکار ہو جاتی ہے، یہ زبردست قانون جو انسان، حیوان، درخت، پتھّر، ہوا، پانی، اجسامِ ارضی اور اجرامِ فلکی سب پر یکساں حاوی ہے۔ ہماری زبان میں فطرت یا قانون قدرت کہلاتا ہے اس کے تحت جو کام جس چیز کے سپرد کر دیا گیا ہے وہ اس کے کرنے میں لگی ہوئی ہے۔ ہوائیں اس کے اشارے پر چلتی ہیں، بارش اس کے حکم سے ہوتی ہے، پانی اس کے فرمان سے بہتا ہے، سیّارے اس کے اشارے سے حرکت کرتے ہیں ...... جس چیز کو ہم زندگی، بقا اور کَوَن کہتے ہیں دراصل نتیجہ ہے اس قانون کی اطاعت کا اور جس کو ہم موت، فنا اور فساد

کہتے ہیں وہ درحقیقت نتیجہ ہے اس قانون کی خلاف ورزی کا!"

(تفہیمات: مضمون "اسلام میں عبادت کا تصوّر"، ص ۱۴۰، ۱۴۱)

۱۔ ایک اقتباس اور! "رسالۂ دینیات"، جو ثانوی درجے کے طلباء کے لیے بطور نصاب مرتب کیا گیا ہے اس کے پہلے باب میں "اسلام کی حقیقت" کے ذیلی عنوان سے ذیل کا بصیرت افروز ٹکڑا سامنے آتا ہے،

"یہ زبردست قانون جس کی بندش میں بڑے بڑے سیّاروں سے لے کر زمین کا ایک چھوٹے سے چھوٹا ذرّہ تک جکڑا ہوا ہے، ایک بہت بڑے حاکم کا بنایا ہوا قانون ہے۔ ساری کائنات اور کائنات کی ہر چیز اس حاکم کی مطیع اور فرماں بردار ہے کیوں کہ وہ اس کے بنائے ہوئے قانون کی اطاعت و فرماں برداری کر رہی ہے۔ اس لحاظ سے ساری کائنات کا مذہب اسلام ہے، کیونکہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ خدا کی اطاعت و فرمانبرداری ہی کو "اسلام" کہتے ہیں سورج اور چاند اور تارے سب مسلم ہیں۔ زمین بھی مسلم ہے، ہوا اور پانی اور روشنی بھی مسلم ہیں، درخت اور پتھر اور جانور بھی مسلم ہیں۔ اور وہ انسان بھی جو خدا کو نہیں پہچانتا، جو خدا کا انکار کرتا ہے، جو خدا کے سوا دوسروں کو پوجتا ہے جو خدا کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتا ہے، ہاں وہ بھی اپنی فطرت اور ودیعت کے لحاظ سے مسلم ہی ہے، اس کے تمام اعضاء اور جسم کے ایک ایک رونگٹے کا مذہب اسلام ہے، کیونکہ وہ سب خدائی قانون کے مطابق بنتے، بڑھتے اور حرکت کرتے ہیں۔"

(رسالۂ دینیات ص ۱۰۔ ۱۱)

یہ ہے وہ وسعتِ نظر! یہ ہے وہ جامع نگاہی، یہ ہے وہ آفاق گیری جس کے ساتھ ایک نظریۂ حیات کو جب مودودی پیش کرتا ہے، تو وہ ایک عظیم مفکر کی حیثیت پا لیتا ہے وہ اسلام کو اس حیثیت سے سامنے نہیں لاتا کہ یہ اس کا ذاتی مذہب ہے، یا جس قوم میں وہ پیدا ہوا وہ اپنے آپ کو اس سے نسبت دیتی ہے، بلکہ وہ اپنے اس محبوب نظریے کو

اس قدر و قیمت کے ساتھ پیش کرتا ہے کہ یہی ساری کائنات کا دین و مسلک ہے۔ یہ وہ حقیقتِ عظمیٰ ہے کہ جمادات، نباتات، حیوانات، سبھی پر چھائی ہوئی ہے۔ یہ سارے کا سارا کاروانِ وجود بالکل ہم رنگ، ہم مسلک اور ہم آہنگ ہے۔ وہی بات کہ ؎

ماہمہ یک..... دود مانِ نار و نور

آدم و مہر و مہ و جبریل و حور — اقبالؒ

مولانا مودودی انسانی زندگی کو ایک کل مانتے ہیں۔ ایک وحدت، ناقابلِ تقسیم وحدت قرار دے کر اس پر غور کرتے ہیں، ان کے نزدیک اسے مختلف خانوں میں بانٹ کر ہر خانے کو الگ الگ نظریوں کے حوالے نہیں کیا جا سکتا۔ جغرافیے اور زمانے کی لکیریں ان کے نزدیک فطرتِ انسانی کے تقاضوں کو، اس کے خیر و شر کو، اس کے معروف و منکر کو نہیں بدل ڈالتیں، ذرائع و وسائل کا ارتقاء اخلاقی ضابطوں کو متغیّر نہیں کرتا، فطرتِ انسانی کی مستقل ساخت ان کے نزدیک ساری تاریخِ انسانی کو ایک مربوط شے بناتی ہے، حق اور باطل یا اسلام اور جاہلیّت دو کردار ہیں جو اپنی کشمکش شروع سے آخر تک ہر قسم کے حالات میں جاری رکھے ہوئے ہیں اور انہی کی وجہ سے یہ کہانی ایک مسلسل کہانی بنتی ہے۔ ان حقیقتوں کو مختلف پیرایوں میں نمایاں کیا ہے۔ یہی نقطۂ نظر ہے جس کے تحت وہ تاریخ میں امامت LEADERSHIP کے انقلاب کی توجیہ اس طرح کرتے ہیں:

> "ٹھیک اسی طرح اس کا ایک اور قانون بھی ہے جو ہماری تاریخ کے اُتار چڑھاؤ پر ہمارے گرنے اور اٹھنے پر، ہماری ترقی اور تنزّل پر، ہماری ذاتی قومی اور ملکی تقدیروں پر حکومت کر رہا ہے ...... خدا کے اس قانون کی پہلی اور سب سے اہم دفعہ یہ ہے کہ وہ بناؤ کو پسند کرتا ہے اور بگاڑ کو پسند نہیں کرتا۔ مالک ہونے کی حیثیت سے اس کی خواہش یہ ہے کہ اس کی دنیا کا انتظام ٹھیک کیا جائے، اس کو زیادہ سے زیادہ سنوارا جائے، اس کے دیے ہوئے ذرائع اور اور اس کی بخشی ہوئی قوّتوں اور قابلیتوں کو زیادہ سے زیادہ بہتر طریقے سے استعمال کیا جائے؛ وہ اس بات کو ہرگز پسند نہیں کرتا کہ اس کی

دنیا بگاڑی جائے، اجاڑی جائے، اور اس کو بدنظمی سے، گندگیوں سے اور ظلم و ستم سے خراب کر ڈالا جائے۔ انسانوں میں سے جو لوگ بھی دنیا کے انتظام کے امیدوار بن کر کھڑے ہوتے ہیں، ان میں سے صرف وہ لوگ خدا کی نظرِ انتخاب میں مستحق ٹھہرتے ہیں جن کے اندر بنانے کی زیادہ سے زیادہ صلاحیت ہوتی ہے۔ انہی کو وہ یہاں کے انتظامات کے اختیارات سپرد کرتا ہے، پھر وہ دیکھتا رہتا ہے کہ یہ لوگ بناتے کتنا ہیں اور بگاڑتے کتنا ہیں۔ جب تک ان کا بناؤ بگاڑ سے زیادہ ہوتا ہے اور کوئی دوسرا امیدوار ان سے اچھا بنانے والا اور ان سے کم بگاڑنے والا میدان میں موجود نہیں ہوتا اس وقت تک ان کی ساری برائیوں اور ان کے سارے قصوروں کے باوجود دنیا کا انتظام انہی کے سپرد رہتا ہے، مگر جب وہ کم بنانے اور زیادہ بگاڑنے لگتے ہیں، تو خدا انھیں اُٹھا کر پرے پھینک دیتا ہے، اور دوسرے امیدواروں کو اسی لازمی شرط پر انتظام سونپ دیتا ہے۔"

(تقریر، "بناؤ اور بگاڑ"، مئی ۱۹۴۷ء)

یہ تقریر شروع سے آخر تک تاریخ کی اسی تعبیر کی تشریح ہے، اور مخاطبین کو واقعات و شواہد کی روشنی میں اس سُنّتِ الٰہی سے آگاہ کر کے ان سے چاہا گیا کہ وہ اپنے آپ کو "بناؤ" کی صلاحیتوں سے آراستہ کریں۔

ان اقتباسات سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مودودی کی فکر ایک ہمہ گیر مرتب اور مربوط فکر ہے۔ وہ ذہنی سانچہ ہی ایسا وسیع ہے کہ ساری کائنات، ساری انسانیت، ساری تاریخ اور ساری زندگی کو اپنے اندر لے کر پھر غور و فکر کا آغاز کرتا ہے۔ اس ذہنی سانچے میں جب اسلام کو رکھا جاتا ہے، تو وہ بھی ایک منظم و مربوط نظام کی ہیئت میں سامنے آتا ہے۔ ذرا دیکھیے یہ چند سطریں:

"اسلام محض چند منتشر خیالات اور منتشر طریقہ ہائے عمل کا مجموعہ نہیں ہے، جس میں ادھر اُدھر سے مختلف چیزیں لا کر جمع کر دی گئی ہوں، بلکہ یہ ایک باضابطہ نظام

ہے۔جس کی بنیاد چند مضبوط اصولوں پر رکھی گئی ہے۔ اس کے بڑے بڑے ارکان سے لے کر چھوٹے چھوٹے جزئیات تک ہر چیز اس کے بنیادی اصولوں کے ساتھ ایک منطقی ربط رکھتی ہے۔ انسانی زندگی کے تمام مختلف شعبوں کے متعلق اس نے جتنے قاعدے اور ضابطے مقرر کیے ہیں ان سب کی روح اور ان کا جوہر اس کے اصولِ اوّلیہ ہی سے ماخوذ ہے۔ ان اصولِ اوّلیہ سے پوری اسلامی زندگی اپنی مختلف شاخوں کے ساتھ بالکل اسی طرح نکلتی ہے جس طرح درخت میں آپ دیکھتے ہیں کہ بیج سے جڑیں اور جڑوں سے تنا اور تنے سے شاخیں اور شاخوں سے پتیاں پھوٹتی ہیں اور خوب پھیل جانے کے باوجود اس کی ایک ایک پتی اپنی جڑ کے ساتھ مربوط رہتی ہے۔"

(اسلام کا نظریۂ سیاسی، ص ۵)

ان الفاظ میں مودودی نے خود اپنے فکر کی جامعیّت کی تصویر کھینچ دی ہے۔ اسی ہمہ گیرانہ اور جامعانہ اسلوب سے وہ جب کسی الجھے ہوئے مسئلے کو چھیڑتا ہے، تو ایک جزئی غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے ہمیں پورے سسٹم میں وہ خاص مسئلہ رکھ کے دکھاتا ہے۔ وہ "پردہ" کے پامال موضوع کو چھیڑے گا، تو پورے کے پورے اسلامی معاشرتی نظام کو دنیا بھر کے معاشرتی نظاموں کے مقابلے پر رکھ کر پھر ہمیں دکھائے گا کہ اس نظام میں پردہ کی جگہ کیا ہے، اور کیوں ہے، اور اسے اس کی جگہ سے ہٹا دیا جائے تو کس طرح اصول و مقاصد کا سارا ڈھانچہ پیوندِ زمین ہو کے رہ جائے گا۔ وہ "سود" کی حرمت پر بات چھیڑے گا تو ایک طرح سرمایہ دارانہ نظام کا تفصیلی نقشہ سامنے لا کر بتائے گا کہ اس نظام کو مفاسد سے مالامال کرنے میں سود کا پارٹ کیا ہے، اور دوسری طرف اسلامی نظامِ معیشت کا خاکہ کھینچ کر دکھائے گا کہ اس کے اندر سود کے لیے سرے سے کوئی جگہ نہیں نکلتی، اور زبردستی نکالی جائے تو اس خاکہ کے سارے مقاصد غارت ہو کر رہ جائیں گے۔ اسی طرح وہ اگر "اسلام تلوار سے پھیلا"، کے شر انگیز اعتراض کا جواب دینے کو قلم اٹھائے گا تو دنیا بھر کے قوانینِ جنگ کے بالمقابل اسلامی نظریۂ جہاد اور اس کے اصول و قوانین اور اس کے مقاصد دو منہاج پر۔

"الجہاد فی الاسلام" جیسی سائنٹفک، ضخیم اور علمی کتاب مرتب کرکے آپ کے سامنے رکھ دے گا۔ وہ اپنی کتاب "خطبات" جو کم تعلیم یافتہ دیہاتی عوام کے مطالعہ کے لیے لکھی گئی ہے) میں اسلام کے اجزاء کو الگ الگ کرکے دیکھنے اور ان سے مطلوبہ نتائج اخذ کرنے کی ناکام کوشش کرنے والوں کو ایک کلاک کی مثال دیتا ہے کہ جب تک اس کے تمام کے تمام پرزے اپنی اپنی جگہ پر نصب ہوں اور اپنا اپنا کام کر رہے ہوں تو اس کے ڈائل پر مطلوبہ نتیجہ (یعنی وقت بتانا) نکلتا رہے گا، لیکن اگر اس کے پرزوں کو کھول ڈالا جائے تو چاہے الگ الگ پرزوں کو لے کر ان کو کتنا پالش کیا جائے اور کتنا ہی تیل دیا جاتا رہے ڈائل پر کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا، بلکہ کسی پرزے کی مقصدیّت بھی سمجھ میں نہ آسکے گی۔ اسلام کے کلاک کو کھول کر اس کے پرزے الگ الگ کرکے بلکہ ان کو سائیکل اور سلائی مشین کے پرزوں سے ادل بدل تک کرکے جب لوگ ان میں سے کسی ایک پر غور کرتے ہیں تو انکو اس نظام کی ڈور کا سرا نہیں مل سکتا۔ مولانا نے ایک دوسرے مقام پر اسلام کے متعلّق فکری انتشار کی اس عام وجہ کو کھول کر یوں بیان کیا ہے:

"عام طور پر لوگ جب اسلام کے مسئلہ پر غور کرتے ہیں تو اس نظام اور سسٹم پر بہ حیثیت مجموعی نگاہ نہیں ڈالتے جس سے وہ مسئلہ متعلق ہوتا ہے، بلکہ نظام سے الگ کرکے مِنْ حیثُ ہُوَ ہُوَ لے لیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ جز تمام حکمتوں سے خالی نظر آنے لگتا ہے۔ اور اس میں طرح طرح کے شکوک پیدا ہونے لگتے ہیں ـــــــ اگر آپ پوری عمارت کو دیکھنے کے بجائے صرف اس کے ایک ستون کو دیکھیں گے، تو لامحالہ آپ کو حیرت ہوگی کہ یہ آخر کیوں لگایا گیا ہے۔" (پردہ)

مودودی کے طریق فکر کا امتیاز یہی ہے کہ وہ ایک ایک مسئلے، ایک ایک جزئی حکم، ایک ایک آیت اور ایک ایک حدیث کو مجموعی سسٹم میں اس کی اپنی جگہ پر رکھ کر دکھاتا ہے وہ نظامِ زندگی کی کُل کا ایک ایسا انجینیر ہے جو ایک، ادنیٰ سی کیل کو اپنے صحیح مقام پر گڑا ہوا اور کام کرتا ہوا سامنے رکھ دیتا ہے، تو اس کی حقیقت و مقصدیّت پوری پوری طرح آشکارا

ہو جاتی ہے۔

جامع نظریے اور زندگی کے نظام دینے والے لوگ ہمیشہ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ وہ اس لیے بڑے ہوتے ہیں اور اسی لیے بڑے مانے جاتے ہیں کہ وہ انسانی معاشروں کو وہ چیز بہم پہنچاتے ہیں جس سے نئے ذہن پیدا ہوتے ہیں، نئے خیالات اٹھتے ہیں، حرکت اور سرگرمی پیدا ہوتی ہے، مقصد اور نصب العین ہاتھ آتا ہے، تعمیری قوتوں کو کام کرنے کے لیے نقشے ملتے ہیں اور زندگی ایک کل کی طرح مربوط ہو کر متحرک ہو جاتی ہے۔

اسلام کا تعارف بحیثیت نظام و تحریک

مولانا مودودی کی مفکرانہ عظمت کا دوسرا راز یہ ہے کہ آپ نے اسلام کو صدہا برس کے تباہ کن عوامل کی گرفت سے نکالا اور ایک مذہب اور مت کی سطح سے اٹھا کر نظام زندگی ہونے کا صحیح مقام اسے دوبارہ اس دورِ الحاد میں پورے عقلی زور کے ساتھ دے دیا جو کچھ قطع و برید اس میں کی گئی تھی، اس میں جو جو ترامیم، تحریفیں اور تصرّفات کیے گئے تھے، اور اس کے عقیدوں، عبادتوں، اخلاقی ہدایات کو سیاست و تمدّن سے کاٹ کر جو بے معنی حیثیت دے دی گئی تھی، ان ساری حرکات کے ایک ایک اثر کا ازالہ کر کے اسے "دین" کی حیثیت میں ہمارے سامنے رکھ دیا۔ کمال یہ کہ یہ سارا کام جدید دور کے عقلی اور سائنٹفک معیار پر ہر لحاظ سے پورا اترتا ہے، خصوصیت سے دین و سیاست کی تقسیم کا جو نظریہ مغرب سے آیا تھا، اور آ کر ہماری ذہنی فضا پر اثر انداز ہو گیا تھا، اس کے خلاف ملّت کے اجتماعی ذہن نے جو کشمکش کی ہے، اور جس میں بہت بڑا تاریخی حصہ علّامہ اقبال کا بھی تھا، اسے کامیاب تکمیل تک مولانا مودودی نے پہنچایا مولانا مودودی کا تصوّرِ اسلام زندگی کے سارے مسائل کو اپنے دائرے میں لیتا ہے، اور ان کو اپنے اسلوب سے حل کرتا ہے۔ وہ کسی جزئی مسئلے کو اپنے حلقۂ اثر سے مستثنیٰ چھوڑ کر کسی دوسری طاقت کے حوالے کرنے پر تیار نہیں ہوتا۔ وہ زندگی کی تقسیم سے انکاری ہے۔ اس کا نظریۂ توحید وحدتِ الٰہ اور وحدتِ آدم کے تصوّرات پر مشتمل ہے بلکہ مودودی کو اسلام کے اسی تصوّر نے

اپنی طرف کھینچا۔ ورنہ اس جیسا ذہین انسان بے روح عقیدوں، بے مقصد رسموں، بے معنے حرکتوں سے مربوط زندگی کے مجموعے کے حوالے اپنے آپ کو کرنے والا نہ تھا۔ وہ خود کہتا ہے:

"اس بے رُوح مذہبیّت کا پہلا بنیادی نقص یہ ہے کہ اس میں اسلام کے عقائد محض ایک دھرم RELIGION کے مزعومات بنا کر رکھ دیئے گئے ہیں۔ حالانکہ وہ ایک مکمل فلسفۂ اجتماع اور نظامِ تمدّن کی منطقی بنیادہیں۔ اور اسی طرح اس کی عبادات محض پوجا اور تپسّیا بنا کر رکھ دی گئی ہیں حالاں کہ وہ ان ذہنی اور اخلاقی بنیادوں کو مضبوط و مستحکم کرنے کے وسائل ہیں جن پر اسلام نے اپنا نظامِ اجتماعی تعمیر کیا ہے۔ اس عملِ تحریف کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگوں کی سمجھ میں کسی طرح یہ بات نہیں آتی کہ آخر ایک سیاسی، معاشی اور تمدّنی لائحۂ عمل کو چلانے کے لیے ان عقایئد اور ان عبادات کی ضرورت ہی کیا ہے۔ دوسرا بنیادی نقص اس مسخ شدہ مذہبیّت میں یہ ہے کہ اس میں اسلامی شریعت کو ایک منجمد شاستر بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ اس میں صدیوں سے اجتہاد کا دروازہ بند ہے جس کی وجہ سے اسلام ایک زندہ تحریک کے بجائے محض عہدِ گزشتہ کی ایک تاریخی یادگار بن کر رہ گیا ہے، اور اسلام کی تعلیم دینے والی درسگاہیں آثارِ قدیمہ کے محافظ خانوں میں تبدیل ہو گئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اجنبی لوگ اس چیز کو دیکھ کر زیادہ سے زیادہ تاریخی ذوق کی بنا پر اظہارِ قدر شناسی تو کر سکتے ہیں، مگر یہ توقع ان سے نہیں کی جا سکتی کہ وہ حال کی تدبیر اور مستقبل کی تعمیر کے لیے اس سے ہدایت و راہنمائی حاصل کرنے کی ضرورت محسوس کریں گے تیسرا اہم نقص اس میں یہ ہے کہ جزئیات کی ناپ تول، مقداروں کے غیر منصوص تعین اور روح سے بڑھ کر مظاہر پر مدارِ دینداری رکھنے کی بیماری اس میں حد سے بڑھ گئی ہے، اور وہ غیروں کی تالیف تو کیا کرے گی اُلٹی اپنوں کی تنفیر کا باعث بن رہی ہے۔ اس غلط مذہبیّت کے علمبرداروں کی زندگی دیکھ کر اور ان کی باتیں سن کر آدمی اس سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ ان کی ابدی فلاح و

خسران کا مدار کیا انہی چھوٹی چھوٹی چیزوں پر ہے جن پر یہ لوگ اتنا زور دے رہے ہیں۔"

(سیاسی کشمکش حصّہ سوم، ص ۱۱۴)

"اسلام کو جس صورت پر میں نے گرد و پیش کی مسلم سوسائٹی میں پایا، میرے لیے اس میں کوئی کشش نہ تھی۔ تنقید و تحقیق کی صلاحیّت پیدا ہو جانے کے بعد پہلا کام جو میں نے کیا وہ یہی تھا کہ اس بے روح مذہبیّت کا قلادہ اپنی گردن سے اتار پھینکا جو مجھے میراث میں ملی تھی۔ اگر اسلام صرف اسی مذہب کا نام ہوتا جو اس وقت مسلمانوں میں پایا جاتا ہے تو شاید میں بھی آج ملحدوں اور لامذہبوں میں جا ملا ہوتا، کیوں کہ میرے اندر نازی فلسفہ کی طرف قدرتی میلان نہیں ہے کہ محض حیاتِ قومی کی خاطر اجداد پرستی کے چکّر میں پڑا رہوں، لیکن جس چیز نے مجھے الحاد کی راہ پر جانے یا کسی دوسرے اجتماعی مسلک کو قبول کرنے سے روکا اور از سرِ نو مسلمان بنایا وہ قرآن اور سیرتِ محمدیؐ کا مطالعہ ہے اس کے تجویز کردہ لائحۂ زندگی، SCHEME & LIFE میں مجھے ویسا ہی کمال درجہ کا توازن نظر آیا، جیسا کہ ایک سالمہ ATOM کی بندش سے لیکر اجرامِ فلکی کے قانونِ جذب و کشش تک ساری کائنات کے نظم میں پایا جاتا ہے۔

پس درحقیقت میں ایک نو مسلم ہوں، خوب جانچ پرکھ کر اس مسلک پر ایمان لایا ہوں جس کے متعلق میرے دل و دماغ نے گواہی دی ہے کہ انسان کے لیے صلاح و فلاح کا کوئی راستہ اس کے سوا نہیں ہے ـــــ میرا مقصد اس نام نہاد مسلم سوسائٹی کو باقی رکھنا اور بڑھانا نہیں ہے جو خود ہی اسلام کی راہ سے بہت دور ہٹ گئی ہے، بلکہ یہ دعوت اس طرف ہے کہ ـــــ آؤ ہم اس ظلم و طغیان کو ختم کر دیں ـــــ اور قرآن کے نقشہ پر ایک نئی دنیا بنائیں۔"

(سیاسی کشمکش حصّہ سوم، ص ۱۵، ۱۶)

یوں مولانا مودودی کا تصوّرِ اسلام ایک نئی دنیا، ایک پورا عالِم قرآنی اپنے اندر لیئے ہوئے ہے۔ اس معاملے میں مودودی کا کام بالکل نیا اور انوکھا نہیں تھا، بلکہ اسلام کا یہ جامع تصوّر ہمارے ملّی لٹریچر میں ہمیشہ موجود رہا ہے اور وقتاً فوقتاً اسے ہمارے رجال اکابر نکھارتے رہے ہیں۔ ماضی قریب کے مجدّد شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے نظامِ اسلامی کا مکمّل تصوّر قوم کو دیا ہے، اس دور کے متاخرین میں مولانا سیّد سلیمان ندوی، مولانا آزاد، علّامہ اقبال اور دوسرے بے شمار لکھنے اور بولنے والے اسی تصوّر کی آب یاری کرتے رہے ہیں۔ مولانا مودودی کا کوئی خاص حصّہ اس خدمت میں ہے تو وہ یہ ہے کہ آپنے اسلامی تصوّرِ نظام کو بالکل ایک سائنس بنا کر دنیا کے سامنے رکھ دیا ہے۔ آپ کی تحریریں اور تقریروں میں ایک ریاضیاتی ذہن کارفرما ہے جو ہر حقیقت کو دو اور دو چار کا مسئلہ بنا کر پیش کرتا ہے۔

دوسری خاص بات یہ ہے کہ مودودی کا تصوّرِ اسلام نظریاتی ACADEMIC نہیں ہے، وہ ایک کتابی آدمی اور ایک مصنف اور ایک مقالہ نگار کی طرح اسے پیش نہیں کرتا، بلکہ ایک عملی آدمی کے ذہن کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ یہ عملی ذہن نظامِ اسلامی کے تخیّل میں ایک تحریکیّت پیدا کر دیتا ہے، یعنی اس کا تصوّرِ اسلام ایسا ہے جو اپنے مخالف نظریات و تصوّرات، ناسازگار ماحول، غلط نظامِ سیاست و تمدّن سے ٹکرانا چاہتا ہے۔ وہ تبدیلی کا تقاضا کرتا ہے، وہ ظہور پاتے ہی اپنے سرچشمہ سے بہنا چاہتا ہے۔ اور چٹانوں کو اپنے اندر ریلنا چاہتا ہے۔ یہ تصوّر ایک ٹھہراؤ رکھنے والی جھیل کی طرح نہیں ہے ایک بہاؤ رکھنے والے موّاج دریا کی طرح ہے۔ تصوّرِ اسلام کو ازسرِ نو اسکی تحریکیّت سے مالامال کر دینا مودودی کا خصوصی کارنامہ ہے، اس سے وہ محض مفکّر بننے کے بجائے انقلابی مفکّر بنتا ہے۔ مسلمانوں سے اُسے گلہ ہے کہ:

> "انھوں نے خود بھی اسلام کے ساتھ انصاف نہیں کیا اور اسے ایک تحریک MOVEMENT کے بجائے محض زمانۂ سلف کی ایک مقدّس میراث بنا کر رکھ دیا ہے۔" (سیاسی کشمکش حصّہ سوم، ص ۱۸)

اتنا ہی نہیں، مودودی کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اسلام کو ایک تحریک کی سطح سے نیچے اتار کر دیکھنے سے اس کی حقیقت کو سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔ اس کی مشہور تفسیر "تفہیم القرآن" جن خصوصیات کے ساتھ سامنے آئی ہے ان میں مرتبۂ اوّل کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ قرآن کو ایک چلتی ہوئی انقلابی تحریک کے گائیڈ کی حیثیت سے پیش کرتی ہے، اور اسی تحریک کی عملی تاریخ کے مختلف مراحل کے اندر اس وقت کی رہنمائی کو رکھ رکھ کر اس کا مفہوم متعین کرتی ہے، چنانچہ اس کے بصیرت افروز مقدمہ میں قرآن فہمی کے اصول بیان کرتے ہوئے "صاحبِ تفہیم" نے ایک حقیقت یہ بیان کی ہے کہ:

"یہ محض نظریات اور خیالات کی کتاب نہیں ہے کہ آپ آرام کرسی پر بیٹھ کر اسے پڑھیں اور اس کی ساری باتیں سمجھ جائیں۔ یہ دنیا کے عام تصوّرِ مذہب کے مطابق ایک نری مذہبی کتاب بھی نہیں ہے کہ مدرسے اور خانقاہ میں اس کے سارے رموز حل کر لیے جائیں۔ جیسا کہ اس مقدّمے کے آغاز میں بتایا جا چکا ہے یہ ایک دعوت اور تحریک کی کتاب ہے۔ اس نے آتے ہی ایک خاموش طبع اور نیک نہاد انسان کو گوشۂ عزلت سے نکال کر خدا سے پھری ہوئی دنیا کے مقابلے میں لا کھڑا کیا۔ باطل کے خلاف اس سے آواز اُٹھوائی اور وقت کے علمبردارانِ کفر وفسق وضلالت سے اس کو لڑوا دیا۔ گھر گھر سے ایک ایک سعید روح اور پاکیزہ نفس کو کھینچ کھینچ کر لائی اور داعیٔ حق کے جھنڈے تلے ان سب کو اکٹھا کیا۔ گوشے گوشے سے ایک ایک فتنہ جو اور فساد پرور کو بھڑکا کر اٹھایا اور حامیانِ حق سے اُن کی جنگ کرائی۔ ایک فردِ واحد کی پکار سے اپنا کام شروع کر کے خلافتِ الٰہیّہ کے قیام تک پورے تیئس سال تک یہی کتاب اس عظیم الشان تحریک کی رہنمائی کرتی رہی، اور حق و باطل کی اس طویل و جاں گُسل کشمکش کے دوران میں ایک ایک منزل اور ایک ایک مرحلے پر اسی نے تخریب کے ڈھنگ اور تعمیر کے نقشے بتائے اب بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ سرے سے نزاعِ کفر و دین اور معرکۂ اسلام

وجاہلیّت کے میدان میں قدم ہی نہ رکھیں اور اس کشمکش کی کسی منزل سے گزرنے کا
آپ کو اتفاق ہی نہ ہوا ہو، اور پھر محض قرآن کے الفاظ پڑھ پڑھ کر اس کی
ساری حقیقتیں آپ کے سامنے بے نقاب ہو جائیں۔"

(مقدمہ تفہیم القرآن، ص ۲۳)

پھر یہ انقلابی مفکرّ محض تحریکیّت کا شعور دلا کر نہیں رہ جاتا، اپنی فکری مہم کے ساتھ ساتھ متوازی طور پر عملی تحریک لے کے چل بھی کھڑا ہوتا ہے، بلکہ درحقیقت وہ سارا فکری کام اسی عملی جدّوجُہد کے لیے کرتا ہے۔ بالعموم "مفکرّین" عملی میدان میں کچھ نہیں کر پاتے، لیکن مودودی ایک ایسا مفکر ہے جو جیسی فکر دے رہا ہے ویسی ہی تحریک بپا کیے ہوئے ہے۔

مسلم قوم پرستی اور اسلام میں تفریق وتمیز

اکثر لوگ اپنی ذات اور خاندان تک سوچ کر رہ جاتے ہیں۔ کچھ اور محلّے اور پڑوس شہر اور علاقے کے مسائل سے دل چسپی لیتے ہیں اور اس سے آگے کچھ سوچ نہیں سکتے۔ پھر اور لوگ ہوتے ہیں جو اپنے طبقے اور اپنی پارٹی کی فلاح و بہبود تک نگاہیں اٹھا سکتے ہیں۔ اس درجے کے محدود تفکرّ سے کوئی مفکرّ نہیں بنتا۔ مفکرّین کا کم سے کم مرتبہ یہ ہے کہ وہ قوم اور ملک کی فلاح و بہبود سے تعلق رکھنے والے مسائل کو نگاہ کے احاطے میں لیتے ہیں۔ اس سے آگے بڑھ کر وہ چوٹی کے مفکرّین آتے ہیں جو ساری انسانیّت سے اپنا رشتہ جوڑ کر اُن بُنیادی حقیقتوں کو سوچتے ہیں جن سے ہر فرد، ہر قوم اور ہر ملک کا مفاد وابستہ ہوتا ہے۔ یہ دور نیشنلزم کا دور تھا اور اس میں بے شمار قیمتی دماغ اُبھرے، لیکن ان میں سے بیشتر کو نیشنلزم نے اپنے محدود قفس میں لے لیا۔ ایک قوم، ایک وطن اور ایک نسل سے آگے وہ کچھ نہ سوچ سکے لیکن اسلام چوں کہ ساری نوعِ انسانی کو خطاب کرتا ہے اور ایک عالمی تحریک اور ایک جہانی نظام ہونے کا مدعی ہے۔ اس لیے اس کا نظریہ جغرافیائی اور نسلی حد بندیوں کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہے۔ قدرتی طور پر ایک حقیقی اسلامی مفکرّ سے بھی ہم یہی توقع کرتے ہیں کہ وہ قوم پرستانہ سطح سے بلند ہو کر سوچے گا۔ مودودی کا

فکری کارنامہ ہماری اس امید کی کسوٹی پر پورا اُترتا ہے ، وہ "سیاسی کشمکش" حصّہ اوّل ودوم اور "مسئلۂ قومیّت" لکھ کر جہاں ہندوستانی نیشنلزم سے لڑتا ہے اور بازی جیت کے دکھا دیتا ہے ، وہاں وہ پلٹ کر "مسلم نیشنلزم" کے اوپر اس سے زیادہ زور و شدّت کے ساتھ حملہ آور ہوتا ہے جو قوم پرستی کے جہانی دور کے زیرِ اثر آہستہ آہستہ خود مسلمانوں میں پروان چڑھنے لگتا ہے ۔ اسلام کو قوم پرستی کے سانچے میں ڈھالنے کی غیر شعوری ابتداء بہت اوپر سے ہو جاتی ہے اور متاخرین میں سے اکثر کو ہم غیر شعوری طور پر اسی "مسلم قوم پرستی" کا مسحور پاتے ہیں ۔ اور تو اور اقبال جیسا مفکرّ ، اسلام اور مسلم نیشنلزم کو دیر تک گڈمڈ کرکے چلتا ہے ، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ مسلم نیشنلزم کے جذبات کے راستے ہی اسلام تک پہنچتا ہے ۔ بالکل آخری ایّام میں آکر وہ مسلم نیشنلزم کی کینچلی کو اُتار سکا ہے ۔ مودودی اپنے وقت کا وہ پہلا شخص ہے جس نے ہمارے اجتماعی عالمِ افکار کے ان دوگونہ رجحانات کو ایک دوسرے سے جُدا جُدا کر کے خالص اسلام کو تعیّن دیا ہے اور مسلم نیشنلزم کے خلاف زبردست فکری معرکہ بپا کر دیا ہے ۔ اس کی انقلابی کتاب "سیاسی کشمکش" کا تیسرا حصّہ درحقیقت اسی خاص معرکہ کے لیے وقف ہے ۔ اس کتاب کی تحریک زا بحثوں کی ایک آدھ جھلک دیکھتے چلیے :

"بعض لوگ لفظ مسلمان سے دھوکا کھا کر اس غلط فہمی میں پڑ گئے ہیں ۔ کہ اصل سوال اسلام کے احیاء REVIVAL کا نہیں بلکہ مسلمانوں کے احیاء کا ہے ۔ یعنی یہ قوم جو مسلمانوں کے نام سے پائی جاتی ہے ، اس کو ایک زندہ اور طاقتور قوم بنانا اور برسرِعروج لانا اصل مقصود ہے اور اسی کا نام اسلام کا احیاء ہے ۔ یہ غلط فہمی ان کو مسلم قوم پرستی کی حد تک کھینچ لے گئی ہے ، جس طرح مونجے اور ساورکر کے لیے سوال ہندو قوم کے عروج کا ہے ، جس طرح مسولینی کے لیے اطالوی قوم اور ہٹلر کے لیے جرمن قوم کے عروج کا سوال ہے ، اسی طرح ان مسلم قوم پرستوں کے لیے اصل سوال اس مسلمان قوم کے عروج کا ہے جس میں یہ پیدا ہوئے ہیں اور جس کے ساتھ ان کی قسمتیں وابستہ ہیں ۔

یہ ذہنیت سرسیّد احمد خاں کے وقت سے آج تک مسلمانوں کے اکثر و بیشتر رہنماؤں، کارکنوں اور اداروں پر مسلّط ہے۔ اسلام کے نام سے جو کچھ سوچا جارہا ہے اور اسلام کی قید سے آزاد ہو کر سوچا جارہا ہے... اگر مسلمان ہونے کی حیثیّت سے دیکھا جائے تو ہمارے سامنے اصل سوال کسی قوم کے احیاء کا نہیں بلکہ مسلکِ اسلام کے احیاء کا ہے۔ قوم کے احیاء کا خیال دماغ سے نکالتے ہی وہ تمام مسائل کافور کی طرح اڑ جاتے ہیں جو قومیّت کی اصطلاحوں میں سوچنے والے لوگوں کو پریشان کیا کرتے ہیں۔"

(سیاسی کشمکش حصّہ سوم، ص ۱۲۰ تا ۱۲۲)

"اگرچہ ہندوستان کے مسلمانوں میں اسلام اور مسلم قوم پرستی ایک مدت سے خلط ملط ہیں، لیکن قریبی دور میں اس معجون کا اسلامی جُز اتنا کم اور قوم پرستانہ جُز اتنا زیادہ بڑھ گیا ہے کہ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں اس میں نری قوم پرستی ہی قوم پرستی نہ رہ جائے۔ حد یہ ہے کہ ایک بڑے ممتاز لیڈر کو ایک مرتبہ اس امر کی شکایت کرتے ہوئے سنا گیا کہ بمبئی اور کلکتہ کے دولت مند مسلمان اینگلو انڈین فاحشات کے ہاں جاتے ہیں۔ حالاں کہ مسلمان طوائفیں ان کی سرپرستی کی زیادہ مستحق ہیں۔ اس حدِ کمال کو پہنچ جانے کے بعد اس مسلم قوم پرستی کے ساتھ مزید رواداری برتنا میرے نزدیک، گناہِ عظیم ہے۔"

(سیاسی کشمکش حصّہ سوم ص ۸)

"اس (اسلام) کا منتہائے نظر ایک ایسی جہانی ریاست WORLD-STATE ہے جس میں نسلی اور قومی تعصّبات کی زنجیریں توڑ کر تمام انسانوں کو مساوی حقوق اور مساوی مواقع ترقی کے ساتھ ایک تمدّنی و سیاسی نظام میں حصّہ دار بنایا جائے۔"

(مسئلہ قومیّت۔ ص ۶۸)

"بلکہ یہ ایک قسم کی پارٹی ہے جو ایک مستقل نظامِ تہذیب و تمدّن CIVILIZATION

بنانے کے لیے اٹھتی ہے اور چھوٹی چھوٹی سرحدوں کو توڑ کر عقلی بنیادوں پر
ایک بڑی جہانی قومیّت WORLD NATIONALITY بنانا چاہتی ہے۔"
ان حوالوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مودودی اس دور میں وہ پہلا شخص بن کر سامنے آیا ہے جس نے اسلام اور مسلم نیشنلزم کی باہمی ترکیب کو شعوری طور پر توڑ ڈالا ہے۔ اور جو اسلام کو نسلی مذہب و مسلک کی حیثیت سے نہیں بلکہ ساری انسانیت کے دینِ فلاح کی حیثیّت سے لے کے اٹھا ہے اور جس کے سامنے ایک جہانی ریاست اور واحد انسانی قومیّت کا نہایت ہی بلند اور وسیع مطمحِ نظر ہے۔ کام کا دائرۂ آغاز وہ بھی عملاً مسلمان قوم قرار دیتا ہے لیکن وہ مسلم قوم پرستی کی تنگ حدود کو پہلے قدم پر توڑ کر آگے چلتا ہے۔ یہ مودودی کا امتیازی کارنامہ ہے۔

اجتماعی تضاد کا تجزیہ

زوال اور انحطاط کے عمل سے جب کوئی تحریک یا نظریہ یا مسلک گزرتا ہے، تو اس کے ماننے والوں کی زندگیوں میں مضحکہ خیز تضاد پیدا ہونے لگ جاتے ہیں۔ یہ واقعہ چونکہ اس وقت رونما ہوتا ہے جب فکری جمود کا روگ لگ چکتا ہے، اس لیے ایک ایک کر کے تضاد ابھرتے رہتے ہیں، بے جوڑ چیزوں میں سمجھوتے قائم ہو جاتے ہیں، متناقض عناصر باہم ترکیب پاتے رہتے ہیں اور کسی کو ان سے کھٹک نہیں ہوتی۔ زندگی کا سارا فساد —— چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا —— جس بھی دائرے میں واقع ہوتا ہے، ہمیشہ تضاد ہی سے واقع ہوتا ہے۔ فرد کے نفسیاتی نظام سے لے کر معاشرے کی سیاسی و اجتماعی ہیئت تک زندگی میں جو خلل بھی آتا ہے بے جوڑ چیزوں کے جمع ہو جانے سے آتا ہے۔ یہ بے جوڑ چیزیں یکے بعد دیگرے جمع ہوتی رہتی ہیں، اور زندگی ایک عجیب معجونِ مرکّب بن جاتی ہے، لیکن عام لوگوں کے ذہن ان کے عادی ہو کر اپنے فکر و نظر کو فساد زدہ ماحول سے کچھ ایسا سازگار بنا لیتے ہیں کہ پہاڑ پہاڑ جیسے بڑے تضاد محسوس نہیں ہوتے۔ جب تک یہ محسوس نہیں ہوتے، تبدیلی نہیں آتی۔ غیر معمولی درجے کے مفکر ہی وہ لوگ

ہوتے ہیں جو زندگی کے تضادوں کو سمجھ جاتے ہیں، اور پھر ان کو تنقید کا نشانہ بنا کر اجتماعی حس کو بیدار کرنے میں لگ جاتے ہیں۔ جس صاحبِ فکر کے کارنامے کا بھی آپ جائزہ لیں آپ دیکھیں گے کہ وہ زندگی کے کچھ نہ کچھ تضادوں کو نمایاں کرتے ہیں جنھیں عام ذہن نے محسوس نہیں کیا ہوتا۔ اور پھر جو صاحبِ فکر کسی ہمہ گیر اور بنیادی تضاد پر انگلی رکھ دیتا ہے وہ مفکرانہ مرتبے میں دوسرے بے شمار اہلِ فکر سے آگے بڑھ جاتا ہے۔ مودودی نے اس ہمہ گیر تضاد کو اُجاگر کیا ہے جو مسلمانوں کی زندگی کے ایک ایک گوشے پر سالہا سال سے اپنا پرتو ڈالے چلا آرہا تھا۔ وہ ہے اسلام اور مسلمانوں کے نام کے ساتھ ان بے شمار نظریوں، خیالات، اعمال و کردار اور نظام ہائے کار کا جوڑ جو قطعاً غیر اسلامی اور غیر مسلمانہ ہیں۔ امرِ واقعہ ایسا ہے کہ بالکل پیش پا افتادہ ہے اور ہم سب اس سے ہمہ وقت دوچار ہیں۔ کوئی رازِ نہفتہ نہیں، لیکن ہم چونکہ اس سے ذہنی سازگاری پیدا کر چکے ہیں۔ اس لیے وہ ہمیں کھٹکتا نہیں۔ جب ایک حسّاس ذہن نمودار ہوتا ہے، تو وہ اس پر یوں گرفت کرتا ہے:

> "بازاروں میں جائیے، مسلمان رنڈیاں آپ کو کوٹھوں پر بیٹھی نظر آئیں گی، اور مسلمان زانی گشت لگاتے ملیں گے، جیل خانوں کا معائنہ کیجیے، مسلمان چوروں، مسلمان ڈاکوؤں اور مسلمان بدمعاشوں سے آپ کا تعارف ہوگا، دفتروں اور عدالتوں کا چکر لگائیے، رشوت خوری، جھوٹی شہادت، جعل، فریب، ظلم اور ہر قسم کے اخلاقی جرائم کے ساتھ آپ لفظ مسلمان کا جوڑ لگا ہوا پائیں گے، سوسائٹی میں پھریے، کہیں آپ کی ملاقات مسلمان شرابیوں سے ہوگی، کہیں آپ کو مسلمان قمارباز ملیں گے، کہیں مسلمان سازندوں اور مسلمان گویوں اور مسلمان بھانڈوں سے آپ دوچار ہوں گے۔ بھلا غور تو کیجیے یہ لفظ مسلمان کتنا ذلیل کر دیا گیا ہے۔"
>
> (سیاسی کشمکش، حصّہ سوم۔)

(نیز تحریکِ آزادیٔ ہند اور مسلمان، حصّہ دوم۔ اشاعت ۱۹۸۳ء ص۔۴۴)

اُس سے اونچے تعلیم یافتہ طبقے کی حالت اور بھی زیادہ افسوس ناک ہے
کہیں کوئی صاحب علانیہ خدا اور رسول کا مذاق اڑا رہے ہیں اور اسلام پر
پھبتیاں کس رہے ہیں، مگر ہیں پھر بھی مسلمان ہی! ایک دوسرے صاحب
خدا اور رسالت اور آخرت کے قطعی منکر ہیں اور کسی مادّہ پرستانہ مسلک پر
پورا ایمان رکھتے ہیں مگر ان کے مسلمان ہونے میں کوئی فرق نہیں آتا۔ ایک
تیسرے صاحب سود کھاتے ہیں اور زکوٰۃ کا نام تک نہیں لیتے، مگر ہیں یہ
بھی مسلمان! ایک اور بزرگ بیوی اور بیٹی کو میم صاحبہ یا شریمتی جی بنائے
ہوئے سینما لیے جا رہے ہیں، یا کسی رقص و سرود کی محفل میں صاحبزادی سے
وائلن بجوا رہے ہیں، مگر آپ کے ساتھ بھی لفظ مسلمان بدستور چپکا ہوا ہے
...... غرض آپ اس نام نہاد مسلم سوسائٹی کا جائزہ لیں گے، تو اس میں
آپ کو بھانت بھانت کا مسلمان نظر آئے گا۔ مسلمان کی اتنی قسمیں ملیں گی کہ
آپ شمار نہ کر سکیں گے۔ یہ ایک چڑیا گھر ہے جس میں چیل، کوّے، گدھ، بٹیر،
تیتر اور ہزاروں قسم کے جانور جمع ہیں اور ان میں سے ہر ایک "چڑیا"
ہے، کیوں کہ چڑیا گھر میں داخل ہے۔"

(سیاسی کشمکش حصّہ سوم، ص ۲۵، ۲۶)

"پھر لطف یہ ہے کہ یہ لوگ اسلام سے انحراف کرنے ہی پر اکتفا
نہیں کرتے، بلکہ ان کا نظریہ اب یہ ہو گیا ہے کہ مسلمان جو کچھ بھی کرے وہ
اسلامی ہے، حتیٰ کہ وہ اگر اسلام سے بغاوت کرے تو وہ اسلامی بغاوت
ہے، یہ (سودی) بینک کھولیں، تو اس کا نام اسلامی بینک[1] ہو گا، یہ

---

[1] واضح رہے کہ آج کی معاشیاتی اور مالیاتی ضروریات کے لحاظ سے مولانا مودودی بنکنگ کے قائل ہیں، مگر وہ اس کا سود کے سسٹم پر چلنا خلافِ اسلام مانتے ہیں۔ اور اسے ایک دوسرے طرز پر قائم کرنے کی ضرورت کا احساس دلاتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی کتاب "سود" میں تفصیلات ملاحظہ فرمائیں۔

انشورنس کمپنیاں قائم کریں گے، تو وہ اسلامی انشورنس کمپنی ہوگی، یہ جاہلیّت (غیر اسلام) کی تعلیم کا ادارہ کھولیں تو وہ یونیورسٹی، اسلامیہ کالج یا اسلامیّہ اسکول ہوگا۔ ان کی کافرانہ، ریاست (یعنی اسلام کے خلاف کسی دوسرے اصول اور نظریے پر چلنے والی ریاست) کو اسلامی ریاست کے نام سے موسوم کیا جائے گا۔ ان کے فرعون اور نمرود اسلامی بادشاہ کے نام سے یاد کیے جائیں گے۔ ان کی جاہلانہ زندگی اسلامی تہذیب و تمدّن قرار دی جائے گی ان کی موسیقی، مصوّری اور بُت تراشی کو اسلامی آرٹ کے معزّز لقب سے ملقّب کیا جائے گا۔ ان کے زندقے اور اوہام لاطائل کو اسلامی فلسفہ کہا جائے گا، حتّٰی کہ یہ سوشلسٹ بھی ہو جائیں تو مسلم سوشلسٹ کے نام سے پکارے جائیں گے۔ ان سارے ناموں سے آپ آشنا ہو چکے ہیں، اب صرف اتنی کسر باقی ہے کہ اسلامی شراب خانے، اسلامی قحبہ خانے اور اسلامی قمار خانے جیسی اصطلاحوں سے آپ کا تعارف شروع ہو جائے مسلمانوں کے طرزِ عمل نے اسلام کے لفظ کو اتنا بے معنی کر دیا ہے کہ ایک کافرانہ چیز کو اسلامی کفر یا اسلامی معصیّت کے نام سے موسوم کرنے میں اب کسی کو تناقض فی الاصطلاح CONTRADICTION IN TERM کا شبہ تک نہیں ہوتا حالاں کہ اگر کسی دکان پر آپ "سبزی خوروں کی دُکانِ گوشت" یا "ولایتی سودیشی بھنڈار"، کا بورڈ لگا دیکھیں، یا کسی عمارت کا نام "موحّدین کا بُت خانہ"، سنیں تو شاید آپ سے ہنسی ضبط نہ ہو سکے۔"

(سیاسی کشمکش حصّہ سوم، ص ۲۶)

میں مسلمان صرف اس وقت ہوں جب تک زندگی کے ہر معاملے میں اسلامی نظریہ رکھتا ہوں جب میں اس نظریہ سے ہٹ گیا اور دوسرے نظریہ کی طرف چلا گیا تو میری جانب سے یہ سراسر بے شعوری ہوگی، اگر میں یہی سمجھتا رہوں کہ اس نئے مقام پر بھی مسلمان ہونیکی

حیثیت میرے ساتھ لگی چلی آئی ہے۔ مسلمان ہوتے ہوئے غیر اسلامی نظریہ اختیار کرنا صریح بے معنیٰ بات ہے۔ "مسلمان نیشنلسٹ" اور "مسلمان کمیونسٹ" ایسی ہی متناقض اصطلاحیں ہیں۔ جیسے "کمیونسٹ فاشسٹ"، یا "جینی قصائی"، یا "اشتراکی مہاجن"، یا "موحّد بُت پرست۔" (مسئلہ قومیت ص۹۸)

مودودی کی یہ وہ تحریریں ہیں جنھوں نے مسلم نوجوانوں کے اندر ان کی سوئی ہوئی خودی اور ان کے جمود زدہ احساس کو ٹھوکے لگا کر جگا دیا ہے، ان کو اپنے تشخص کا شعور دیا ہے، ان کو اس اصل فساد سے آگاہ کر دیا ہے جس سے مسلم سوسائٹی اور مسلم فکر دوچار ہے۔ ان کو فکر و عمل کے وہ راستے دکھائے ہیں جن پر چل کر وہ نوعِ انسانی کے ارتقا میں مؤثر حصّہ ادا کرنے والی اور تاریخ بنانے والی ایک نظریاتی و تحریکی طاقت بن سکتے ہیں۔

فکری استقلال کا داعی

اسلامی فکر کو مسلم نیشنلزم سے الگ کر کے اور تضادوں کے گھناؤنے داغوں سے پاک کر کے مولانا مودودی نے ایسے دَور میں پیش کیا ہے جو پوری دنیا میں نظریاتی اور فکری اور تہذیبی کشمکش کا ایک دور تھا۔ اشتراکیّت اور فسطائیت اور جمہوریت کے مختلف تصوّرات مشرق و مغرب میں باہم آویزاں تھے، تاریخ کے سمندر میں مختلف سمتوں سے لہریں اٹھ اٹھ کر ٹکرا رہی تھیں، اور نئے نئے بھنور بن رہے تھے اور ان بھنوروں سے پھر نئی لہروں کے دائرے پھیل رہے تھے۔ ہر فکر اور تحریک اپنے راستے نکالنے اور دنیا کو مفتوح کرنے کے لیے زور کر رہی تھی۔ فکروں اور تحریکوں کے یہ ریلے مشرقی اقوام، بالخصوص مسلمانوں کے ذہنوں سے بھی آ آ کر ٹکرا رہے تھے، بدقسمتی سے جدید مادّہ پرستانہ تہذیب و فکر جو مختلف ریلے پیدا کر رہی تھی، ہمارے ہاں مغربی قوموں کے سیاسی تسلّط اور امپریلزم کے جلو میں آئی ہے۔ ہم اس سے ہر جگہ غلامی اور بے بسی اور پسماندگی کی حالت میں دوچار ہوئے ہیں۔ ہر جگہ ہم نے اس کا چیلنج انتہائی زوال کے گڑھے میں گرنے کے بعد سُنا ہے اور کہیں بھی ٹکر برابر سرابر کی نہیں تھی، چنانچہ

سیاسی شکست کے ساتھ ہی ساتھ ہماری ذہنی شکست کا آغاز ہو گیا۔ غنیمت بس یہ تھا کہ معرکۂ کشمکش کسی نہ کسی درجے میں جاری رہا۔ ایک سخت جان عنصر شروع ہی سے ہمارے اندر ایسا موجود تھا جس نے زمانے کی ہوا کے حوالے ہو جانے والوں کے بالمقابل زمانہ کے دھارے کے خلاف تیرنے کی جسارت کردی، اس کے ساتھ امپریلزم اور بیرونی اقتدار کے خلاف روزافزوں نفرت بھی معاون ہوئی، مگر جدید فکر و تہذیب کی یلغار بڑی سخت تھی۔ اس کے مقابلے میں دلوں اور دماغوں نے سپر ڈال دی۔ اس کے سامنے نگاہِ تنقید ایسی جھکی کہ بالکل زمین میں گڑ کر رہ گئی۔ ایک طرف تعلیم کا تیزاب تھا جو فولاد کی خودی کو بھی گھلائے دے رہا تھا، دوسری طرف لٹریچر کا سیلاب تھا۔ جو سروں سے اونچا ہو کے بہہ رہا تھا، تیسری طرف سائنس کی ترقیات کے ہوش رُبا شعبدے تھے جو ہوش اُڑا رہے تھے، چوتھی طرف ایک نیا کلچر تھا جس کی شانِ دل رُبائی بُری طرح رِجھا رہی تھی۔ پانچویں جانب مادّی طاقت کے وہ دل دہلا دینے والے مظاہر تھے جن سے بھونچال آ رہا تھا۔ ان موثرات کے اندر گھر جانے پر ہمارے اُوپر وہ مرعوبیت چھائی کہ ہم نے اپنے چشم و گوش سے دیکھنا، سُننا اور اپنے دماغوں سے سوچنا بالکل چھوڑ دیا، اپنے نظریات کے بارے میں ہم شک میں پڑ گئے، اپنے دین سے ہمیں عار آنے لگی، اپنے سرمایۂ روایات و اقدار نے ہماری نگاہوں میں قیمت کھو دی، جیسے ہم اپنی بنیادوں سے بالکل اُکھڑ گئے اور ہوا کے جھونکوں پر اُڑنے والے تنکے بن گئے۔ ہم نے مرعوبیّت کے اس طلسم میں سمجھا کہ ترقی، خیر، فلاح اور سچّائی وہ ہے جو یورپ سے آئے ہم نے ذہنی غلامی کے اس سحر میں مبتلا ہو کر یہ مستقل تاثر لے لیا کہ یورپ کی نئی زندگی ایک بالکل بے عیب زندگی ہے۔ ہم نے غیر شعوری رائے یہ قائم کرلی کہ جس کے پاس طاقت ہے اسکے نظریات بھی برحق ہیں۔ اس عالم میں ہمارے مذہبی حلقوں نے بلا شبہ مدافعت کی سعی جاری رکھی ہے، لیکن زمانہ انھیں پیچھے چھوڑتا جا رہا تھا۔ اچانک اقبالؒ ہمارے ملّی محاذ پر اُبھرا ہمارے عالمِ افکار کا یہ شاہین، یہ عقاب چونکہ اُس علم سے خود آراستہ، اس فکر کا راز داں اور اس تہذیب کا خود غوّاص تھا جس سے معرکہ دربپش تھا، اس لیے جب اُس نے

آکر مورچہ سنبھالا اور دورِ حاضر کے خلاف "اعلانِ جنگ" کر دیا تو کشمکش کا پانسہ پلٹنے لگا نوجوان نسل کے جذبات نے بالکل نئی کروٹ لی، اور ملّی شعور ایک نیا موڑ مُڑ گیا، اقبالؒ کے کام سے آگے کی مُہم کو مودودی نے سنبھال لیا۔ اس نے تفصیل سے جدید افکار، جدید تہذیب اور جدید نظاموں پر تنقید کی اور براہِ راست اس سیلاب کو سمجھکر تنقید کی۔ مسلمانوں کی اس تاریخی حالت کا تجزیہ کر کے ان کے سامنے رکھا جس کے زیرِ اثر وہ ایک خاص طرح کی محکومانہ نفسیّات کا شکار ہورہے تھے، پھر مثبت طور پر اسلامی آئیڈیالوجی اور نظام کے ایک ایک پہلو کی قدر و قیمت کو ان پر واضح کیا، اور اسی سائنٹفک معیارِ استدلال سے واضح کیا جو اس دور کا معیار تھا۔ اس مہم کے نتیجے میں "احساسِ کہتری" کا رتوندا اور بقولِ مودودی "یرقانِ ابیض" اُن کی آنکھوں سے دُور ہوا۔ انھوں نے نگاہیں اٹھا کر از سرِ نو جو غور کیا تو وہ اپنے آپ کو از سرِ نوجان کر حیرت میں رہ گئے ہیں، کہ ہم یہ کچھ ہیں!!

مودودی دیکھ رہا تھا کہ آزادی کی تحریک اُٹھ رہی ہے، انقلاب آنے والا ہے اگر ٹھیک وقت پر مسلمانوں کو فکری مرعوبیّت اور احساسِ کہتری اور ذہنی غلامی اور مغرب کی اندھی تقلید سے نہ نکال لیا گیا تو انقلاب آجانے کے بعد تعمیر تو بالکل غلط نقشے پر شروع ہو جائے گی، اور پھر سالہا سال تک نہ تو قوم کو اپنی ملّی خودی کو زندہ کر کے اپنی دنیا آپ بنانے کی توفیق ملے گی اور نہ خود اسلام ہی کے اٹھنے کا کوئی امکان باقی رہے گا۔ اس لیے اس نے اس کشمکش میں مسلمانوں کی ذہنی اسلحہ بندی کے لیے پوری پوری محنت و کاوش صرف کی ـــــ اس محنت و کاوش کے نتائج یوں تو مودودی کی ایک ایک سطر میں گھلے ہوئے ہیں، لیکن خصوصیّت سے جو کتاب خاص اسی کشمکش کے زیرِ اثر لکھی گئی ہے "وہ تنقیحات" ہے، تنقیحات وہ مربوط مجموعۂ مقالات ہے جو ان تمام سوالات اور اعتراضات اور ان تمام شکوک اور غلط فہمیوں پر بحث کرتا ہے جن سے مسلمان دوچار تھے۔

مودودی وہ شخص ہے جس نے نظریات کے میدان میں ہم کو دوسروں کا

بھکاری بنے دیکھا اور ہمارا ہاتھ پکڑ کے وہ ہمیں اپنے گھر کے ان قیمتی خزانوں تک لے آیا جن کو ہم فراموش کر چکے تھے، یا جن کی قدر و قیمت ہماری نگاہوں میں ختم ہو رہی تھی۔ اب ہم محسوس کرتے ہیں کہ اپنی ہی زندگی کا نہیں، اپنی ہی ترقی کا نہیں، اپنی ہی فلاح کا نہیں ساری نوعِ انسانی کی زندگی اور ترقی اور فلاح کا سر و سامان ہمارے اپنے پاس ہے۔

اب ہم نہ سرمایہ دارانہ نظام کے در کے بھکاری ہیں، نہ اشتراکی فکر و تمدّن کی بارگاہ کے سائل، بلکہ اب ہم کسی سے لینے کے بجائے دوسروں کو وہ کچھ دینے والے ہیں جو انکے پاس نہیں ہے۔ اب ہمیں وہ مقام ملا ہے جس پر آئے بغیر کوئی گروہِ انسانی ترقی اور فتوحات کے دروازے اپنے لیے کھول نہیں سکتا۔ اب ہمیں اُس "سم سم" کی کنجی ہاتھ آئی ہے جس سے ہم ایک نئی دنیا کے تالے کھول سکتے ہیں۔ اب ہم خود شناس ہیں۔ اب ہماری آنکھوں میں نگاہِ تنقید کی نئی چمک ہے۔ اب ہم اپنے دین کے بارے میں کسی احساسِ کہتری میں مبتلا نہیں ہیں بلکہ اُلٹا ایک فخر اور ایک برتری کا احساس اپنے اندر پاتے ہیں۔ اب ہمارا اندازِ گفتگو معذرت خواہانہ APOLOGETIC نہیں رہا۔ بلکہ داعیانہ ہے۔

ذہن کا حسنِ ترتیب

بہت سے وہ لوگ ہمارے اندر موجود ہیں جو معلومات کے سمندر کے سمندر دماغ میں اُتار جاتے ہیں۔ جن کا مطالعہ غیر معمولی حد تک وسیع ہوتا ہے، لیکن زندگی کی کوئی ایک گرہ سلجھا نہیں سکتے، اور کسی ایک مسئلے کے صحیح حل کا راستہ نہیں نکال سکتے۔ کتابیں لکھتے ہیں اور بے حساب لکھتے ہیں، مقالات نگاری کرتے ہیں اور بڑے بڑے اُونچے معیار پر کرتے ہیں، اخبار نویسی کرتے ہیں اور زوردار طریقے سے کرتے ہیں، لیکن زندگی جن الجھنوں میں گھری ہے، دماغ جن پیچیدگیوں میں مبتلا ہیں، خیالات جس طرح متصادم ہیں، مسائل جس طرح پیچ در پیچ ہیں، ان کے برسوں کے کارناموں کے بعد بھی سب کچھ جوں کا توں رہتا ہے اور کوئی ایک گرہ وہ نہیں کھول سکتے، بلکہ اُلٹا سینکڑوں گرہیں ڈال کے رخصت ہوتے ہیں۔ جس انتشار کے سمندر میں سوسائٹی غوطے کھا رہی ہوتی

ہے ان کے کارنامے اس کی طوفان خیزیوں میں کچھ اضافہ ہی کرتے ہیں کمی نہیں کر سکتے۔ وجہ کیا ہے؟

وجہ یہ ہے کہ وہ نہ اپنے ذہن کا جائزہ لیکر اسے منظّم کر سکتے ہیں، نہ حاصل شدہ معلومات اور ذخیرۂ علم کو اس میں کسی اچھّی ترتیب سے رکھ سکتے ہیں، نہ کسی مسئلے، کسی بحث، کسی سوال، کسی حالت، کسی کشمکش، کسی تاریخی دَور، کسی تحریک اور کسی تہذیب کا صحیح تجزیہ کر کے اس پر مترتب طریق سے غور و فکر کر سکتے ہیں۔ ان کا اپنا ذہن ایک کباڑخانہ ہوتا ہے جس میں کیل، پُرزے، بوتلیں، کپڑے، برتن، لمپ، ہیرے موتی سبھی طرح کی چیزیں بے ڈھب طریقے سے بکھری ہوتی ہیں۔ اس غیر مرتّب اور غیر منظّم ذہن کے ساتھ وہ مسائل و حالات کا کبھی صحیح تجزیہ نہیں کر سکتے، بلکہ انتشار سے چلتے ہیں اور سارا راستہ اپنی بے شمار قیمتی معلومات اور بے شمار لایعنی مزخرفات کو بکھیرتے ہوئے ایک خطرناک انتشار پر جا کے سفر ختم کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے لوگ معلوماتی مواد کے سرمایہ دار ہونے کے باوجود کبھی "مفکر" نہیں بن سکتے۔

مودودی کو مفکّرانہ مرتبے پر لانے والی ایک خصوصیّت اس کا یہی منظم اور مرتّب ذہن ہے۔ عملی تجربات و مشاہدات، کتابی مطالعے اور ذاتی غور و تفکر سے وہ جو موادِ معلومات بھی حاصل کرتا ہے، وہ بہترین سارٹنگ کے ساتھ اس کے ذہن میں جگہ پاتا ہے۔ اس منظّم اور مرتّب ذہن کے ساتھ جب وہ کوئی کام کرنے لگتا ہے تو اس کا سب سے بڑا کمال ماہرانہ تجزیہ ہے۔ وہ معاشرے کو لے گا تو اس کے عناصر کا تفصیلی تجزیہ کریگا وہ کسی بحث میں حصّہ لے گا، تو پہلے موضوعِ بحث اور میدان بحث کا تجزیہ کرے گا۔ وہ کسی فکر و نظام پر بات کرے گا، تو بات کرنے سے پہلے اس کا تجزیہ کرے گا، وہ کسی سوال سے دوچار ہوگا، تو سوال اور اسے پیدا کرنے والے ذہن کا تجزیہ کریگا، وہ کسی سے مخاطب ہوگا، تو اس کی نفسیاتی کیفیّت کا تجزیہ کرے گا، وہ کام کرنے کے لیے کوئی پروگرام اختیار کرے گا تو لازماً اس پروگرام کا تجزیہ کر کے اس کے ایک ایک حصّے کے لیے منصوبہ بندی کرے گا۔ ہمارا معاشرہ جس پست ذہنی سطح پر ہے اور

جس طرح فکری کشمکش سے دوچار ہے اور جو ذہنی انتشار اس میں شائع و ذائع ہے اس کی وجہ سے جو سوال پیدا ہوتے ہیں پہلے تو وہ خود الجھ جاتے ہیں، پھر ان کے جو جواب دیے جاتے ہیں وہ سوال سے زیادہ الجھ کر سامنے آتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ وہ سوال تو لاینحل ہو کے رہ گیا، کچھ دوسرے سوال اٹھ کھڑے ہوئے اور وہ پہلے سے بھی زیادہ الجھے ہوئے نکلے۔

مودودی کے لٹریچر کو پڑھیے، اس کے خطوط کو دیکھیے، اس کی تقاریر سُنیے ہر جگہ آپ کو حالات اور مسائل کے ایسے تجزیے کے آثار ملیں گے جن کے تحت ایک ایک بات بالکل اپنی فطری ترتیب میں آئے گی اور سلسلۂ خیالات کی ہر کڑی کا ربط دوسری کڑی سے منطقی قسم کا ہوگا۔ وہ اپنے خیالات کا سفر کبھی بھی منحنی خطوط پر نہیں کرتا، بلکہ پہلے نقطۂ آغاز کو اور غایتِ آخر کو قطعی یقین سے سامنے رکھ لیتا ہے۔ پھر ایک ایک قدم بالکل خطِ مستقیم میں رکھتا ہوا اپنا سفر ختم کرتا ہے۔ یہ راست فکری STRAIGHT THINKING اور راست کلامی اس کا ایک بڑا ہی قیمتی کمال ہے جس کے بغیر وہ عالم تو ہو سکتا تھا، مفکر نہیں ہو سکتا تھا۔

مودودی کی یہ وہ خصوصیّت ہے کہ اس کے لٹریچر کو کچھ عرصہ تک پڑھنے والے لوگ بھی اس سے اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

مودودی ایک وسطی مقام پر

اب مجھے اس کے مفکرانہ مقام کے بارے میں صرف ایک پہلو اور واضح کرنا ہے۔ تاریخی شخصیّتوں میں دیکھنے کی ایک چیز یہ ہوتی ہے کہ تاریخی حالات اور معاشرے کے مختلف عناصر کے اندر وہ کونسی پوزیشن لیتے ہیں۔ اس لحاظ سے مودودی کا مقام بڑا ہی اہم ہے۔ ہماری سوسائٹی نظریات اور کلچر کے لحاظ سے دو حصّوں میں بُری طرح بٹ رہی تھی۔ ایک طرف مذہبی عناصر تھے جو زندگی کے نظام سے بے تعلّق ہو کر فسادِ ماحول کے خلاف ایک منفعلانہ اور منفی قسم کی جدّوجہد میں مصروف تھے۔ دوسری طرف

جدید طبقہ تھا جو اسلام سے باغی ہو کر نہیں، تو کم سے کم بے نیاز ہو کر زندگی کے اجتماعی نظام کو اندھا دُھند چلائے جا رہا تھا، وہ لوگ زندگی کی گاڑی کو اسلامی نصبُ العین کی طرف لے جانے کا راستہ جانتے تھے، مگر اس کی ڈرائیونگ کا ان کو عملی تجربہ نہیں رہا تھا۔ یہ گاڑی چلانا جانتے تھے، مگر راستہ بھول چکے تھے۔ ایک کو دین کی حقیقتوں کا علم تھا، مگر جدید حالات اور جدید نظریات سے بے ربطی تھی۔ دوسرے کو جدید حالات و نظریات کی مہارت تھی، مگر دین کا ماہرانہ علم نہیں تھا، انگریزی استیلاء نے پہلے تو دونوں کو دین وسیاست کی تفریق کے نظریے پر کام کر کے باہم دگر پھاڑ دیا اور پھر آہستہ آہستہ ان کو حریف بنا ڈالا۔ دونوں کے درمیان ایک دوسرے سے لین دین کا سلسلہ ختم ہو گیا اُلٹا تنفّر اور کھینچا تانی کی کیفیّت پیدا ہو گئی۔ ادھر یہ دعویٰ کہ دین کا ہم علم رکھتے ہیں تم کو ہماری رہنمائی ماننی چاہیے۔ اُدھر سے یہ مطالبہ کہ زندگی کا جو نیا نظام ہم اپنے روشن دماغوں سے چلا رہے ہیں اس دَور میں یہی ذریعۂ ترقی ہے، لہٰذا دین کو بھی اگر رہنا ہے تو اپنے آپ کو اس سے ہم آہنگ کر لے۔ اس کھینچا تانی نے آہستہ آہستہ دونوں اہم عناصر کے درمیان طبقاتی بُعد پیدا کرنا شروع کیا۔ تعلیمی مراکز الگ ہو گئے، تنظیمی ہیئتیں الگ الگ ہو گئیں، لباس اور کلچر الگ الگ ہو گئے، بولیاں اور دلچسپیاں الگ الگ ہو گئیں، مسائل اور سرگرمیاں الگ الگ ہو گئیں، یعنی بجائے اس کے کہ معاشرہ اپنی ساری طاقت جمع کر کے ناپسندیدہ حالات اور بیرونی اثرات سے کشمکش کرنے اور کسی صحیح نقشے پر تعمیرِ نو کرنے کی تیاریاں کرے، اُلٹا اس کی دو قیمتی طاقتیں کہ جن میں سے ہر ایک کسی نہ کسی ضروری صلاحیّت سے آراستہ تھی، آپس میں معرکہ آرا ہوتی نظر آئیں۔ دونوں طرف ایک نہ ایک قسم کی کوتاہیاں موجود تھیں۔ اور دونوں طرف کسی نہ کسی طرح کی انتہا پسندیاں کارفرما تھیں۔ حد یہ ہے کہ ان کے ہاں مولوی کا لفظ گالی بنا دیا گیا اور ان کے ہاں مسٹر کا لفظ ملاحی بن گیا۔ زوال اور غلامی میں مبتلا ہونے والی قوموں کو ایسے تباہ کن حالات سے گزرنا ہی پڑتا ہے۔

لیکن مودودی وہ پہلا شخص ہے جس نے وہ خطِ اعتدال فراہم کر دیا جس پر

دونوں طرف کے لوگ آکر شانہ بشانہ کھڑے ہوں اور تاریخ سازی میں اپنا حصّہ ادا کرسکیں۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ مودودی دونوں طرف کے علوم[1] سے بہرہ اندوز تھا۔ دونوں طبقوں کو دیکھ بھال کے آرہا تھا۔ دونوں کی خوبیاں اور دونوں کی کمزوریاں اور دونوں کا جوہرِ مشترک اس کے سامنے واضح تھا، چنانچہ خود اپنے بارے میں اسی کے الفاظ دیکھیے:

"فاضل تنقید[2] نگار اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ میں گروہِ علمار میں سے ہوں اور مولوی ہونے کی حیثیت سے جدید تعلیم اور جدید تعلیم یافتہ گروہ پر حملہ کررہا ہوں، لیکن ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ مجھے گروہِ علمار میں شامل ہونے کا شرف حاصل نہیں ہے۔ میں ایک بیچ کی راس کا آدمی ہوں، جس نے جدید اور قدیم دونوں طریقہ ہائے تعلیم سے کچھ کچھ پایا ہے۔ اور دونوں کوچوں کو خوب چل پھر کر دیکھا ہے۔ اپنی بصیرت کی بنا پر نہ تو میں قدیم گروہ کو سراپا خیر سمجھتا ہوں اور نہ جدید گروہ کو، دونوں کی خامیوں پر میں نے آزادی کے ساتھ تنقید کی ہے، اس لیے میرا کوئی خاص رشتہ کسی گروہ سے نہیں ہے۔"

(ترجمانُ القرآن جلد ۱۴ عدد ۳، صفحہ ۲۲۷)

یعنی مولانا مودودی نے دونوں گروہوں کی طبقاتی پوزیشن میں سے کسی کو قبول نہیں کیا۔ دونوں کے بیچ میں ایک مقام پر کھڑے ہو کر دونوں پر ضروری تنقید

---

[1] جو لوگ مولانا مودودی کو گالی دینے کے لیے "مُلاّ" کہتے ہیں ان میں سے اکثر کو شاید انگریزی زبان کی اتنی کتابیں سرسری نظر سے دیکھنے کا بھی موقع نہ ملا ہو گا جو اس شخص کی لائبریری میں ہیں اور جن میں بے شمار صفحات پر اس کے نشانات اور حاشیے لگے ہوئے ہیں۔

[2] مراد ہیں خان بہادر نواب ذکاء اللہ مرحوم جنھوں نے سیاسی کشمکش کے مباحث پر مسلسل تنقیدیں لکھی ہیں۔

کی ہے۔ دونوں کے اندر جو پہلو کام کے ہیں ان کی اہمیّت واضح کی ہے، جو کمزوریاں ہیں ان کو بے نقاب کیا ہے، اور پھر دونوں کے سامنے اپنی دعوت اس طرح رکھی ہے کہ اس میں کچھ وجوہِ جاذبیّت اُدھر والوں کے لیے ہیں، کچھ اِدھر والوں کے لیے۔ مثلاً مولینا مودودی اصُول تو اسلام سے لینا چاہتے ہیں اور اس میں اٹل ہو کر بات کرتے ہیں۔ لیکن دوسری طرف اس اصول پر کام کرنے کے لیے اجتہادی نقطۂ نظر کو لازم قرار دیتے ہیں۔ وہ نظریۂ زندگی تو سو فیصدا سلامی رکھتے ہیں، لیکن عملاً زندگی کا نظام بنانے میں وہ جدید ذرائع و وسائل، ادارات کی جدید اشکال اور ڈھانچوں، نئے دور کی علمی ترقیوں سب سے کام لینا ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ جدید علوم سے استفادہ ضروری قرار دیتے ہیں، مگر یہ ضرور چاہتے ہیں کہ ان کے مرکزی نظریے کو ہٹا کر اس کی جگہ اسلامی نظریہ رکھ دیا جائے۔ وہ دعوت تو جوں کی توں وہی لیتے ہیں جو قدیم سے قدیم انبیاء سے لے کر اب تک ایک ہی رہی ہے، مگر اسے پیش کرنے کے لیے جدید انداز، جدید اسلوب، جدید زبان اور جدید پیرایوں کا اختیار کرنا لازمی مانتے ہیں۔ وہ قانون کے اصول شریعتِ اسلامیّہ ہی سے لینا چاہتے ہیں، مگر دوسری طرف پچھلے دَور کی طے شدہ فقہی جُزئیات کو ان اصولوں کے ساتھ دوامی شریعت کی حیثیت دینے پر تیار نہیں ہیں۔ وہ دستور کے لیے آئیڈیالوجی تو بلا آمیزش خدا اور رسولؐ سے لیتے ہیں، لیکن اس کے کام کرنے کے لیے جدید حالات کے تقاضوں کے مطابق کوئی سا موزوں خارجی ڈھانچہ مرتّب کر لینے کے حق میں ہیں۔

ایک وسطی مقام سے مولانا نے اپنی دعوت دونوں عناصر کو یکساں پیش کی ہے اور دونوں سے کام کے آدمی حاصل کیے ہیں، مگر ان کا عملی تجربہ یہ ہے کہ انکی دعوت پر لبیّک کہنے، اس کے سانچے میں کردار کو ڈھالنے اور اس کے لیے جدّوجہد کرنے کے لحاظ سے جدید طبقہ نے بہت زیادہ اور بہت کام کے آدمی فراہم کیے ہیں۔ چنانچہ اب بھی نوجوان طلبہ کے حلقوں میں یہ دعوت جس طرح اپنے راستے تیزی سے بنا رہی ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یا تو اس دعوت میں جدید طبقے کے لیے اپیل نسبتاً زیادہ ہے، یا جدید طبقے میں کام کرنے کی صلاحیت زیادہ ہے۔ غالباً یہ دونوں ہی باتیں ہیں۔

مودودی دنیا کے ان خوش نصیب مفکرّوں میں سے ہے جن کی فکر ان کی زندگی میں عملی تحریک کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ اس میں تاریخی احوال کے عمل کا بھی بڑا اثر ہے اور اس کاوش اور جدّوجہد کا بھی بڑا حصّہ ہے جو مولانا مودودی نے سالہا سال صبر اور بے لوث اخلاص کے ساتھ حالات پر اثر انداز ہونے کے لیے صرف کی ہے۔ آج جب کہ مودودی کا فکر ایک کتابی دعوت کے درجے سے بلند ہوکر ایک وسیع تحریک کی شکل میں کام کررہا ہے، مودودی کی اپنی اہم اور قیمتی شخصیّت اس تحریک کے ہوتے ہوئے ثانوی مقام پر چلی گئی ہے۔ اب اصل چیز یہ تحریک ہے اور مودودی اس کا کارکنُ ہے ـــــــ چاہے کسی بھی درجے کا کارکنُ ہو۔!

اس مودودی کے بارے میں جو لوگ کسی سیاسی اور جُزئی معاملے میں اس کی رائے یا تقریر ـــــــ وہ بھی متعصّب اخبار نویسوں کی مسخ کردہ ـــــــ پڑھ کر ایک مستقل رائے قائم فرمالیتے ہیں اور پھر اسی رائے کی عینک لگاکر آئندہ کی ہر چیز کو دیکھتے چلے جاتے ہیں، کاش کہ انھیں بتایا جاسکتا کہ ایسی شخصیّتوں کے بارے میں رائے قائم کرنے کا طریقہ یہ نہیں ہوتا۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن سے اختلاف کرنے والے بھی ان کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، ان کے کام کا مطالعہ کرتے ہیں اور ان کو ملک وقوم کے لیے باعثِ عزّت سمجھتے ہیں۔

بلاکشِ وادیٔ شوق

گرفتاری ——— اور اچانک گرفتاری سے جب سامنا ہوتا ہے تو ایک صاحبِ دعوت اور صاحبِ مقصد کی سیرت کے ایسے گوشے اپنی جھلک دکھاتے ہیں جن سے اس کے قریب ترین ساتھی بھی پہلے کبھی پوری طرح واقف نہیں ہو سکتے۔ ایک ادنیٰ درجے کے آدمی کی وہ کمزوریاں اس وقت بے نقاب ہوتی ہیں جن سے وہ خود بھی پوری طرح آگاہ نہیں ہوتا۔ اور اونچے درجے کے مردانِ کار کی شخصیّتوں کی عظمت کے ایسے پہلو دکھائی دے جاتے ہیں، جو ان کی قدر و قیمت کو چار چاند لگا دیتے ہیں۔

وہبی شخصیّت

مولانا اس نفسیاتی لمحے کی آزمائش سے جب پہلی مرتبہ (گرفتاری ۴ اکتوبر ۱۹۴۸ء) میں گزرے تھے، تو یہ واضح ہو گیا تھا کہ اس شخص کی سیرت عام حالات میں جتنی اونچی ہے آزمائش میں آکر وہ اس سے زیادہ اونچی ہو جانے والی ہے۔ اس زمانے میں حکومت کے براہِ راست اور بالواسطہ پروپیگنڈے نے، اور بعض اخبارات کے مخالفانہ محاذ اور بعض مولویوں کے فتووں اور خطبوں نے رائے عامّہ کی فضا کو اتنا مکدّر کر دیا تھا کہ دماغی سکون کو برقرار رکھنا کوئی آسان کام نہ تھا، لیکن مولانا اس طوفانی ماحول میں جس شان سے عزیمت کی چٹان بنے رہے اس نے جماعت کے ایک ایک فرد میں سچّائی پر قائم رہنے کا مضبوط جذبہ پیدا کر دیا۔ حال یہ تھا کہ مسجد کے ممبروں سے مولانا کے قتل کیے جانے کی عَلانیہ ترغیب دلائی جا رہی تھی اور سڑکوں پر چلتے پھرتے کارکن بسا اوقات یہ اندیشہ محسوس کرتے تھے کہ ہم پر کہیں بھی غنڈوں کی طرف سے حملہ ہو سکتا ہے اور ایک ایک چیز کی اطلاع لے کر ہم سب بار بار مرکز آتے تھے، لیکن مولانا سے بات کرتے ہی ساری تشویش رخصت ہو جاتی اور عزم و ہمّت کی ایک نئی لہر دوڑ جاتی

مولانا کارکنوں کی گھبراہٹ کا پَرتو قبول کرنے کے بجائے ہمیشہ ان پر اپنی عزیمت کا پرتو ڈال دینے میں کامیاب رہے۔ جب کوئی آتا تو وہ دُور ہی سے اس کے چہرے سے نفسیاتی مطالعہ کر لیتے اور سلام کا جواب دینے کے ساتھ ہی ہشّاش بشّاش چہرے کے ساتھ پوچھتے ــــ " کہیے جناب! کیا حالات ہیں؟" ــــ اور آنے والے کی جذباتی کیفیّت بات کرنے سے پہلے ہی بدل جاتی ــــ مجھے یاد ہے کہ اسی زمانے میں کسی موقع پر غالبًا اخبار کا نام لینا غیر ضروری ہے، کے نوٹ کا میں نے مولانا سے تذکرہ کیا کہ اس نے ہمارے بارے میں یہ الزام تراشی کی ہے اور یوں یوں حکومت اور عوام کو اُکسایا ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ اس کی تردید کی ضرورت نہیں۔ اس اخبار کو اپنا کام کرنے دیجیے اور صاف صاف کہیے کہ " ہم لوگ اقراری مجرم" ہیں۔ میری تشویش ختم ہو گئی، اور یہی الفاظ ایک مصرع بن کر ذہن نشین ہو گئے۔ اسی رات میں نے اپنی نظم " ہم لوگ اقراری مجرم ہیں" مکمّل کر لی۔ مجھے یاد تو نہیں، لیکن خیال ہے کہ ہمارے اس مستقل کرم فرما اخبار نے صاف صاف لفظوں میں ہمیں غدّار قرار دیا تھا، چنانچہ اسی وجہ سے ایک مصرع یوں ڈھلا: ع

یہ نگری اندھی نگری ہے، تو اے راجا! غدّار ہیں ہم

مولانا کی تلقین یہ تھی کہ مخالف سے مخالف ماحول کے خطرناک ترین گوشوں میں گھُسیئے اور پوری ہمّت کے ساتھ اپنی صحیح پوزیشن پیش کر دیجیے؛ چنانچہ کارکنوں کا یہ حال تھا کہ انھوں نے حکومت، پریس اور مولویوں کے وسیع مخالفانہ محاذ کے بالکل سامنے آ آ کر جھُوٹ کے غبار سے فضا کو صاف کرنے کی حوصلہ افزا مثالیں قائم کر دیں۔ پھر جب مولانا نے تجویز کیا کہ شہر کے عین طوفانی مرکز میں جلسے کیے جائیں اور عوام کو براہِ راست اپنے موقف سے آگاہ کیا جائے، تو پہلا آزمائشی موقع برکت علی محمڈن ہال مقرّر کیا گیا جس میں باقر خان صاحب کو صدارت کے لیے اور مجھے تقریر کے لیے بھیجا گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ حالات کی ناسازگاری میں جب ہم نکلے تو ہراس کا شائبہ تک نہ تھا بلکہ ایک بڑی بازی کھیل جانے کی اسپرٹ دلوں میں کام کر رہی تھی۔ مولانا

خود اس روز اندیشہ رکھتے تھے کہ کسی ناخوشگوار واقعہ کا امکان ہے اور ہماری واپسی تک برابر دفتر کے صحن میں موجود رہے۔ اس کے بعد شہر کے تمام حصّوں میں پے در پے چھوٹے چھوٹے جلسے کیے جانے لگے۔

اس دوران میں متعدد لوگوں نے مولانا کی گرفتاری کے امکان سے آگاہ کردیا تھا دوسری طرف ایک خطرناک تر سازش کی افواہ بھی ملی اور ہم نے چاہا کہ مولانا کسی قدر احتیاط سے کام لیں، لیکن انھوں نے ہمیشہ کی طرح کہا کہ جب تک اللہ تعالیٰ ہم سے دین کی خدمت لینا چاہتا ہے، میں اپنے لیے کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتا، اور جب اس کی طرف سے یہ مہلت ختم ہو جانے والی ہوگی، تو پھر کوئی احتیاط حفاظت کی ضمانت نہیں بن سکتی، ——— ایک روز کا واقعہ ہے کہ میں دفتر "کوثر" میں کام کر رہا تھا کہ اچانک اپنے ہی ایک نوجوان آئے اور انھوں نے علیحدگی میں مجھ سے کہا کہ مولانا کی گرفتاری کا قطعی فیصلہ ہو چکا ہے۔ میں نے یہ خبر سُن کر فوراً کام بند کردیا اور معمول کے خلاف قبل از وقت مرکز آگیا۔ دوپہر کا وقت تھا، مولانا کو دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ آرام کر رہے ہیں۔ میں نے کسی بچّے کے ذریعے کہلوایا کہ بہت ضروری پیغام دینا ہے اور مولانا جس حال میں ہوں مجھے ابھی ملنا ہے۔ اطلاع اندر گئی، دروازہ کُھلا اور مولٰینا کو میں نے مطلع کردیا۔ مولانا کے چہرے کی معمول کی جھلک میں کوئی فرق نہیں آیا جس پر مجھے یوں محسوس ہوا کہ بڑی غیر ضروری اطلاع میں نے دی ہے۔ یہ تھی اس کی شخصیّت کی عظمت!

سیفٹی ایکٹ

۴۔ اکتوبر ۴۸ء کو گلے کی شدید خرابی کی وجہ سے مجھے حرارت تھی۔ نہ میں دفتر گیا، نہ اور کہیں باہر نکلا۔ مغرب کے وقت عبدالوحید خان صاحب کے ایک عزیز آئے اور انھوں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اور مجھے بلا کر اچانک یہ خبر سُنائی کہ:

"طفیل صاحب گرفتار ہو گئے اور وہ تھانے میں ہیں اور مجھے ان کا بستر

لے جانے کے لیے بھیجا ہے۔"

جلدی میں انھوں نے یہ بھی بتایا کہ :

"تلاشی ہوئی اور مطالبۂ حق (میرا لکھا ہوا ضبط شدہ پمفلٹ) کی ایک کاپی برآمد کرکے پولیس ساتھ لے گئی ہے۔"

اب میں نکلا کہ جاکر مرکز میں اطلاع کردوں، وہاں پہنچا تو درس آخری مرحلے پر تھا۔ وہ ختم ہوا تو ڈی ایس پی صاحب جو وہاں موجود تھے انھوں نے مولانا سے علیٰحدگی میں بات کرنے کی خواہش کی اور بات ہوگئی بلکہ فوراً ہی بات کھُل گئی۔ مولانا کھانا کھانے اور تیار ہونے کے لیے اندر چلے گئے۔ ہم سب لوگوں پر اس بات کا گہرا اثر تھا کہ حکمران طاقت مسلمانوں اور ان کے ملک کے حقیقی خیرخواہ کے ساتھ بالآخر وہی ظالمانہ سلوک کرنے پر تُل گئی ہے جس کے نمونوں سے ہماری تاریخ بھری پڑی ہے۔ کچھ دیر کے بعد مولانا کا بستر آگیا، پھر کچھ وقفے کے بعد مولانا شیروانی پہنے ٹھیک اسی طرح ہشاش بشاش چہرے کے ساتھ نمودار ہوئے جیسے وہ کسی سفر پر جاتے وقت دکھائی دیتے تھے ــــ کوئی فرق نہ تھا! اور برآمدے کے کنارے پر کھڑے کھڑے انہوں نے یہ کہہ کر پان طلب کیا۔

"ڈبیہ بٹوا کہاں ہے، آخری پان کھا لیا جائے۔"

پوچھا گیا کہ آخری کیوں؟ ہنستے ہوئے فرمانے لگے :

"بس اب طلاق دے رہا ہوں۔"

پان جیسے رفیق کے بارے میں مولانا کا یہ فیصلہ سن کر میں نے پوچھا کہ کیا جیل کے بعد بھی طلاق جاری رہے گی؟ تو فرمایا :

"نہیں طلاقِ رجعی ہے، مغلّظ نہیں۔"

اس پر سیّد نقی علی صاحب اور دوسرے لوگ خوب قہقہہ لگا کر ہنسے، یوں یہ شخص ہنستے ہنساتے مصافحہ کرکے نامعلوم مدّت کی قید کے لیے مسلّح پہرے میں جیپ گاڑی کے اندر بیٹھ کر روانہ ہوگیا۔

مارشل لا

یہ سماں ذہن میں رکھتے ہوئے دوسری گرفتاری کا منظر معلوم کرنے کی جو خواہش دل میں تھی اُسے پورا کرنے کے لیے فقیر حسین صاحب سے دریافت کیا کہ مولانا کس طرح روانہ ہوئے۔ فقیر حسین صاحب سے خاص طور پر میں نے یہ بھی پوچھا کہ رات کو مولانا سے ملنے والا، یا ان کے بارے میں کچھ دریافت کرنے والا آخری شخص کون تھا۔ انھوں نے بتایا کہ ایک نوجوان طالب علم مولانا سے دیر تک ڈارون کے نظریے پر گفتگو کرتے رہے، ان کے بعد اور کوئی آدمی نہیں آیا، مولانا اندر چلے گئے اور یحیٰی صاحب اور فقیر حسین صاحب سو گئے۔ فقیر صاحب کو جب جگایا گیا تو ہر طرف روشنی ہو رہی تھی، اُٹھتے ہی ان کی نگاہ یحیٰی صاحب پر پڑی، جو جلدی جلدی اپنی ٹانگوں سے سُتلی کھول رہے تھے (ٹانگوں میں درد کی وجہ سے انھوں نے یہ انوکھی تدبیر اختیار کی تھی۔) فقیر صاحب بیان کرتے ہیں کہ میں نے پوچھا کیا معاملہ ہے؟ جواب میں یحیٰی صاحب نے دونوں ہاتھ کسی قدر اٹھا کر دبے لفظوں میں کہا: "پو... لی... س!" بہت جلد ان کو مُطّلع کر دیا گیا کہ ان کے گھر کی بھی تلاشی ہوگی اور ان کو گھر چلنا ہے۔ فقیر حسین صاحب اٹھ کر مولانا کے دفتر کی طرف جانے کے لیے نکلے، جہاں اس وقت کارروائی ہو رہی تھی، تب باہر پولیس اور فوج ہر طرف پھیلی نظر آئی۔ معًا دو آدمی اُن کے گرد ہو گئے، فقیر صاحب مولانا کے کمرے میں پہنچے تو انھوں نے دیکھا کہ چند اصحاب مولانا کی میز کے گرد بیٹھے ہیں اور تلاشی ہو رہی ہے۔ مولانا اپنی تیاری کے سلسلے میں غسل خانے سے نکلے، فقیر صاحب کہتے ہیں کہ مولانا اس سے بالکل بے نیاز تھے کہ ان کے کاغذات کے ساتھ کیا سلوک ہو رہا ہے اور کون کس حرکت میں مصروف ہے۔ فقیر صاحب کو جماعت کے خزانے کی فکر تھی، وہ چاہتے تھے کہ مولانا سے سیف کی کنجیوں کے بارے میں کوئی ہدایت حاصل کریں کہ یہ کس کی تحویل میں دی جائیں۔ لیکن غالبًا ان کے ذہن میں یہ بات تھی کہ کنجیوں کے بارے میں "اغیار" کو کچھ بھی نہ معلوم کرایا جائے، اب وہ حیران

تھے کہ مولانا سے کس طرح بات کریں۔ آخر کنجیاں دکھا کر انھوں نے محض اشارے سے سوال کیا۔ مولانا نے بغیر کسی اہتمام کے دور ہی سے کہا۔ "ان کو یحییٰ صاحب کے حوالے کر دیجیے۔" اور کنجیاں پولیس کے قبضے میں چلی گئیں بلکہ خود خزانہ بھی اور حساب کتاب کے کاغذات بھی!!

مولانا کی کیفیت وہی تھی کہ جیسے سفر پر جا رہے ہوں!

(کسے معلوم تھا کہ یہ سفر ایسا ہے کہ جس کی راہ میں پھانسی کی کوٹھڑی بھی آئیگی!!)

شاہی قلعے میں

قلعے سے تقریباً ہر روز کچھ لوگ نکال کر بورسٹل جیل لائے جاتے۔ آنے والے اس تاریخی جہنم عقوبت کی روز افزوں آبادی کے بارے میں کچھ نہ کچھ خبریں لے آتے تھے، چنانچہ یہ اطلاع مل گئی کہ مولانا مودودی بھی قلعے میں ہیں۔

مولانا اصلاحی، چراغ دین، فقیر حسین، عبدالوحید خاں قلعے سے واپس پہنچے اور اپنی اپنی سرگزشت بیان کی، یاد نہیں، ان میں سے کس نے بتایا کہ کہیں آتے جاتے ان کی نگاہ بھی مولانا پر پڑی ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ ان حضرات کی کوٹھڑیوں سے اوپر کسی کمرے میں رکھے گئے تھے۔ یہ بھی بتایا گیا کہ گھر کے لوگوں کو ان سے ملاقات کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ نیز ان کو کوئی سامانِ مطالعہ حتیٰ کہ قرآن بھی نہیں دیا گیا۔

سنٹرل جیل

یہ تو محفوظ نہیں رہا کہ مولانا کس تاریخ کو سنٹرل جیل لائے گئے، وہ بہرحال ہمارے بورسٹل جیل سے سنٹرل جیل لے جائے جانے سے پہلے پہنچ چکے تھے، اس کی اطلاع ہمیں بورسٹل جیل ہی میں مل چکی تھی، غالباً ۴ / اپریل کے لگ بھگ مولانا قلعے سے باہر لائے گئے۔ گھنٹی گھر کے میدان میں اندراجات ہو جانے کے بعد ہمارے لیے جب سیاست[1] خانہ الاٹ ہوا تو اصلاحی صاحب کو بتایا گیا کہ انھیں دیوانی[2] گھر جانا ہے جہاں مولانا مودودی

---

[1] [2] سنٹرل جیل کے دو احاطوں کے نام۔

پہلے سے ہیں، چنانچہ پہلے اصلاحی صاحب نمبردار کی معیّت میں ہم سے رخصت ہوئے اور اس وقت وہ ایک شدید تاثّر میں تھے۔ "اچھا رفیقو! خدا تم سب کا نگہبان ہو" یہ کہا اور مصافحہ کر کے چلے گئے۔

غالباً اسی رات کی تاریکی میں آتے جاتے وارڈوں نے مولانا کی خیر و عافیت سے آگاہ کیا۔ اور اگر کوئی واسطہ نہ بھی ہوتا تو خدا کے فرشتے تو تھے جو ہماری طرف سے سلامتی کی دعائیں اُدھر پہنچاتے تھے، اور اُدھر سے محبّت کے پیام اِدھر لاتے تھے۔

اور یہ بھی معلوم ہوا کہ مولانا کو بالکل ہماری طرح "سی کلاس" دی گئی ہے۔ ہمیں تو خیر "زیڈ" کلاس بھی دے دی جاتی، تو ہمارے ملک کی حکومتِ عالیہ کو احساس نہ کرنا چاہیے تھا، لیکن مولانا مودودی کو "سی کلاس" دے کر جس انتقامی پستی کا ثبوت دیا گیا وہ جمہوریت کے دامن پر شرمناک داغ ہے۔ مودودی ایک تحریک کا رہنما ہی نہیں، ایک نئے دورِ تاریخ کا افتتاح کرنے والا تاریخ ساز بھی ہے۔ وہ "الجہاد فی الاسلام" تنقیحات، پردہ، اور تفہیم القرآن جیسی اُونچی تصانیف کا مصنف ہی نہیں، نئی نسل کے ذہن و کردار کا معمار بھی ہے، وہ زندگی بخش نظریات و خیالات کو عملاً غیر اسلام سے ٹکرا دینے والا بھی ہے۔ وہ صرف پاکستان ہی کے لیے سرمایۂ فخر نہیں، ساری دنیا میں اس سے دلچسپی لینے والے پھیلے ہوئے ہیں۔

کیا اسے "سی کلاس" میں رکھ کر تم اس کا ایمان بدل سکتے ہو؟ تم اس کی عظمت کو اس سے چھین سکتے ہو؟ تم اس کی عزّت میں کوئی کمی پیدا کر سکتے ہو؟ تم اس کے تاریخی مقام کو اس سے سلب کر سکتے ہو؟ تم اس کی قدر کرنے والوں کی تعداد گھٹا سکتے ہو؟

مارشل لا کے تمام حوالاتیوں کو "گھنٹی گھر"[1] طلب کیا گیا، ہم بھی بلائے گئے۔ اس مرتبہ ملٹری کے سامنے پیشی تھی۔ ہم جب موقع پر پہنچے تو کچھ ہماری وضع قطع دیکھ کر اور کچھ نام پوچھنے کے بعد یہ جان کر کہ ہم جماعتِ اسلامی کے کارکن ہیں۔ ہمیں ان حضرات

---

[1] جیل کے انتظام کا اندرونی مرکز

نے میز کے ساتھ رکھے ہوئے بنچ پر بیٹھنے کی دعوت دی، پھر نام پتے پوچھے اور اندراجات کیے۔ ایک ذرا اپنی اہمیت محسوس کرنے والے فوجی افسر نے (جو بعد میں مولانا مودودی کے مقدمے کی سماعت کرنے والے ججوں میں شامل تھا) ہم سے کچھ باتیں چھیڑ دیں۔ جماعت کے مقصد وغیرہ کے متعلق وہ معلومات لیتا رہا۔ اس کا انداز یہ تھا کہ جماعت کی کسی چیز کی تعریف کر کے پہلے اُکساہٹ پیدا کرتا، پھر سوالات کرنے لگتا۔ ہمارے رفقا میں سے بعض مبلّغانہ جوش میں آکر اس کے سوالات کا جواب دیتے رہے خود ان افسر سے ہم نے اپنے معاملے کے متعلق دریافت کیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور آپ لوگوں کے سامنے کیا کیا کچھ ہے۔ اس کے جواب میں وہ یہی کچھ کہہ سکے کہ ہماری طرف سے تو کچھ بھی نہیں ہو رہا ہے، پولیس نے آپ کو گرفتار کیا ہے۔ اس پر سی، آئی ڈی کے ایک افسر جو اس گروپ کے ساتھ شامل تھے، کہنے لگے کہ آپ لوگوں کے خلاف جو چیز لائی گئی وہ بڑی سخت چیز تھی۔ خدا کا شکر کیجیے کہ آپ لوگ اس سے بچ نکلے ہیں۔ اب معمولی بات ہے۔ ہم نے پوچھا کہ وہ کیا چیز تھی، تو ان صاحب نے بات گول کر دی۔ اس گفتگو کے دوران میں نہ صرف چاروں طرف لوگ کھڑے اس گفتگو کو توجّہ سے سُن رہے تھے بلکہ ایک نوعمر فوجی افسر بالکل خاموشی سے ٹکٹکی باندھے ہماری طرف دیکھ رہا تھا...... جیسے وہ سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

بہر حال ہمیں معلوم ہو گیا کہ مولانا پر کوئی مقدّمہ چلایا جانے والا ہے۔

فوجی عدالت

۷ مئی کو طے شدہ پروگرام کے مطابق ناشتہ کرتے ہی فوجی عدالت جانے کی تیاری شروع ہو گئی جہاں مولانا مودودی کا تاریخی مقدمہ زیر سماعت تھا۔ عدالت سنٹرل جیل کی ڈیوڑھی کے اس ملحقہ ہال میں منعقد ہو رہی تھی جس کی چھت کے نیچے اس سے قبل کئی سیاسی مقدمات فیصل ہو چکے تھے۔ اب یہاں مارشل لا کے خاص خاص مقدّمات کا فیصلہ کیا جا رہا تھا۔ اسی تاریخی ہال میں اب پاکستان کی وہ شخصیت مجرموں کے کٹہرے

میں آرہی تھی جس کا سب سے بڑا گناہ ملک بھر میں اسلامی نظامِ زندگی کی تڑپ پیدا کر دینا ہے لیکن جسے اس کے اصل گناہ پر نہ پکڑ سکنے کی وجہ سے "قوت" ہمیشہ دانت پیستی رہی ہے اور سازشی ذہن کے ساتھ برابر کسی زرّیں موقع کی تلاش میں رہی ہے۔ یہ زرّیں موقع ہاتھ آگیا۔

سنٹرل جیل پہنچے تو مقدّمے سے دل چسپی لینے والوں کا ایک ہجوم موجود پایا۔ اکثر رفقا سے یہیں بغل گیر ہو ہو کر ملاقات کرنے کا موقع ملا۔ معلوم یہ ہوا کہ اندر صرف پندرہ آدمیوں کے داخلے کی اجازت ہے، مگر ایک ایک کرتے کرتے بہت بڑی تعداد ہال میں جا پہنچی، اور زائرین سے ہال کی گیلری اور اس کی سیڑھیاں پوری طرح بھر گئیں۔

ہم دبے پاؤں داخل ہوئے اور کارروائی کے دوران میں سیڑھیوں پر جا کر بیٹھ گئے۔ فاضل ملزم بالکل ججوں کے ڈیسک کے متّصل کھڑا اپنا تحریری بیان پڑھ رہا تھا۔ جو اُس رات ۲ بجے طفیل صاحب کو املا کرا کر تیار کیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ "ملزم" جوابِ دعویٰ نہیں پیش کر رہا ہے بلکہ وہ کوئی جج ہے جو تاریخ کی عدالت میں کسی مقدّمے کے ملزموں کو اپنا فیصلہ سنا رہا ہے۔ اس کا لب و لہجہ، سنجیدگی، وقار اور حوصلہ مندی کا مظہر تھا۔

بیان ختم ہوا، تو مولانا اپنی کرُسی پر بیٹھ گئے۔ جو چودھری نذیر احمد خاں مولانا کے وکیل، اور غیاث صاحب کی کرسیوں سے ذرا پیچھے ہال کے ایک پائے کے ساتھ تھی۔ پیچھے کٹہرے میں سیّد نقی علی اور قادیانی مسئلہ چھاپنے والے دو مالکانِ مطابع، بہ حیثیت ملزمین بیٹھے تھے۔ مقابل میں حکومتِ پنجاب کے سرکاری وکیل اور ان کے معاون کی نشست تھی۔ ججوں میں سے صدر آئی گیلانی کا چہرہ سنجیدگی اور کسی قدر ذہنی تعمّق کے آثار رکھتا تھا۔ صدر کے دائیں ہاتھ جو صاحب بیٹھے تھے ان سے پہلے ایک موقع پر بات کرنے کا موقع جیل میں مل چکا تھا، یہ تیز طرّار آدمی تھے اور چہرہ بھی اس کا شاہد تھا۔ صدر وقتاً فوقتاً انہی سے مشورہ کرتے رہتے تھے۔ صدر کے بائیں ہاتھ ایک صاحب اور تھے جو کارروائی کے دوران میں بالکل بے حس و حرکت بالعموم آنکھیں

بند کیے بیٹھے رہے، ممکن ہے کہ سو بھی جاتے ہوں۔ ایک چوتھے صاحب کارروائی کے نوٹس لینے اور کاغذات وغیرہ کو محفوظ کرنے والے تھے۔ صدر کے متعلق بتایا گیا تھا کہ وہ فوجی قانون کے علاوہ سول قانون سے بھی واقف ہیں۔ یہ تھی مارشل لا کی وہ نمائندہ طاقت جو مولانا مودودی اور تحریکِ اسلامی کی قسمت کا فیصلہ کرنے بیٹھی تھی۔

کارروائی سے اندازہ یہی ہو رہا تھا کہ ملزم کا پلّہ بھاری ہے اور مدّعی کا کیس بالکل کھوکھلا ہے۔ فریقین کے وکلا پر گہری نگاہِ تنقید جمی رہی، اندازہ بالعموم یہی تھا کہ چودھری نذیر احمد نے کیس پلیڈ کرنے میں بڑی ذہانت اور محنت کا ثبوت دیا ہے، دوسری طرف حکومت پنجاب کے سرکاری وکیل تھے جن کو ——

ذہانت و محنت سے کام لینے کی نسبتاً کم ضرورت تھی۔ چودھری نذیر احمد خاں بہت دھیمی آواز میں متانت اور سنجیدگی سے بات کرتے تھے، لیکن انداز اتنی خود اعتمادی اور اتنا بڑا پن لیے ہوئے تھا کہ عدالت اس سے متأثر ہوتی تھی۔ جہاں کہیں دونوں میں بحث ہوئی ہے تو سرکاری وکیل پچھڑ گیا ہے۔ سرکاری وکیل کے چہرے پر اور خصوصاً سفید آنکھوں پر شاطرانہ انداز پوری طرح جھلکتا تھا۔ ان کا بحث کے لیے اٹھنا اور اُٹھنے سے بڑھ کر بیٹھنا، بڑا ڈرامائی ہوتا تھا۔ پھر گواہوں پر جرح کر کے یا جب کوئی نکتہ جیت کر یا برعکس صورت میں بازی ہار کر آپ بیٹھتے تھے تو دونوں صورتوں میں انداز اتنا مختلف ہوتا تھا کہ ان کی ذہنی کیفیّت ان کی آنکھوں سے ٹپک پڑتی تھی۔ کامیابی کی صورت میں وہ ہم سامعین کو ایک اور ہی انداز سے دیکھتے تھے، اور ناکامی کی صورت میں نگاہوں کے زاویے بالکل دوسرے ہی ہوتے تھے۔

عدالت میں نمایاں شخصیّت ملک سعید کی تھی جو مولانا کی کرسی کے ساتھ زمین پر کاغذات کے انبار کے انبار رکھے ان میں کھوئے ہوئے تھے، اخبارات کے فائلوں اور لٹریچر کی کتابوں کے اندر نشانات کی سلپس جا بجا چسپاں تھیں اور جس جس چیز کی ضرورت پڑتی، نہایت پھرتی سے آپ پیش کر دیتے۔

کارروائی کے بیچ میں وقفہ ہوا تو مولانا خود ہی ہماری طرف بڑھے، مصافحہ

کرتے ہی پہلا فقرہ یہ کہا:

"آپ لوگوں نے سخت غداری کی۔"

میں نے فوراً جواب دیا:

"نہیں، مولانا! فکر نہ کیجیے، ہم دوبارہ لائے جانے والے ہیں۔"

اور میری نگاہ اچانک رشید صاحب پر پڑی جو ہمارے گرفتار کنندہ تھے۔ مولانا سے اتنے دنوں کے بعد یہ پہلی ملاقات تھی۔ قلعہ کا حال پوچھا تو فرمانے لگے!

"ظالموں نے پورے ۲۱۶ گھنٹے کامل تنہائی میں رکھا ہے۔"

پھر یہ بھی پوچھا کہ آپ کو وہاں تنگ تو نہیں کیا گیا؟ فرمانے لگے: "نہیں، معاملہ شریفانہ رہا ہے، اور میرے ساتھ یہ اس طرح کی حرکت نہیں کر سکتے۔"

پنڈلیوں کی تکلیف کا حال پوچھا تو معلوم ہوا کہ جو مرض مہینوں کے علاج سے نہیں جا رہا تھا، وہ ہر علاج سے محروم ہو جانے کی حالت میں شافیِ مطلق کے فضل و کرم سے خود بخود ختم ہو گیا۔

میں نے باتوں باتوں میں مولانا سے ذکر کیا کہ سگریٹ چھوڑ دیا ہے، فرمانے لگے:

"ایسے نہیں! جیل آئیے تو اس طرح چھوڑ دیجیے کہ گویا کبھی پیا ہی نہ تھا، اور پھر موقع ملے تو پھر پیجیے اور خوب پیجیے! اس کے بعد پھر وقت آئے تو پھر چھوڑ دیجیے۔"

درحقیقت مولانا نے پان کے بارے میں اپنے مسلک کو سگریٹ کے فکر میں بیان کر دیا۔ واضح رہے کہ مولانا کو ان دنوں پان ملتا ہے اور کھاتے ہیں، لیکن عادت پر کنٹرول اتنا ہے کہ جب چاہیں باگ کھینچ لیں اور جب چاہیں ڈھیلی چھوڑ دیں۔

پھر میں نے اپنا ایک شعر سنایا ؎

یا تو پنجرے کی شامت آئی ہے
یا مرے بال و پر کی خیر نہیں!

بولے:۔

"شامت تو بس پنجرے ہی کی آئی معلوم ہوتی ہے۔"

فوجی عدالت کے مقدمے سے گزرنے والے اس شخص کو یوں اپنی اصلی حالت پر مستقل دیکھ کر خیال آیا کہ ایسے مضبوط آدمی کو پھانسنے کے لیے یہ تدبیریں؟ اور یاد پڑتا ہے کہ اسی لمحے یہ خیال شعر کے سانچے میں ڈھل گیا ؎

تارِ عنکبوت کے جال ہیں بچھے ہوئے
لومڑی ہے گھات میں، شیر کا شکار ہے
کیا عجب دیار ہے!

بعد میں اس شعر پر ایک مکمّل نظم تیار ہو گئی۔

بقیہ کارروائی کے خاتمے پر دوپہر کو عدالت برخاست ہو گئی۔ مولانا عدالت سے نکلے تو لوگوں کا ہجوم ساتھ ہو گیا۔ یہاں تک کہ یہ جلوس سنٹرل جیل کے دروازے تک پہنچ گیا۔ آخر مولانا سلام کہہ کر اندر داخل ہو گئے اور کھڑکی بند ہو گئی۔

ہم گھروں کو واپس روانہ ہو گئے۔ ملک سعید صاحب نے دوپہر میرے ہاں گزارنے کا فیصلہ کیا، کیونکہ دوستی کا تقاضا یہی تھا۔ ملک سعید صاحب پنجاب کے صوبائی نظامِ جماعت کے امیر اور مقدّمے میں جماعت کی طرف سے چودھری نذیر احمد صاحب کے معاون ہیں۔ ملک سعید صاحب مزاحًا کہنے لگے کہ میں اب ۱۲۴ ا کے مقدّمے کا اتنا ماہر ہو گیا ہوں کہ اگر ضرورت پڑے تو بطورِ خود مقدّمہ لڑ سکتا ہوں۔ ملک صاحب ایک طرف مقدّمے سے متعلق حوالے جمع کرنے میں مصروف رہتے، دوسری طرف ہر روز شام کو چودھری صاحب کے ہاں جا کر ان سے اگلے دن کی کارروائی کے بارے میں ہدایات حاصل کرتے اور جماعت کی پوزیشن بھی ان کو ذہن نشین کراتے۔

۸ر مئی کو بحث مولانا کے ایک بیان پر تھی، جس میں حکومت کے بارے میں کہا گیا تھا کہ وہ تھانیدار کے دماغ سے سوچتی ہے۔ چودھری نذیر احمد خان نے یہ مشورہ بھی دیا کہ اگر مولانا پسند کریں تو وہ صرف اتنی بات کہدیں کہ تسنیم میں شائع ہونیوالے بیان کا حرف حرف درست ہونا اور میری تحریر کے مطابق ہونا ضروری نہیں ہے۔ پھر میں خود بحث کر سکوں گا، لیکن مولانا نے مشورہ کو قبول کرنے سے قطعی انکار کر دیا۔

جب عدالت نے تسنیم کا پرچہ پیش کر کے اس بیان کے بارے میں پوچھا تو مولانا خود اٹھ کر سامنے آئے اور کہا:

" ہاں یہ بیان میرا ہے اور میں اس کے ایک ایک لفظ کی ذمّہ داری قبول کرتا ہوں۔"

آج دونوں طرف سے شہادتیں مکمّل ہوگئیں، کل سے وکلاء کی بحث ہوگی جہانتک مقدّمے کی ظاہری کارروائی کا تعلق ہے، ہم مطمئن ہی نہیں، بہت خوش تھے، لیکن ایک "واقف حال" نے عدالت کے احاطے میں ایک ایسی اطلاع ہم تک پہنچائی کہ سارا سکون درہم برہم ہوگیا۔ وہ اطلاع خود مولانا مودودی کو بھی مل گئی۔ چنانچہ احاطۂ عدالت سے سنٹرل جیل کے گیٹ کی طرف جاتے ہوئے خاص طور پر مولانا نے مجمع عام سے الگ ہو کر دو سیکنڈ میں کوئی کلمہ مولانا اصلاحی کے کان میں کہا۔ ہم اس کلمے کو سُنے بغیر جانتے تھے۔ سچّی بات یہ ہے کہ اس وقت دھوپ اور بھوک کے ساتھ جب یہ اطلاع سُنی گئی تو حالت ایسی ہو گئی جیسے بخار ہے۔ گھر پہنچ کر مقدمے کا حال بڑی احتیاط سے بیان کیا گیا، اور اپنے داخلی اثرات وکیفیّات کو چھپانے کی کوشش کی گئی۔ بے دلی سے کچھ کھانا کھایا، اور پھر تھکا ماندہ جسم نیند کی لہروں میں ڈوب گیا، لیکن نیند بھی عجیب بے سکون نیند تھی جیسے بخار میں غنودگی ہوتی ہے۔ اٹھ کر نماز پڑھی اور صورتِ حال پر غور کرنے کے لیے مرکز پہنچے۔

وہاں سے ہمیں دوبارہ گرفتاری کے لیے طلب کر لیا گیا۔

اب ہم پھر اسی سیاست خانے میں تھے جس سے نجات پائے کوئی زیادہ وقفہ نہ گزرا تھا، دن کو بھی اور رات کو بھی یہ مسئلہ زیرِ بحث رہا کہ دوبارہ گرفتاری کا راز کیا ہے۔ اب یہ لوگ کیا چاہتے ہیں؟ ــــ ایک رائے یہ تھی کہ شاید اب پولیس نے کوئی نیا الزام لگا کر ہمارے خلاف مقدّمہ تیار کر لیا ہو اور ہمیں عدالت میں پیش کر کے باقاعدہ سزا دلوائی جائے، دوسرا قیاس یہ تھا کہ شاید مولانا مودودی کے مقدمے کا کوئی ایسا فیصلہ سنایا جانے والا ہے جس کے ردِّ عمل کو روکنے کے لیے ہم لوگوں کو مزید کچھ مدّت کے لیے اندر رکھنا ضروری ہے۔ اور مولانا کو سزا ہو جانا ہمارے نزدیک قطعی تھا۔ اندازہ

سات سال قید کا تھا۔

شاہی مہمان

جیل میں ان دنوں عام چرچا ہے کہ دو قادیانی قیدیوں (مرزا ناصر احمد اور مرزا محمد شریف جو مرزا بشیر الدین محمود کے بیٹے اور بھائی ہیں) کے ساتھ نہایت درجہ امتیازی سلوک روا رکھا گیا ہے، ان کو "شاہی وارڈ" میں جگہ دی گئی ہے جیل کے افسر بلکہ خود آئی جی صاحب (جو خود بھی قادیانی ہیں) صبح و شام ان کے پاس جاتے تھے، اور انکی ضروریات اور شکایات معلوم کرتے تھے ـــــ ایک طرف یہ نازبرداری اور دوسری طرف مولانا مودودی سے وہ سلوک کہ "سی کلاس" دے کر کبھی یہاں ڈال دیا اور کبھی وہاں جا رکھا۔

سزا

۱۲۔ مئی کو علی الصباح پھر بلاوا آیا کہ مارشل لا والے سب کے سب گھنٹی گھر چلیں۔ ہم جانتے تھے کہ وہی فہرستیں بنانے اور ان کی جانچ پڑتال کرنے کا عمل ہو رہا ہوگا نام پڑھے جائیں گے اور دو چار گھنٹے بٹھا کر رخصت کر دیا جائے گا، اس پھیکے پن کے باوجود ہمیں یہ جانا پسند آتا تھا۔ ایک تو احاطے سے نکلتے تو سیر ہو جاتی۔ دوسرے مختلف لوگوں سے ملاقاتیں ہو جاتیں اور خوب دل کھول کر باتیں بھی ہوتیں، علاوہ ازیں خبریں خصوصًا جیل کے "محکمہ تعلیّاتِ عامّہ"، کی نشریّات کے سننے کا موقع ملتا۔ پھر خیال یہ بھی تھا کہ مارشل لا جلد ہی اٹھنے والا ہے اس لیے شاید معاملہ نمٹایا جانے والا ہو، اغلبًا ادھر کی یا اُدھر کی صورت ہو جائے گی۔ نمبر دار کی قیادت میں ہمارا گروپ نکلا، تو نسیم صبح پوری مہربانی فرما رہی تھی۔ اس کے جھونکوں سے دلوں کے کنول کھل رہے تھے۔ ان جھونکوا، کی قدر و قیمت کو وہی جان سکتا ہے جس نے مئی کی رات لاہور میں ایک تنگ کوٹھڑی کے اندر گزاری ہو۔ آپس میں ہنسی دل لگی کی باتیں ہو رہی تھیں، میں نے کہا کہ

یہ سماں ہو تو پھر یہ لوگ ہمیں بلاتے رہیں تو اچھا ہو، سیر و تفریح ہو جایا کرے۔ جس سرور و کیف میں یہ باتیں کہہ رہا تھا، مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ اپنے پیچھے کتنا بڑا کاروانِ آزمائش لا رہا ہے۔ بس دس قدم ہی آگے بڑھے تھے کہ "بڈھی خانے"[1] سے لوگوں نے ہمیں پکارا اور اظہارِ افسوس کے لیے کہا "مولانا کو سزا ہو گئی۔" اور ہم سب دھک سے رہ گئے، کتنی سزا ہوئی؟ کب ہوئی؟ جلدی بتاؤ؟ پھر ہمیں تفصیل بتائی گئی کہ رات کو مولانا کو پھانسی کا حکم ملا ہے۔ ایک مولوی صاحب کو نو سال اور دوسرے کو ۵ سال اور ۳ سال۔ ہمارے اوپر تو جیسے بجلی گر پڑی ہو۔ اعصاب سُن سے ہو گئے اور مجسّموں کی طرح ہم آگے کو حرکت کرنے لگے۔ رات رات میں تقریباً ساری جیل میں یہ خبر پھیل گئی تھی، مگر ہم اس سے بالکل بے خبر رہے یا رکھے گئے۔

میں سوچ رہا تھا کہ کیا آخری گھڑی آ گئی؟ کیا اب قوم اور اس ملک کا فیصلہ ہو جانے والا ہے؟ کیا دین کے دیے اب یہاں بالکل گل کر دیے جائیں گے؟ کیا واقعی ہمارے ملک کے دشمنانِ دین کی حقیر اقلیت کے نمائندے اتنی قوت رکھتے ہیں کہ مولانا مودودی کے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈال دیں؟

اور مجھے مولانا مودودی کے وہ تاریخی فقرے یاد آ گئے، جو پندرہ سولہ برس قبل قلم بند کیے گئے تھے کہ نام نہاد قوم پرست مسلمان اسلامی تحریک کو کچلنے میں کفار سے زیادہ بے باک ہوں گے، کفار جس چیز پر قید اور جرمانے کی سزا دیتے ہیں وہ اس پر پھانسی کی سزا دیں گے، اور پھر بھی جیتے جی غازی اور مرنے پر رحمۃ اللہ علیہم ہی رہیں گے۔

اور اپنی نظم کا یہ بند بھی ذہن میں گونجنے لگا کہ ؎

کرسی پہ عدالت کی ڈاکو پہلے بھی قابض پائے گئے
پیشی میں ان کی اہلِ حق الزام لگا کر لائے گئے
جو خونی تھے "سرکار" بنے
تاریخ کے یہ اعجوبے ہیں
جو محسن تھے غدار بنے
کچھ ہم پہ نرالا ظلم نہیں پہلے بھی کرم فرمائے گئے

---

[1] پہلے یہ زنانہ وارڈ تھا

دل میں نئے جذبے نے کروٹ لی، خیال آیا کہ یہ لوگ مولانا مودودی کو پھانسی دے بھی ڈالیں تو کیا یہ مودودی کے پیغام اور اس کے فکر کو بھی پھانسی دے سکتے ہیں۔ جو گھر گھر پہنچ چکا ہے، اور جس نے نوجوان نسل کو مغرب کی مرعوبیّت سے نکال کر اپنے حلقۂ اثر میں لے لیا ہے! اب مودودی کا پیغام موجودہ دور کی تاریخ کی رگوں کے اندر اتر چکا ہے، اس کے خیالات اس کے مخالفین تک کے ذہنوں میں بولتے ہیں۔ اسکی اصطلاحات اس کے حاسدوں تک کا جزوِ دماغ ہو چکی ہیں، اس کی بولی کی گونج اب دور دور تک سنائی دیتی ہے! جس تحریک کو اس نے اپنے پسینے سے پرورش دی ہے اگر اس کی جڑوں کو اس کے خون کے قطروں سے سیراب کردو گے تو وہ آناً فاناً ایک تناور درخت میں بدل جائے گی، اب تو اس کی موت اس کے پیغام کو زندہ تر کر دے گی۔

یہ سوچتے سوچتے ہم دیوانی گھر کے پاس آپہنچے، دروازہ کھٹکھٹایا۔ مولانا اصلاحی چودھری محمد اکبر، میاں طفیل محمد سبھی دروازے پر آئے۔ تأثرات کا دوطرفہ یہ عالم تھا کہ نہ ہم بات میں پہل کرنا چاہتے تھے اور نہ وہی حضرات اس ذکر کو چھیڑنا چاہتے تھے۔ ہماری نگاہوں ہی نگاہوں نے استفسار کیا اور ان کی نگاہوں ہی نگاہوں نے خبر کی تصدیق کر دی۔ اصلاحی صاحب نے تفصیل بتائی کہ جیل کے ایک افسر کی معیّت میں فوجی افسر حکم لے کر پہنچا، نماز مغرب کے بعد مولانا کو حکم سُنایا گیا اور ان کو اسی وقت وہاں سے پھانسی کی کوٹھڑی کی طرف لے جایا گیا۔ یہ بات سنتے سناتے ہوئے اس طرح محسوس نہیں ہوتی جیسے کسی دیکھنے والے کو محسوس ہو سکتی ہے۔ ہمارے جن رفقائے یہ سماں اپنی آنکھوں سے دیکھا اور مولانا کے علاوہ ملک نصر اللہ خاں عزیز اور سیّد نقی علی کی جدائی کا بھی ـــــ وہی جانتے ہیں کہ ان پر کیا گزری ؟ اصلاحی صاحب جیسا خوگرِ ضبط آدمی بھی پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ پھر وہ سماں کہ مولانا کو جیل کا لباس پہنا کر اُنکے ذاتی کپڑے راتوں رات دیوانی گھر واپس کیے گئے تو ایک مرتبہ پھر دلوں پر قیامت گزر گئی۔

مولانا اصلاحی

اصلاحی صاحب کو نمبر دار نے بتایا کہ آپ کی رہائی کے کاغذات آگئے ہیں۔ مولانا نے خاموشی سے سنا بعد میں جذبات اُمڈ آئے تو کہنے لگے :

"جب وہی شخص دنیا میں نہ رہا کہ جس کی رفاقت میں رہنے سے زندگی تھی، تو پھر میں رہا ہو کر کیا کروں گا؟ میرے لیے اب رہائی میں کون سی خوشی باقی رہ گئی ؟ جیل سے باہر اب میرے لیے کیا دلچسپی ہو گی ؟"

مجھے اصلاحی صاحب کے طرزِ عمل سے یہ تو معلوم تھا کہ وہ مولانا کے اقرب ترین رفیق ہیں، لیکن مجھے اس والہانہ محبّت کا اندازہ نہ تھا، اور شاید کسی کو بھی نہ ہو گا جو اس جملے سے ظاہر ہوئی۔ خاص اللہ کے لیے "سچی" اور گہری محبّت کی مزید ایک مثال اصلاحی صاحب نے تاریخِ انسانیّت کو فراہم کر دی۔ اصلاحی صاحب کی آنکھوں میں یہ الفاظ کہتے ہوئے آنسو تیر گئے لیکن ضبط نے انھیں پلکوں کے اندر خشک کر کے رکھ دیا، کچھ دیر پھر خاموش رہے، اس کے بعد پھر بولے تو کہا :

میں مودودی صاحب کو ایک بڑا اور بہت بلند آدمی سمجھتا تھا۔ ایسے آدمی کم پیدا ہوتے ہیں، مگر آج تک میں ان کو اتنا بڑا نہیں سمجھتا تھا جتنا وہ آج بڑے ہو گئے ہیں۔ مجھے اس کا کبھی اندازہ نہیں تھا کہ خدا نے ان کے لیے ایک ایسی سعادت مخصوص کر رکھی ہے کہ وہ اس کے دین کی راہ میں ایک دن پھانسی کی سزا پائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ہزارہا ہستیوں میں سے چُن کر ایک اونچے مقام پر لا کھڑا کیا ہے۔"

کوٹھی ٹوٹ گئی

۱۴ ر مئی کو بعد دوپہر، ہماری پشت کی بیرونی کوٹھڑیوں سے یہ خبر روشن دان کے راستے منتقل ہو کر آئی کہ مولانا عبدالستّار نیازی کی "کوٹھی ٹوٹ گئی"، (یعنی سزائے موت

منسوخ ہوگئی) ہم نے بڑی دلچسپی سے خبر کو سُنا، کیوں کہ اگر مولانا نیازی کو پھانسی کی سزا نہیں دی جا رہی تھی، تو پھر مولانا مودودی کو تو بالکل نہیں دی جا سکتی تھی۔ اگرچہ ساتھ ہی یہ برعکس خیال آیا کہ مولانا نیازی سے بہر حال وہ خطرہ حکومت کو نہیں جو مولانا مودودی سے ہے اور یہ بھی کہ مولانا نیازی کی طرف سے شاید رحم کی اپیل کی گئی ہو، لیکن مولانا مودودی تو اس پر تیار نہیں ہو سکتے۔ ہم نے روشندان ہی کے ذریعے جب تفصیل مانگی تو جواب ملا کہ مولانا نیازی کی کوٹھی ٹوٹنے کی خبر عام ہے، اخبار میں آگئی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا کہ مولانا مودودی کی کوٹھی بھی ٹوٹ گئی ہے۔ شبہ ہوا کہ مولانا مودودی کا نام یونہی شامل کیا جا رہا ہے۔ پھر جب یہ معلوم ہوا کہ خبر کا اصل ذریعہ باہر کی کوٹھری نمبر ۱۱ میں ہے تو ہم اس کے بالمقابل کی اندرونی کوٹھری میں پہنچے۔ پکار کر خبر کی تفصیل پوچھی تو باٹا پور کے تعلیم یافتہ حوالاتیوں نے جواب دیا کہ خبر صحیح ہے اور اخبار میں بھی ہے، لیکن ساتھ ہی انہوں نے کہا کہ اخبار میں خود ہم نے نہیں پڑھی۔ یہ بھی ان سے معلوم ہوا کہ مولانا مودودی کی سزا کے خلاف کراچی اور سندھ اور بعض دوسری جگہوں میں سخت احتجاج ہوا ہے۔ تسلّی نہیں ہوئی مگر امیدوں کے لیے میدان کُھل گیا، اس کے بعد ہم کو کوٹھری میں حسبِ معمول مقفل کر دیا گیا، اور بیرونی دنیا سے ہم کٹ گئے۔ تھوڑی دیر بعد گنتی کرنے ہمارا عیسائی منشی آیا، اس نے جنگلے پر آکر یہی خبر سُنائی۔ میں نے کہا دیکھیے ہم ٹھیک ٹھیک اطلاع چاہتے ہیں۔ اس پر وہ بگڑ کر چُپ چاپ چلا گیا، گویا اس نے محسوس کیا کہ ہم اس پر جھوٹ کا الزام لگا رہے ہیں۔ یاد پڑتا ہے کہ ڈاکٹر منظور صاحب بھی اسی دوران میں گشت پر آئے تھے اور انھوں نے بھی تصدیق کر دی۔ اب خبر یقینی ہوگئی تھی۔ بالآخر وہ خاص نمبر دار اس خبر کو پہنچانے کے لیے آگیا جو ہمارے لیے واحد معتمد ذریعۂ معلومات تھا۔ بس اس وقت گویا ہم سو فیصدی یقین کی حالت کو پہنچ گئے۔ اب تو یہ بھی بتا دیا گیا کہ ہم مولانا کو خود دیکھ کر آئے ہیں۔ وہ کوٹھری سے نکال کر ہسپتال میں لائے جا چکے ہیں۔ سجدۂ شکر ادا کیا!

یہ جان کر کہ پھانسی کی سزا چودہ سال قیدِ بامشقت میں بدل گئی ہے، ہمیں یوں محسوس ہوا

جیسے مولانا بالکل آزاد ہو چکے ہیں، اور چودہ سال قیدِ بامشقّت کوئی چیز نہیں ہے۔ اندازہ یہ بھی تو تھا کہ اگر رائے عام اسی طرح حسّاس رہی تو مولانا کو قید میں رکھنا ممکن نہیں رہے گا۔

سرِراہے

اتفاق کی بات کہ ۱۵ رمئی کو میری ہفتہ وار ملاقات تھی۔ ہماری ملاقات حوالاتی ہونے کی وجہ سے "سی"، کلاس کے عام قیدیوں کے کمرے میں اس طرح ہوتی تھی کہ جنگلے کے باہر دوست احباب، بیوی بچّے آجاتے اور جنگلے کے اندر سے ان سے مصافحہ کرلیا جاتا، باتیں ہوتیں، اور کھانے پینے کی چیزیں لی جاتیں، زیادہ سے زیادہ ملاقات پندرہ منٹ کی ہوتی تھی۔ ملاقات سے فارغ ہو کر ڈیوڑھی کے گیٹ کے ساتھ بغلی دروازے سے نکلا ہی تھا کہ کسی نے یہ اطلّاع دی کہ مولانا مودودی بھی ملاقات کو آئے ہوئے تھے، اور اب واپس نکلنے والے ہیں۔ گیٹ کے سوراخ میں سے ان کا چہرہ بھی دکھائی دیا۔ انتظار میں کھڑا ہوگیا، بے اختیار جی چاہا کہ اس مسافرِ حق کے چہرے کو دیکھ لوں جو پھانسی کی کوٹھری تک کی منزل سے ہو کے لوٹا ہے۔ وہ چہرہ کیسا ہوگا؟ وہ پیشانی کیسی ہوگی؟ اور اس مسافر نے یہ سفر طے بھی کیا تو بڑی سُرعتِ رفتاری سے کیا۔ وہی بات کہ ع

طے شود جادۂ صد سالہ بآہے گاہے

ڈیوڑھی کے گیٹ کی کھڑکی کھٹ کھٹاک کے شور سے کھُلی، اور اب وہ چہرہ بالکل سامنے تھا۔ آگے بڑھ کر ملاقات کی، مولانا بغل گیر ہو کر ملے، یہ موقع پھر ایسا موقع تھا کہ آنکھوں میں خوشی کے آنسو تیر گئے۔ زبان پر تحمید کے کلمات تھے۔ مولانا نے اس موقع پر جیل کا لباس پہن رکھا تھا، بڑے بڑے خانوں والے کھدّر کا کرتا پاجامہ چلتے چلتے "منزلِ جاناں" کے احوال پوچھے، مولانا نے بتایا "بڑے اطمینان سے تین راتیں گزریں اور کل انھیں باہر نکالنا پڑا۔ مجھ سے یہ لوگ چاہتے ہیں کہ میں رحم کی اپیل ان کے سامنے کروں، اس کے لیے تو میری جوتی کی نوک بھی تیار نہیں ہے۔" (روایت بالمعنیٰ)۔ مولانا باہر کے تازہ حالات سے بھی باخبر تھے کہ احتجاج کس پیمانے پر

ہوا، خود مجھے بھی ملاقات میں کچھ معلومات مل گئی تھیں۔اس مختصر سی سرِ راہے ملاقات نے صبر و ہمّت کی تاب میں مزید اضافہ کر دیا اور میں اس ملاقات کی عجیب بے پایاں سی مسرّت سینے میں لیے جلدی جلدی واپس پہنچا تاکہ اپنے ساتھیوں کو بھی اس میں شریک کرسکوں۔ سب نے پورے اشتیاق سے روداد سُنی۔

۱۹ر مئی وہ تاریخی دن تھا جب ہمیں رہائی کے پرچے دے کر ڈیوڑھی بھیجا گیا۔ لیکن گھنٹہ گھر ہی میں معلوم ہو گیا کہ آگے سیفٹی ایکٹ کا دام بچھائے شکاری موجود ہیں۔ چھ مہینے کی نظر بندی قبول کر کے ہم لوٹے تو اتفاقاً راستے میں مولانا مودودی سے ملاقات ہوگئی۔ طفیل صاحب اور اصلاحی صاحب تو ان کے پاس ہی سے آئے تھے ہمیں واپس آتے دیکھ کر وہ سمجھ گئے کہ ہم پر کیا گزری، تاہم دریافت کیا "کہیے جناب! کیا ہوا؟" ہم نے بتایا کہ چھ چھ مہینے مل گئے ہیں۔ فرمایا "اطمینان سے ڈٹ جائیے۔" اور یہ الفاظ نہایت مطمئن اور مسکراتے چہرے کے ساتھ کہے گئے۔ جیسے سیفٹی ایکٹ کا یہ وار سہنا ایک کھیل ہو، جیسے چھ مہینے کی نظر بندی ایک تفریح ہو، جیسے حکمران طبقے کی یہ زیادتی محض ایک مذاق ہو! اور معاً محسوس ہوا کہ چھ مہینوں کا بوجھ ہلکا ہو کر چھ دنوں کے برابر رہ گیا ہے۔

عجلت تھی، لیکن معلوم ہو گیا کہ مولانا کے لیے سُوت کاتنے کی مشقّت تجویز ہوئی ہے ابتدائی چند دن ٹریننگ کے ہیں۔ یہ شخص جس کے سپرد تاریخ کے چرخے پر قوم کی قسمت کا تار کاتنے کا فریضہ ہے وہ اب سوت کاتے گا اور اس سے جیل کے قیدیوں کے کپڑے بُنے جائیں گے۔ وہ ہاتھ جو "تفہیم القرآن" لکھنے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں، اب یہاں چرخہ چلائیں گے۔ مشقّت ضروری سہی، مگر ایک تعلیم یافتہ شخصیّت بلکہ ایک عظیم مفکّر کی شخصیّت کے لیے کیا چرخہ کاتنے سے بہتر وقت کا کوئی اور مصرف باقی نہیں رہا تھا؟ وہ چند گز سوت کات کر ملک کی دولت میں جو اضافہ کرے گا، وہ اس سے

زیادہ گراں بہا ہے جتنا وہ اپنی دماغی محنت کے نتائج پیش کر کے اضافہ کر سکتا ہے ؟۔
پھر قوم کو ایک معمارِ فکر و سیرت کی اصل خدمت سے محروم کرنے کے لیے اسے غیر مفید کاموں میں لگانا خود قوم پر ہی ایک ظلم نہیں ہے ؟ اور کیا یہ حرکت خود ایسے قیمتی شخص کے لیے ٹارچر کرنے کے مترادف نہیں ہے ؟"
احاطے پہنچے، اطمینان سے ٹک گئے، تو پھر طفیل صاحب نے اس بات کا بھی تذکرہ کیا کہ مولانا کو "بی کلاس" وارڈ میں خالص اخلاقی قیدیوں کی سوسائٹی میں جا ڈالا گیا ہے۔

کھری کھری

"لاہور سنٹرل جیل نیوز سروس" کی نشر کردہ یہ تازہ خبر موصول ہوئی اور مجمعِ عام میں سنائی گئی کہ مولانا مودودی نے چودھری علی اکبر صاحب وزیر جیل خانہ جات کو جیل کی فضا اور اس کے نظم و نسق کی اصلاح کے لیے مفید مشورے دیے۔ مثلاً ان کی توجہ اس امر پر مبذول کرائی کہ یہاں قیدیوں سے "پوچا"، جیسی مشقیں لی جاتی ہیں جن پر وقت و قوّت کا صرف زیادہ ہوتا ہے، لیکن مقابلۃً نتیجہ بالکل ہیچ ہوتا ہے، خود قیدیوں کو ان سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا، نہ مالی فائدہ نہ تربیتی، نہ ذہنی ؟ کیوں نہ قیدیوں کو اچھی اچھی صنعتیں سکھا کر بھیجا جائے کہ وہ باعزّت طریق سے روزی کما سکیں۔ ان کی مشقّت کے ان کو اسی شرح سے معاوضے بھی دیے جائیں جو ملک میں رائج ہے۔ ایسی ہی اصلاحات کی طرف توجہ دلانے کے بعد مولانا نے کچھ کھری کھری باتیں سیاسی قیدیوں اور نظر بندوں کے بارے میں بھی کہیں۔ حالات و واقعات کے افسوسناک پہلو بیان کرنے کے بعد مولانا نے کہا "کیا آپ لوگ اس اصول پر چل رہے ہیں کہ جو پارٹی برسرِ اقتدار آجائے وہ دوسری پارٹیوں کے ساتھ بدترین توہین آمیز اور انتقامی سلوک کرے! اگر ایسا ہے تو سمجھ لیجیے کہ اس کے نتائج آپ کے حق میں کبھی اچھے نہیں ہو سکتے۔"
جیل میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ قیدیوں کو حیرت تھی کہ ایک وزیر کے

سامنے یہ صاف گوئی!

مجلسِ مشاورت

راؤ مہر وز اختر صاحب نے مژدہ سنایا کہ مولانا اصلاحی، چودھری محمد اکبر میاں طفیل محمدؒ اور مجھ کو ڈیوڑھی بلایا گیا ہے، مولانا سے ملاقات کے لیے! سات بجے احاطے سے چلے جانا ہے۔ نہانے سے فراغت پا کر کپڑے بدلے، جلدی جلدی ناشتہ کیا اور نمبردار کی نگرانی میں روانہ ہو گئے۔ دوسرا پڑاؤ گھنٹی گھر تھا، یہاں آ کر معلوم ہوا کہ ڈیوڑھی میں ملاقات کا وقت ۷½ بجے ہے، سو آدھ گھنٹہ یہاں گزارنا پڑا۔ یکایک درختوں کی جھکی جھکی ٹہنیوں کے خلا میں سے مولانا کی صورت دکھائی دی "آ گئے" کی آواز بلند ہوئی اور سب جلدی سے لپکے۔ خود مولانا ہم سے زیادہ تشنۂ ملاقات معلوم ہوئے، مصافحہ کے بجائے معانقہ ہوا۔ واضح رہے کہ جیل میں آ کر مولانا نے معانقہ کی تربیّت ہی نہیں پائی بلکہ اب ان کے اندر اس کا پورا پورا ذوق اُبھر آیا ہے پہلے اگر مولانا سے کوئی صاحب آ کر زبردستی معانقہ کرتے تھے تو مولانا ہمہ تن صبر ہونے کی وجہ سے اسے بس سہ جاتے تھے، لیکن اب، تو مولانا خود پیش دستی فرما لیتے ہیں۔ یہ نتیجہ ہے درحقیقت احباب و رفقاء سے جدا رکھے جانے کا!

مولانا نے راستہ چلتے چلتے خود ہی بیان کیا کہ میانوالی میں لے جا کر ان کو بالکل قید تنہائی میں ڈال دیا گیا تھا۔ سوائے ایک وارڈ کے اور ایک مشقتی کے کسی ابن آدم کا گزر نہیں ہوتا تھا، بلکہ یوں کہیے کہ چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی تھی اور تو اور اسسٹنٹ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ بھی مولانا کے احاطے میں نہیں جاتا تھا۔ ڈاکٹر کو اگر کبھی جانا پڑتا تو اس کے ساتھ بھی نگراں ہوتے

مولانا کے ساتھ ملک عزیز بھی تھے، باہم دگر خیر و عافیت پوچھتے ڈیوڑھی پہنچے، بورسٹل جیل سے ہمارے ملتانی رفقاء کو بھی بلوایا گیا تھا۔ ان سے ملاقات تو بالکل ہی نعمتِ غیر مترقبہ تھی۔ ۶۔ ۷ مارچ کو ان سے آخری ملاقات مرکز میں ہوئی تھی، بعد میں وہ اپنی جگہ گرفتار ہو گئے اور ہم اپنی جگہ مارشل لاء کے تحت جکڑے گئے۔ پھر یہ اطلاع تو مل گئی کہ ان کو بورسٹل جیل میں لایا گیا ہے۔ مگر تفصیل سے کچھ نہیں معلوم ہو رہا تھا۔

بورسٹل کے ساتھ جب ہم طور صاحب کا تصوّر کرتے، تو اپنے ان رفقاء کے بارے میں تشویش میں پڑ جاتے تھے۔ الحمدللہ کہ آج باقر خاں، چودھری نذیر احمد، خان محمد ربانی صاحبان سے بالمشافہ حالات معلوم ہوئے اور اطمینان ہوا کہ وہ ہم سے بھی کچھ بہتر حالات میں ہیں۔ کیوں کہ "ایمن میں آگ لگ چکی اور طور جل چکا" ـــــــ یعنی موصوف تشریف لے جا چکے تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد چودھری غلام محمد، ملک سعید اور صفدر صاحب تینوں ڈیوڑھی میں داخل ہوئے۔ "معانقے کے بعد" معاملے" کی بات چیت شروع ہوگئی یہ دراصل ایک مجلسِ مشاورت تھی جو خاص اجازت سے سینٹرل جیل میں منعقد ہو رہی تھی، سب سے آخر میں جماعتِ اسلامی کے وکیل چودھری نذیر احمد اور غیاث الدّین تشریف لائے۔

دلیل کی بجائے کورٹ مارشل

چودھری نذیر احمد صاحب مقدمے کے سلسلے میں مختلف نکات پر مولانا سے مفصّل گفتگو کرتے رہے، جس میں ضمناً دوسرے بھی حصّہ لیتے رہے۔ چودھری نذیر احمد صاحب نے فرنگیّت مآب طبقے ــــ جس میں ہماری حکمران طاقت ابھری ہے۔ کے رجحانات کو بھی ضمناً بیان کیا کہ ان رجحانات کو ذہن میں رکھ کر عدالتی کارروائی میں حصہ لینا چاہیے ــــ انہوں نے بتایا کہ جماعتِ اسلامی کے بارے میں اوپر والوں کا تصوّر یہ ہے کہ یہ لوگ نہ تو خریدے جا سکتے ہیں، نہ ڈرائے جا سکتے ہیں اور نہ بوقتِ ضرورت استعمال کیے جا سکتے ہیں۔ ان کی رائے یہ ہے کہ اس قوت کے ذریعے مولانا مودودی برسرِ اقتدار آکر ایک بدترین ڈکٹیٹر شپ جمانا چاہتے ہیں، اور اسی لیے مولانا مودودی نے انتخابات میں حصہ لینے کا اقدام بھی کیا ہے اور دستور کا مسئلہ بھی چھیڑا ہے۔ یہ مذہبی ڈکٹیٹر شپ اگر ایک مرتبہ قائم ہوگئی تو پھر کسی کی خیر نہیں، لہٰذا پوری سختی سے اس طاقت کو کچل دینا چاہیے۔ ضمناً اس نقطے پر تھوڑی سی گفتگو ہوگئی۔ مولانا فرمانے لگے کہ اس معاملے میں ہمارا لٹریچر اور دستور اور ہمارا انظامِ جماعت یہ بتا سکتا ہے کہ ہم لوگ سب سے

زیادہ جمہوریت پسند ہیں اور ہمارے یہاں ڈکٹیٹرانہ ذہنیت کی سرے سے کوئی گنجائش نہیں۔ جو شخص ڈکٹیٹر بننا چاہتا ہے وہ کسی ایسے نظامِ جماعت کو کب گوارا کرتا ہے جس میں عہدوں کے لیے انتخابِ افراد کا پورا پورا حق عام ارکان کو حاصل ہو، اور انتخاب کرنے کے ساتھ ساتھ وہ معزول کرنے کا اختیار بھی رکھتے ہوں، اور جس میں امیر اور ارکانِ شوریٰ اور عام ارکان پر ہر رُکن کو تنقید کا پورا پورا حق دیا گیا ہو، اور جس میں امیر اپنی شوریٰ کے مشورے کا پابند بنا دیا گیا ہو۔ مولانا نے یہ بھی فرمایا کہ یہ طبقہ اپنی مطلب براری کے لیے مغرب کی تھیوکریسی کا تصوّر اُٹھا کر ہمارے نظامِ فکر پر چسپاں کر دیتا ہے حالاں کہ دونوں میں کوئی بعید ترین نسبت بھی نہیں۔

مولانا مودودی نے فرمایا کہ ہم نے تو بڑی محنت کر کے اس خلیج کو پاٹا ہے جو ہمارے ہاں مذہبی طبقے اور جدید طبقے میں حائل تھی۔ یہ دونوں بالکل جدا گانہ طور پر پروان چڑھے تھے کہ یہ نہ اس کو جانتا تھا اور نہ وہ اس کو سمجھتا تھا۔ ہم نے ایک بیچ کی راہ نکالی ہے اور کام کرنے کی صحیح تدبیر اختیار کی ہے، لیکن اقتدار پر آیا ہوا مغرب پرست طبقہ ہماری مخالفت "مُلّا اِزم" کا نام دھر کر کرتا ہے، یعنی اصل اسلام کو براہِ راست چوں کہ ممکن نہیں، اس لیے اسے مُلّا ازم کا نام دے کر پھر دل کا بخار نکالا جاتا ہے۔

چودھری نذیر احمد صاحب نے اس پر "جرح" کرتے ہوئے پوچھا کہ حکمران طبقہ کے لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم اصل اسلام کے مخالف نہیں ہیں بلکہ اسلام کی اس شکل کے مخالف ہیں جو ملاؤں نے بطورِ خود بنا دی ہے اور اسی کو ہم "مُلّا ازم" کہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ وہ اپنے تصوّر کے مطابق مُلّا اِزم جیسی غلط اور خطرناک چیز کو کیوں نہ کچلیں مولانا نے فرمایا کہ ان کو اختلاف اگر صرف تصوّرِ اسلام پر ہو تو سیدھا راستہ یہ ہے کہ وہ ہمارے "ملا ازم" کے مقابلے میں اپنا خالص اسلام پبلک کے سامنے اپنے استدلال کے ساتھ رکھ دیں۔ اور پھر لوگوں کو حق دیں کہ وہ جس تصور کو چاہیں اختیار کریں اور جسکو چاہیں رد کر دیں، لیکن یہ کیا طریقہ ہے کہ یہ لوگ اپنے خالص اسلام کو منوانے کے لیے مجھے پھانسی دیتے ہیں۔ میں نے ہر چیز دلیل کے ساتھ پبلک کے سامنے رکھی ہے

اور دلیل ہی کے ذریعے رائے عام کو مطمئن کیا ہے، لیکن یہ لوگ دلیل کے بجائے کورٹ مارشل کے ذریعے اپنی بات منوانا چاہتے ہیں!

یہاں بیچ میں مقالہ نگار یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ مولانا مودودی کی خدمات میں سے ایک بڑی خدمت یہ ہے کہ انھوں نے عوام کو اندھے جوش سے ہٹا کر ہوش کا درس دیا ہے۔ انہوں نے مسائل پر سنجیدگی سے سوچنا سکھایا ہے، انہوں نے دلیل کا وقار مضبوط کرنے کی ہر تدبیر اختیار کی ہے۔ انھوں نے اختلاف کے حق کو تسلیم کیا ہے اور تسلیم کرانے کی سعی کی ہے، انہوں نے تبدیلی کے لیے رائے عام کی تیاری کو ایک لازمی عامل قرار دیا ہے، انہوں نے ہوائی تقریروں کے بجائے ٹھوس علمی لٹریچر کو خیالات پیش کرنے کا بنیادی ذریعہ بنایا ہے۔ پھر انہوں نے انتخابات کے لیے ایسا طریقہ اختیار کیا ہے کہ جس سے زیادہ جمہوری طریقہ اب تک دنیا میں زیر استعمال نہیں ہے۔ یہ شخص ایک طرف عوام کو تلقین کرتا ہے کہ ہُلڑ اور ہنگامہ آرائیوں اور نعرہ بازیوں کے بجائے پرامن جمہوری طریقوں سے کام کریں، اور دوسری طرف کئی کئی بار حکمران طبقے کو نصیحت کر چکا ہے کہ دیکھیے لوگوں کے مطالبات اور ان کی شکایات کو محض معقول دلائل اور رائے عام کی تائید کی بنا پر قبول کرنے کی عادت ڈالیے، ورنہ لوگوں کو آپ مشتعل کر کے ہنگامہ آرائی کی راہ پر ڈال دیں گے، اور وہ اپنے آپ کو سر پھرے لوگوں کے حوالے کر دینے پر مجبور ہو جائیں گے۔

اُونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔

آئی جی جیل خانہ جات کی آمد کا انتظار رہا، لیکن ان کا وقت دوسرے احاطوں میں اتنا صرف ہو گیا کہ ہمارے احاطے میں نہ آسکے۔ ایک راوی کے ذریعے معلوم ہوا کہ موصوف اپنے ساتھیوں سمیت مولانا مودودی کے ہاں بھی گئے تھے۔ وہاں خاصی گفتگو رہی۔ ہاری[1] کمیٹی رپورٹ والے مسعود صاحب ساتھ تھے، وہ

---

[1] سندھ میں مزارعین کو ہاری کہتے ہیں۔ ان کے حقوق و مسائل کے بارے میں ہاری کمیٹی قائم ہوئی تھی۔

بولنے اور بحث وگفتگو کرنے اور خاص طور سے مذہبی مسائل سے تفریح کرنے کا دیرینہ ذوق بلکہ "بحث خولیا" رکھتے ہیں۔ انہوں نے مولانا سے قادیانی مسئلے کے بارے میں اظہارِ اختلاف کیا۔ مولانا نے مشورہ دیا کہ پہلے مسئلے کو سمجھیے پھر رائے قائم کیجیے۔

ایک لطیفہ خوب رہا!

مسعود صاحب نے مولانا سے آغازِ کلام یوں کیا: "فرمائیے مولانا اونٹ (مراد: ڈائرکٹ ایکشن کی تحریک) کس کروٹ بیٹھے گا؟" مولانا نے برجستہ جواب دیا۔ "اونٹ رہا ہی کب، وہ تو گدھا بن گیا ہے، اب کروٹ کا کیا سوال!" ہمارے حلقے میں جب اسے بیان کیا گیا تو اس لطیفے کی تکمیل یوں کی گئی ـــــــ اور گدھا بھی وہی روایتی گدھا جس پر نون[1] لدا ہوا ہے۔

لطیفہ گوئی

مولانا مودودی کی لطیفہ گوئی کا ایک خاص اسٹائل ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس پر بڑا مواد جمع کیا جا سکتا ہے، اور ادبی حیثیت سے اسے مرتب کرکے مولانا کے اسٹائل کی خصوصیّات کی تحقیق کی جا سکتی ہے۔ اوّلین چیز تو یہ ہے کہ مولانا کی لطیفہ گوئی انتہائی حاضر دماغی کا جوہرا اپنے پیچھے رکھتی ہے، یعنی مولانا لطیفہ کہتے ہیں تو ہمیشہ برجستہ کہتے ہیں، اور تیر بہدف بنا دیتے ہیں۔ پھر یہ کہ مولانا لطیفہ گوئی یا مزاح یا نکتہ آفرینی کے مریض بہر حال نہیں ہیں۔ وہ جا و بے جا فقرے گھڑتے نہیں رہتے۔ بس آسمانِ مجلس پر ان کی گفتگو کے اڑتے ہوئے لکّہ ہائے ابر کے درمیان مناسب موقعوں پر مزاح کے ستارے کبھی کبھی چمک جاتے ہیں، رنگ ہمیشہ پیازی یا زیادہ سے زیادہ گلابی رہتا ہے، اتنا تیز نہیں ہوتا کہ ذوقِ سلیم کے لیے بار ہو سکے۔ مولانا کی لطیفہ گوئی اپنے دوستوں اور ملنے والوں کی دل آزاری یا توہین پر کبھی مبنی نہیں ہوتی۔

---

[1] یہ ایک خاص اشاریت تھی۔ وزیر اعظم فیروز خان نون تھے۔ اور نون کے معنیٰ نمک کے بھی ہوتے ہیں۔

ذکر چھڑا تو جی چاہتا ہے کہ دو تین نمونے مولانا کی لطیفہ گوئی کے پیش کر دوں۔
۱۹۴۸ء میں پہلی گرفتاری سے کچھ ہی قبل مولانا نے لائل پور اور جھنگ کا سفر کیا تھا۔ بہت سے لوگ ساتھ تھے، میں بھی تھا۔ ایک مقام پر کار کسی ضرورت سے روکی گئی۔ چودھری صاحب فطرت کے بلاوے پر لبیک کہہ کر لوٹے تو مولانا نے پوچھا۔ "کیا پانی کہیں سے مل گیا ہے؟" چودھری صاحب نے کہا "نہیں دوسری طرح کام چلانا پڑا ہے۔" مولانا نے فوراً کہا۔ "اچھا تو یوں کہیے کہ ڈرائی کلیننگ کی ہے۔"

مرکز کی گلی فیروز پور روڈ سے جہاں ملتی ہے پہلے وہاں نشیب تھا، بعد میں مٹی ڈلوا کر راستہ اونچا کیا گیا جس کی چوڑائی بہت کم تھی۔ ایک دن کہیں سے گاڑی پر آرہے تھے تو ڈرائیور نے جب گاڑی کو گھمایا، مولانا نے کہا "دیکھنا بھئی! احتیاط سے! کہیں فَاُمُّہٗ ھَاوِیَۃٌ ہی نہ ہو جائے۔"

(ان لطیفوں کا بیان پہلے بھی ہوا ہے)

حکیمِ جہاد آرا

ہمارے حکیم الامّت نے پہلی بار بھٹکے ہوئے سورج کا ذکر کر کے ہمیں نئی روشنی دی تھی۔ میرا بھی ایک مجذوبانہ نکتۂ حکمت ہے۔ کبھی کبھی تاریخ بھٹک جایا کرتی ہے۔ ۳۴ ۳۳ ۱۹ء یا ۳۸۔ ۳۶ ۱۹ء کی بات ہے۔ یا کئی مختلف سالوں سے مل کر بنے ہوئے ایک لمحے کی، کہ میں نے بھٹکی ہوئی تاریخ کو دیکھا۔

تاریخ کا راستہ انسانی ذہن سے ہو کر گزرتا ہے اور جب کبھی ذہنی دنیا میں نصب العین کا سورج بجھ جاتا ہے، تاریخ بچاری راستہ گم کر کے الجھے ہوئے سوالوں اور ٹکراتے ہوئے خیالوں کے درمیان ٹامک ٹوئیے مارتی رہ جاتی ہے۔ کبھی کبھی اسی حالت میں صدیاں گزر جاتی ہیں۔ ایسے میں انسانی شخصیتیں بہت سے ٹکڑوں میں بٹ جاتی ہیں۔ کردار غولِ بیابانی کی طرح نت نئی شکلیں بدلتے ہیں۔ ایّام کی تکلی پر حکمت وسیاست کی بڑھیا مسائل کا جتنا سوت کاتتی ہے وہ الجھ کر گرہ در گرہ گچھّیوں کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ تہذیب کے آئینہ خانے میں ہر زائر کو بڑے بھیانک چہرے دکھائی دیتے ہیں۔ معاشرے کے سمندر کی سطح قنوطیّت کی برودت سے یخ بستہ ہو جاتی ہے مگر نیچے گہرائی میں اضطراب کا لاوا کھولتا رہتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ زندگی کوئی گناہ ہے یا کسی گناہ کی مہیب سزا۔

میں نے بھٹکی ہوئی تاریخ کو جب دیکھا تو یہ وہ زمانہ تھا جب میں چوری چھپے شعر کے نام سے تک بندیاں کر کے دو چار بار اپنے آپ ہی کو سنا کر پھاڑ دیا کرتا تھا، جب شطرنج کی بازیاں ہوتی تھیں، اور جب میں اقبال کی "زبورِ عجم"، افلاطون "ریاست" رضی الدّین صدیقی کی "نظریۂ اضافیت"، ایف، کے دُرّانی کی "محمد دی پرافٹ"—— اور قادیانیوں کی "احمدیہ پاکٹ بک"، کا مطالعہ کرتا تھا —— اور جب بڑی بیبا کی سے ملحدانہ بحثیں اٹھاتا تھا۔

اس روز میں نے اپنی بھٹکی ہوئی تاریخ کو دیکھا کہ وہ خود کشی کرنے جارہی ہے وہ تیزی سے بھاگم بھاگ جارہی تھی کہ اچانک اُسے ایک آواز سُنائی دی۔

" ہندوستان میں تیزی کے ساتھ ایک انقلاب آرہا ہے ــــــ پھر اس سے بڑے پیمانے پر ایک دوسرے انقلاب کا سامان تمام دنیا میں ہورہا ہے۔"

وہ ذرا چونکی، مگر رُکی نہیں۔ پھر یہ الفاظ فضا میں پھڑپھڑائے۔"

" جس سیلاب میں تم گھِر گئے ہو، اس کے ساتھ بہنے میں تمھارا وجود نمک کی طرح تحلیل ہوا جارہا ہے اور اس کے مقابلے میں جامد چٹان بن کر تم اپنی جگہ جم بھی نہیں سکتے، لہٰذا آؤ، بہادروں کی طرح اس سیلاب کا رُخ پھیر دو اور اسے اس رُخ پر بہنے کے لیے مجبور کردو جو تمھاری فطرتِ مسلمہ کے مقتضائے سے مطابقت رکھتا ہو۔"

اب تاریخ نے اُس طرف چہرہ موڑ کر کان لگادیے جدھر سے آواز آرہی تھی اور اس کی چال قدرے دھیمی پڑگئی۔ نامعلوم نقیب پکار رہا تھا کہ:

" قوت ڈھل جانے کا نام نہیں، ڈھال دینے کا نام ہے۔ دنیا میں کبھی نامردوں اور بزدلوں نے کوئی انقلاب پیدا نہیں کیا۔ جو لوگ اپنا کوئی اصول اور کوئی نصبُ العین نہ رکھتے ہوں، جن کو دنیا میں محض آسائش اور سہولت مطلوب ہو، ایسے لوگوں کا کوئی قابلِ ذکر کارنامہ انسانی تاریخ میں نہیں پایا جاتا۔"

اب تاریخ رک کر کھڑی ہوگئی، اور اس نے ایک لمبا سانس لیتے ہوئے اپنے آپ کو پوری طرح آواز کی طرف متوجّہ کرلیا۔ اب یہ جُملہ سُنائی دیا۔

" کوئی تہذیبی و تمدّنی حرکت جمود کی چٹانوں سے نہیں روکی جاسکتی اس کو اگر روک سکتی ہے تو ایک مقابل کی تہذیبی و تمدّنی حرکت ہی روک سکتی ہے۔"

سوال اُبھرا کہ مقابل کی کون سی تہذیبی و تمدّنی حرکت؟ ــــــ اور جواب یہ تھا کہ:

"مسلمان ایک بین الاقوامی جماعت (INTERNATIONAL PARTY)
کا نام ہے۔ یہ اس قسم کی پارٹی ہے جو ایک مستقل نظامِ تہذیب و تمدّن
بنانے کے لیے اٹھی ہے اور چھوٹی چھوٹی قومیتّوں کی تنگ سرحدوں کو
توڑ کر ایک بڑی جہانی قومیتّ WORLD NATIONALITY بنانا
چاہتی ہے۔"

تاریخ پر تو نہ جانے کیا گزری۔ میرا حال یہ ہوا کہ جیسے کسی جوہری دھماکے سے
ایک دنیا کی دنیا ٹوٹ پھوٹ جائے اور اس کے کھنڈروں سے عالمِ نَو کا طلوع ہو رہا
ہو۔ یہ در اصل ایک عظیم، زندگی افروز خیال کا دھماکہ تھا۔ عظیم زندگی افروز خیال، جس کا
ظہور علم سے ہوتا ہے اور جس میں ایمان کی روح کار فرما ہو جاتی ہے۔ زمانے کو زیرو
زبر کر دیتا ہے۔ اس سے تحریک ظہور میں آتی ہے۔ سلطنتیں ٹوٹتی اور بنتی ہیں۔ سرحدوں
کی لکیریں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ معاشرے کے رابطے متغیّر ہو جاتے ہیں۔ افراد کی شخصیتوں
کا نقشہ بدل جاتا ہے اور تاریخ کو کھویا ہوا راستہ مل جاتا ہے۔ میں نے خیال کے اس
دھماکے کے بعد یہ دیکھا کہ کچھ دیر کے لیے نگاہوں سے انگریزی حکومت، کانگرس،
مسلم لیگ، خاک سار تحریک، جمعیّت العُلماء، شطرنج کی بساط، شعروں کی بیاض
احمدیہ پاکٹ بک سبھی کچھ غائب ہو گیا ہے اور وسیع خلا میں صرف میں باقی ہوں۔
ساری تاریخ میرے اندر جذب ہو گئی۔ پہلی بار محسوس کر رہا ہوں کہ میں مسلمان
ہوں اور میرے سپُرد تو ایک عظیم الشان نصب العین ہے۔

یہ نقیب تھا کون؟ یہ کس کی آواز تھی؟ وہ کہاں ملے گا؟ تو چلیے، آپ کو
اس کے پاس لے چلوں۔

عجائب عالم کے سلسلے میں نیاگرا آبشار کا ذکر تو آپ نے سُنا ہو گا۔ یہ کینیڈا اور
امریکہ کی سرحد پر واقع ہے۔ ۷، ۴۳ درجے بجانب شمال اور ۱ر ۷۹ درجے بجانب
مغرب۔ یہاں سے بخطِ مستقیم فاصلہ اندازاً دس ہزار میل ہو گا۔

لیجیے، ذرا ادھر دیکھیے، آبشار سے ذرا فاصلے پر ایک پارک کے پاس جو

گاڑی ابھی ابھی رُکی ہے، اس میں سے ایک سفید ریش بزرگ باہر آئے، بہت آہستہ آہستہ وہ چل رہے ہیں۔ یہ کئی روز سے ہر شام کو یہاں آکر ٹہلتے ہیں۔ وضع قطع دیکھنے والوں کو چونکا دیتی ہے، کیوں کہ نہ یہ امریکی ہیں نہ کینیڈین، بلکہ پوری مغربی دنیا سے انداز جُدا گانہ ہے۔ یہی ہے وہ نقیب جس کی زلزلہ افگن آواز ۴۴ سال پہلے میں نے سُنی تھی۔ آج کل یہ شخصیت اپنے فرزند کی دعوت پر علاج اور آرام کے لیے "بفیلو" BUFFALO میں مقیم ہے جو نیاگرا آبشار سے ۲۰ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس بزرگانہ پیکر کے اندر وہ جوانِ معرکہ پسند مورچہ بند ہے جو کبھی بوڑھا نہیں ہو سکتا، ان کا یہ پُرانا فقرہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد بار بار گونجتا ہے اور ہر بار اپنی موجِ نفس تلوار بن جاتی ہے۔

"میرے لیے تو یہ تحریک عین مقصدِ زندگی ہے ـــــــ کوئی ساتھ نہ چلے گا تو میں اکیلا چلوں گا۔ ساری دنیا متحد ہو کر مخالفت کرے گی تو مجھے تنِ تنہا اس سے لڑنے میں بھی باک نہیں ہوگا۔"[1]

تو یہ ہیں حکیمِ جہاد آرا ـــــــ مولانا مودودی!

مولانا مودودی جن کی محیّر العقول قوتِ ارادی نے بڑے سنگین امراض پیچیدہ حالات اور تحریکی مراحلِ عشق کی آزمائشوں پر مسلسل فتح پائی ہے۔ ان کے بارے میں توقع یہی ہو سکتی تھی کہ وہ کم سے کم ۸۵ برس تک اپنی بھاری بھرکم ذمّہ داریوں کی گاڑی بخوبی کھینچنے کے بعد شاید کسی مرحلے میں یہ ضرورت محسوس کریں کہ اب انھیں ہلکا پھُلکا دورِ فراغت گزارنا چاہیے۔ پھر ایسا کیوں ہوا کہ وہ ستّر برس پورے کرنے سے پہلے ہی اپنے قافلے کی عملی سربراہی سے مستعفی ہو کر صحت و قوت کی تلاش میں لگ گئے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جس شخص کے دماغ سے مختلف موضوعات پر ۷۰، ۷۵ چھوٹی بڑی تصانیف کی بیش بہا فصل انسانیت نے حاصل کی ہے

---

[1] رُودادِ جماعتِ اسلامی، حصّہ اوّل، صفحہ ۴۴-۴۳

اورحسن کے نخلِ قلم سے (سرسری اندازے کے مطابق) ڈھائی تین کروڑ الفاظ کے شگوفے پھوٹے ہیں۔ تقریروں، گفتگوؤں، انٹرویوز اور مجالس کی بحثوں کا حساب الگ اورحسن شخص کے اعصاب کی پٹڑیوں پر سے اذیّت ناک حوادث اور ناخوشگوار واقعات کی گاڑیاں آدھی صدی کے دور میں مسلسل گزرتی رہی ہیں اور وہ ان کے کرب کو متبسّم چہرے کے ساتھ اپنے اندر ہی جذب کرتا رہا ہے، اورحسن نے اپنا سارا سفر الزامات کے خارزاروں کو روندتے ہوئے اور گالیوں کی بوچھاروں کا مقابلہ کرتے ہوئے طے کیا ہے، اسے اگر وقت کی چکّی کے بھاری اور کھُردرے پاٹ اب تک پیس ڈالنے میں ناکام رہے ہیں تو یہ ایک کرامت ہے کرامت!

بہر حال وہ "جوانِ بزرگ" اب بھی کام کررہا ہے۔ اس کا جنون امریکہ میں بھی فارغ نہیں بیٹھا، وہ نیاگرا آبشار کے قریب انسانی کردار کے سرافگندہ آبشاروں کو سربلند فوّاروں میں بدل رہا ہے۔

ہمارے ایک دوست وہاں سے لکھتے ہیں:

" بالآخر حلقۂ احبابِ اسلامی (حلقہ میں ایسے افراد شامل ہیں جو امریکہ میں مسلم طلبہ کی تنظیم M.S.A. اور پاکستانی طلبہ کی تنظیم P.S.A. کے تحت امریکہ کے اسلامی مراکز اور مساجد میں اہم ذمّہ داریاں سنبھالے ہوئے ہیں) نے یہ طے کیا کہ مولانا محترم سے ملنے کی سب سے بہتر صورت یہ ہوگی کہ حلقہ کی شوریٰ کا اجلاس ــــــ شہر "بفیلو" میں رکھا جائے۔ پہلی ملاقات یکم جون کو ہوئی (بعد نمازِ عصر) ارکانِ شوریٰ، پھر علاقائی ناظمین کا اور اس کے بعد دیگر ارکان کا جو خاص دعوت پر آئے تھے، تعارف کرایا سب سے زیادہ تعداد نیویارک اور نیوجرسی (اور ان کے متعلقہ علاقوں) کے ارکان کی تھی۔ ان کے علاوہ بالٹی مور، شمالی کیرولینا، فلاڈِلفیا شکاگو، ڈیٹرائٹ، برج پورٹ، کینیڈا کے شہر ٹورنٹو اور مشرقی صوبے نوواسکوشیا کے ارکان تھے۔ اس قسم کی ایک نشست ۲ر جون کو بھی ہوئی

اور ۳؍ جون کو احباب اس عظیم انسان کو خدا حافظ کہہ کر اپنے اپنے مقامات کو رخصت ہو گئے جس نے دینِ حق کے وہ بیج امریکہ میں بو دیے ہیں جو ایک ایسے شجرِ کریم کی صورت میں نمودار ہوں گے جس کی موجودگی میں مادّہ پرستی اور زر پرستی کے جھاڑ جھنکاڑ کے لیے کوئی جگہ نہ رہے گی۔

امریکہ میں مقیم مسلمانوں کے لیے مولانا مودودی محض ایک شخصیّت نہیں ہیں بلکہ موجودہ صدی میں اسلام کا SYMBOL ہیں۔ سیّد مودودی سے بہت سے سوالات اسلامی انقلاب اور جہاد کے بارے میں کیے گئے۔ مولانا نے جو جواب دیے ان میں دو الفاظ بار بار سامنے آئے۔ صبر اور حکمت! بے جا نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ یہ دو الفاظ مولانا کے فکر کا نچوڑ ہیں۔"

جی ہاں! حکمت جہل کی قوتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اور جبر و ظلم کے خلاف محاذ آرا ہونے کے لیے!

مولانا سے متذکرہ مجلس میں جن مختلف موضوعات پر سوال ہوئے وہ یہ تھے:
امریکہ میں مستقل قیام کے مسائل، امریکہ میں اشاعتِ اسلام کے لیے طریقِ کار، وہاں کے حالات میں ابھرنے والے فقہی مسائل، تفہیم القرآن کے انگریزی ترجمے اور اس کی تمام جلدوں کے انڈکسوں کو یکجا کرنے کی ضرورت، جہاد اور قتال، اسلامی انقلاب کا صحیح نہج اور اس میں اخلاق کی اہمیت، انتخاب پاکستان ۱۹۷۰ء، جماعتِ اسلامی کا اصل نصبُ العین، مؤرّخ فلسفی ٹوائن بی کا پیش کردہ عالمگیر دین کا تصوّر، یہودیّت اور عیسائیّت، برتھ کنٹرول، تبدیلیٔ قلب کے آپریشن، بھارت کا ایٹمی دھماکہ، امریکی معاشرے میں اسلامی قانونِ حجاب پر عمل درآمد کرنے میں مشکلات، مسئلہ سُود، قربانی اور قربانی کے گوشت کی تقسیم کا مسئلہ، زکوٰۃ کا استعمال برائے تالیفِ قلوب اور قرآن کے حروفِ مقطعات! مولانا سے اسی طرح گوناگوں سوال ہوتے ہیں اور ان کا انسائیکلوپیڈیائی ذہن اطمینان بخش جواب دیتا جاتا ہے۔ لوگ انھیں

کمپیوٹر کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ جو چاہا سوال سامنے رکھ دیا اور چند سیکنڈ میں جواب وصول!

اندازہ کیجیے کہ زر پرستی اور حرام کاری کے جہنّم میں کام کرنے والوں کو ایک شخص نے کس طرح تھام رکھا ہے کہ وہ وہاں کی تہذیب کی صیّادی کا شکار بننے کے بجائے اُلٹا صیاد بن کر حضرت عیسیٰؑ کے الفاظ میں آدمیوں کو دینِ حق کا شکار بنانے میں لگے ہیں۔

مولانا کے خطوط سے معلوم ہوا کہ ملاقاتیوں کی ایک تعداد وہاں کے حبشی النسل مسلمانوں کی ہوتی ہے جو وقت کے عظیم نقیبِ اسلام کا ذکر سنتے ہیں تو حاضر ہوکر رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔

دنیا میں مروّجہ اصطلاح کے لحاظ سے بڑے آدمی اتنے ہیں کہ بڑا آدمی ہونا کوئی خاص بات نہیں رہی۔ سائنس دان، جج، جرنیل، بینک کار، کروڑپتی، صنّاع، سربراہانِ مملکت اور وزرار، فلمی ڈائرکٹر اور ایکٹر، موسیقار، مصوّر، ناول نگار شاعر، صحافی، کرکٹ اور ہاکی کے چمپین، گھونسہ بازی اور کشتی کے ماہرین، حُسن کی ملکائیں، چھاپہ مار، اور نہ جانے کون کون!

اصل بڑے آدمی ان بڑے آدمیوں سے ذرا اوپر کی سطح پر ملتے ہیں۔ اُن کی بڑائی یہ ہوتی ہے کہ معاشرے کا اچھّا عنصر ان کی طرف کھنچتا ہے اور جو کوئی بھی اُنکے قریب جاکر اثر لیتا ہے اس میں ذہنی اور اخلاقی لحاظ سے بالیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ بڑا آدمی اسے کہیے جو انسانوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد میں بڑائی پیدا کر دے۔

مولانا مودودی کو جس کا جی چاہے، دل کھول کر بُرا بھلا کہے اور سخت خطرناک آدمی قرار دے، مگر اُن کے اس کارنامے سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُنھوں نے ہزارہا انسانوں کو راست فکری، بیداریٔ دل، صبر و عزیمت، نظم، شائستگی، ذوقِ مطالعہ اظہارِ حق اور ایثار کی صفات سے آراستہ کر دیا ہے۔ بہت سے افراد کو انکی دعوت نے معمولی زندگی کے دائرے سے اُٹھا کر جگمگاتی شخصیّت سے مالامال کر دیا ہے۔

پھلور کے فنگر پرنٹ بیورو کا ایک سب انسپکٹر مولانا مودودی کے مشن کو

قبول کرتے ہی اپنی عزتِ ایمانی کے تحت انگریز کی ملازمت کا جُوا اتار کر وہیں بیورو کے ملازم ہم چشموں کے لیے تنور لگا دیتا ہے۔ وہ دال روٹی بھی بیچتا ہے، لٹریچر بھی پڑھتا ہے۔ اور وضاحت مدعا کے لیے بحثیں بھی کرتا ہے۔ یہ تھے چودھری علی احمد خاں مرحوم جنھوں نے مشرقی پاکستان جا کر سب سے پہلے ان حالات کی تفصیلی رپورٹ ۱۹۵۵ء میں پیش کی، جن کا تلخ نتیجہ ۱۹۷۱ء میں ملک ٹوٹنے کی صورت میں سامنے آیا۔[1]

کپورتھلہ کے ایک نوجوان وکیل وکالت چھوڑ کر طرح طرح کے ناکام تجربے کرتے ہیں اور ان کی خوش حال زندگی درویشی میں بدل جاتی ہے۔ آج وہ تحریکِ احیائے اسلام کے محاذ پر مولانا مودودی کے بعد نمبر ۲ کے آدمی ہیں اور عملی ذمہ داریوں کے لحاظ سے نمبر ایک پر۔ یہ ہیں میاں طفیل محمد۔

ایک نوجوان ایرفورس سے نوکری چھوڑ کر آتا ہے اور کراچی سے اخبار اس شان سے نکالتا ہے کہ وہ ایڈیٹر، کلرک، چپراسی ہے اور اس کے اہلِ خانہ ڈسپیچ کا کام کرتے ہیں۔ یہ متعدد کتابوں کا مصنف ہے۔ اوّل درجے کا مقرر ہے اور تنظیمی دائرہ میں قائدانہ ذمہ داریاں انجام دے چکا ہے اور لوگ اُسے اسعد گیلانی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

دل میں جب اس شخص کا تصوّر بھی اُبھر آیا جس کا استقبال میں اس مصرعے سے کرتا ہوں کہ "آمد آں یارے کہ ما می خواستیم" وہ جب تحریک کے روزنامے کا ایڈیٹر تھا تو بقول علی سفیان آفاقی، جس دماغ سے اداریے لکھتا تھا، اس کی پرورش کے لیے چنے کھا کر وقت گزار لیتا تھا۔ یہ چند سال پہلے ترقی کی راہ پر بڑھتا ہوا ایک فوجی افسر تھا۔ یہ وہی مصباح الاسلام فاروقی ہیں جنھوں نے یہودی سازش JEWISH CON-SPIRACY نامی کتاب (جو ضبط ہو گئی تھی) لکھ کر پہلی بار اہلِ پاکستان کو بہت بڑے مسلم دشمن فتنے کے اژدہا سے آشنا کیا۔ آج کل یہ صاحبِ جنوں، قلم ایک طرف رکھ کے مُرغیاں پالنے کا تجربہ کر رہا ہے۔ اسرائیلی اینٹلی جنس کو سب پتا ہوگا کہ اُن کے ایک

---

[1] چودھری صاحب، وفات ۳۱ مارچ ۱۹۵۶ء۔

حریف پر کیا گزری [1]

ذرا عام کارکنوں کے دائرے میں چلیے۔ صرف ایک مثال۔

کراچی کے ایک ممتاز قانون داں کے دفتر میں رات گئے کام ہو رہا ہے۔ ایک نوجوان بلامعاوضہ کاغذات ٹائپ کر رہا ہے۔ اسے گھر کے ٹیلی فون پر اطلاع ملتی ہے کہ بیمار بچے کی طبیعت خراب ہے۔ نوجوان جواب دیتا ہے کہ میں اپنی ڈیوٹی ختم ہونے سے پہلے یہاں سے نہیں اٹھ سکتا۔ خود غرضی اور نفس پرستی کا جو موسم بہار معاشرے پر طاری ہے اس کے پیشِ نظر فاضل قانون دان کے لیے یہ تجربہ بڑا حیرت ناک تھا۔ وہ لاہور کے پارک لگژری ہوٹل میں ایک مجمعٔ شرفاء کے سامنے اپنے تأثر کا اظہار یہ کہہ کر کرتا ہے کہ مولانا مودودی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے پاکستان میں بے لوث کارکنوں کی ایک ٹیم پیدا کر دی ہے۔

یہ مجمعٔ شرفاء مولانا مودودی ہی کو ۱۹۶۴ء کی قید سے رہائی پانے پر استقبالیہ دینے کے لیے جمع ہوا تھا۔ متذکرہ قانون دان اے کے بروہی تھے اور نوجوان ٹائپسٹ کے ذمّہ مولانا مودودی ہی کے کاغذات ٹائپ کرنا تھا۔

بس ایک مثال مجھے اور پیش کرنا ہے۔ میری اقامت گاہ کے قریب ہی نوجوانوں کا ایک گروہ رہتا ہے۔ عمریں ۹، ۱۰ برس سے ۱۶، ۱۸ برس تک، سبھی بے حد ذہین اور زیرک ہیں۔ انھوں نے اپنے مسکن کا نام "مشرقی پاکستان ہاؤس" رکھا ہے۔ یہ وہ نوجوان ہیں جن میں سے کچھ تو بھارت کی قید سے نکل کر یہاں پہنچے ہیں اور کچھ نیپال، برما کے راستے سے۔ ان میں سے کچھ بہاری خاندانوں کے ہیں اور کچھ بنگالی الاصل۔ جب مشرقی پاکستان پر "مکتی باہنی" کے پردے میں ملحد اشتراکیوں کے ساتھ مل کر بھارت کے ہندو ایجنٹ ٹوٹ پڑے اور دہشت گردی اور قتل و غارت کا بازار گرم کر کے انھوں نے بھارتی جارحیّت کا راستہ ہموار کرنے کے لیے بد تر سے بد تر حربے اختیار

---

[1] اس کتاب کی اشاعت کے وقت قائدِ تحریکِ اسلامی ہیں۔

کیے، انھوں نے فدائیانِ اسلام اور محبّانِ وطن کو چُن چن کر قتل کیا اور جہاں کھُلا موقع ملا بڑے بڑے مقتل قائم کر کے ان میں گردنیں کاٹنے کے لیے بانس کے خاص اڈے بنا کر صدہا مردوزن اور طفل و پیر کو زندگیوں سے محروم کیا، اور ان کی اجتماعی قبریں بنائیں۔ یہ لوگ پاکستانی فوج پر بھی حملے کرنے لگے اور ان کے ہر آپریشن کو ناکام بنانے کے لیے چھاپہ مار سرگرمیاں اختیار کیں۔ پاکستانی فوج کو اس بے بسی کے عالم میں مدد دینے کے لیے بے لوث رضا کاروں کی ٹیمیں جگہ جگہ نمودار ہونے لگیں۔ بڑی عمر کے جن لوگوں نے خدمات پیش کیں انھیں "الشمس" کے نام سے اور کم عمر نوجوانوں اور لڑکوں کو "البدر" کے نام سے منظم کر کے تربیت دی گئی۔ نوجوانوں اور لڑکوں کا کردار تڑپتی بجلیوں جیسا تھا۔ ابھی کسی مرکز سے ہدایات لیں اور جھٹ سے دشمن کی کسی کمین گاہ پر موجود! کسی جگہ سے مشتبہ لوگوں کی نقل و حرکت دیکھی، فوری طور پر اس کی رپورٹ فوج کے ذمہ داروں کے سامنے حاضر، معوّذ و معاذؓ کی یاد تازہ کرنے والے نونہال جن کی عمریں گیند بلّے سے کھیلنے کی تھیں، اب رائفلوں اور گرینیڈوں کا نیا کھیل کھیل رہے تھے۔

یہ نوجوان جن کے ساتھیوں کی ایک بڑی تعداد شہادت پا چکی۔ بہت سے اپنے اعضاء سے محروم ہوئے۔ اکثر کے ماں باپ، بہن بھائی پردۂ عدم کے پیچھے چلے گئے اور جن کے لیے سقوطِ ڈھاکہ کے بعد بھارتی جارحیّت نے اپنے ہی وطن کی سرزمین تنگ کر دی۔ مصیبتوں کی دہکتی بھٹیوں سے گزرنے کے بعد آج ہنستے مسکراتے تعلیم و مطالعہ میں مصروف ہیں۔ مختلف زبانیں سیکھ رہے ہیں اسلامی انقلاب میں اپنا حصّہ ادا کرنے کی تیاری کر رہے ہیں اور بے تاب ہیں کہ موقع ملے تو "بنگلہ دیش" میں جا کر اپنے چھوڑے ہوئے ادھورے کام کو مکمل کریں ان نوجوانوں اور بچوں کو کون جانبازی و قربانی کے محاذ پر لایا؟ اس سوال سے جسے دلچسپی ہو وہ اِن نوجوانوں سے خود مل کر معلوم کر لے۔

بڑا کام روپیہ جمع کرنا، فصلیں اُگانا، فیکٹریوں سے مصنوعات کے انبار

منڈیوں میں لانا، زرِ مبادلہ کمانا، عمارات اٹھانا، مینار کھڑے کرنا، مویشیوں کے میلے لگانا، اور ثقافتی شو دکھانا نہیں ـــــ بڑا کام انسان گری ہے۔ ٹوٹے ہوئے آدمیوں کی تعمیرِ نو! تم چاہو تو مودودی کی انسان گری کے نمونے پاکستان کے ہر کونے میں دیکھ سکتے ہو۔ وہ ایک خاص طرح کا کردار ہے جو وقت کے اسٹیج پر جا بجا جلوہ گر ہے۔ پاکستان ہی میں نہیں، تم اسے بھارت میں بھی دیکھو گے۔ سیلون میں اسے متحرک پاؤ گے مقبوضہ کشمیر میں بھی وہ ملے گا، نیپال، بھوٹان اور برما میں بھی دکھائی دے گا ـــ اور وقت کی چند گردشوں کے بعد یہ منظر بھی دیکھو گے کہ "بنگلہ دیش" کے پٹ سن کے کھیتوں اور چائے کے باغوں میں بھی یہ کردار با قاعدہ منظم اسلامی تحریک اٹھا چکا ہوگا۔ برِّصغیر تو کیا، یو کے میں، امریکہ میں کینیڈا میں، جرمنی میں، کوریا میں، جاپان میں وہ آہستہ آہستہ سر اُٹھا رہا ہے، اور عالمِ اسلام کے ہر خطّے میں تم اسے موجود و فعّال پاؤ گے۔ اس کے نام، اس کے لباس اور اس کی بولیاں کئی کئی ہیں، مگر اس کی حقیقت ہر جگہ ایک ہے۔

مودودی کی دعوت کے جوہری بم کا زنجیری ردِّ عمل نجانے کہاں کہاں تک تابکاری پیدا کرتا جا رہا ہے۔ ایسے کام کا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے۔

اب میں چاہتا ہوں کہ تصوّر کے پر لگا کر اس وقت کی دلّی میں چلیں، جب دلّی، دلّی تھی۔ وہاں ذرا مولانا کے خاندانی پس منظر کی ایک جھلک دیکھ لی جائے۔ خود مودودی ہی ہمیں اپنے خاندان کی سیر بایں الفاظ کراتے ہیں:

> "سادات اہلِ بیت کی ایک شاخ تیسری صدی ہجری میں ہرات کے قریب ایک مقام پر آکر آباد ہوئی جو چشت کے نام سے تمام دنیا میں مشہور ہوا۔ اس خاندان کے نامور بزرگ حضرت ابو احمد ابدال چشتیؒ (متوفی ۳۵۵ھ) حضرت حسن مثنّیٰؒ بن حضرت امام حسنؓ کی اولاد میں سے تھے۔ ان کے نواسے اور جانشین حضرت ناصر الدّین ابو یوسف چشتیؒ (متوفی ۴۵۹ھ) سادات کی دوسری شاخ سے تعلق رکھتے تھے۔ جس کا سلسلہ

نسب امام علی نقی علیہ السلام کے واسطے سے امام حسینؓ تک پہنچتا ہے۔
حضرت ناصر الدین ابو یوسف کے فرزندِ اکبر حضرت خواجہ قطب الدّین مودود چشتی (متوفی ۵۲۷ھ) جو تمام سلاسلِ چشتیہ ہند کے شیخ الشیوخ اور خاندانِ مودودیہ کے مورث ہیں۔ (خواجہ معین الدین کے شیخ حضرت عثمان ہرونیؒ، ان کے شیخ حاجی شریف زندنیؒ اور ان کے شیخ حضرت خواجہ قطب الدین مودود رحمۃ اللّٰہ علیہم)۔ خاندانِ مودودیہ کی جس شاخ سے میرا تعلّق ہے وہ نویں صدی ہجری کے اواخر سے ہندوستان میں آباد ہے۔ ہمارا خاندان پہلے براس (ضلع کرنال) میں تھا۔ پھر وہاں سے منتقل ہو کر شیخ پورہ ضلع میرٹھ میں آباد ہوا، اور اس کے بعد دہلی منتقل ہو گیا۔" (مکاتیب سیّد ابو الاعلیٰ مودودی حصّہ دوم خط نمبر ۱۰۰) اس شاخ کے پہلے بزرگ حضرت ابو الاعلیٰ مودودی (متوفی ۹۳۵ھ) تھے۔
"ننھیال کی طرف سے میں ترکی الاصل ہوں۔ میرے نانا میرزا قربان علی بیگ خاں سالکؔ، گو خود شاعر اور صاحبِ قلم تھے مگر پُشت ہا پُشت سے ان کا پیشۂ آباء سپہ گری تھا۔ شاہ عالم کے زمانے تک اس خاندان کے لوگ کسی نہ کسی طرح شاہی خدمت بجا لاتے رہے۔ حضرت سالکؔ مرحوم کے والد نواب عالم بیگ خاں اور چچا نواب نیاز بہادر نواب میر نظام علی خاں کے آخری عہد میں حیدر آباد آئے۔ عالم بیگ خاں کی شادی عبدالرحیم خاں قلعہ دار گولکنڈہ کے خاندان میں ہوئی اور انھیں کے بطن سے حضرت سالکؔ مرحوم پیدا ہوئے۔" (مولانا نے لکھا ہے کہ جناب سالکؔ، مرزا غالبؔ کے شاگردوں میں سے تھے اور یہ بھی کہ مرزا غالبؔ کا مکان مولینا کے ننھیال کے مکان سے متّصل واقع تھا۔ (مکاتیب سیدابو الاعلیٰ مودودی حصّہ اول خط نمبر ۱۵۹) ۱۸۷۴ء میں حضرتِ سالکؔ نے انتقال فرمایا۔
میرے والد سید احمد حسن صاحب ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے دو سال بعد

دلی میں پیدا ہوئے۔ مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے بالکل ابتدائی دور کے طالبِ علموں میں سے تھے۔ مرزا قربان علی سالکؔ کے دو بیٹے اور چار لڑکیاں تھیں ـــــ سب سے چھوٹی صاحب زادی رقیہ بیگم صاحبہ مرحومہ میری والدہ تھیں۔

"میں ۳/رجب ۱۳۲۱ھ ۲۵ستمبر ۱۹۰۳ء (عجیب اتفاق ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ کا سالِ پیدائش ۱۷۰۳ء ہے) کو اورنگ آباد میں پیدا ہوا۔ پیدائش سے تین سال قبل ایک بزرگ والد صاحب کے پاس آئے تھے۔ انھوں نے میری پیدائش کی پیش گوئی کی تھی اور والد صاحب سے فرمایا تھا کہ اس کا نام ابوالاعلیٰ رکھنا۔ والد نے ان کے ارشاد کو قبول کیا اور یاد رکھا؛ چنانچہ جب میں پیدا ہوا تو اس نام سے مجھے موسوم کیا گیا۔

"سر سیّد احمد خاں ایک قریبی رشتہ سے میری دادی صاحبہ کے بھائی ہوتے ہیں اور میرے والد ان کے بھانجے تھے۔"

اب ہمارے سفرِ مطالعہ کی منزل حیدر آباد ہے۔

مولانا کے ننھیالی خاندان کا تعلق پہلے سے حیدر آباد دکن سے تھا۔ حضرت قربان علی بیگ صاحب کے والد اور چچا پہلے سے حیدر آباد میں تھے۔ مولانا کے والدِ گرامی مولوی سید احمد حسن صاحب نے جنھوں نے علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی اور الہ آباد سے وکالت کا امتحان پاس کیا، ۱۸۶۹ء میں مولوی محی الدین صاحب میرِ عدل کی دعوت پر اورنگ آباد دکن میں جاکر وکالت شروع کر دی ۱۹۰۴ء میں جب کہ مولانا مودودی کی عمر ایک سال تھی ان کے والد نے ترکِ دنیا کر کے سارا اثاثُ البیت لٹایا اور واپس دہلی آگئے۔ اور درگاہ حضرت حضرت نظام الدینؒ کے پاس مقیم ہو گئے۔ مولوی محی الدّین خاں صاحب نے سمجھا بجھا کر پھر بلوایا۔ ۱۹۱۵ء تک اورنگ آباد میں شدید پابندیوں کے ساتھ وکالت کی، پھر حیدر آباد آگئے جہاں فالج کا حملہ ہوا

اور چار سال بیمار رہ کر ۱۹۲۰ء میں انتقال فرمایا۔

آیئے حیدر آباد میں مولانا مودودی کی ایک دو جھلکیاں دیکھیے۔ ماہر القادری لکھتے ہیں:

"تقریباً دو سال کے بعد خود میرا حیدر آباد جانا ہو گیا۔ مولانا مودودی وہاں پہلے سے پہنچ چکے تھے اور اپنے بڑے بھائی سید ابوالخیر مودودی کے ہاں مقیم تھے۔ ابوالخیر صاحب دارالترجمہ عثمانیہ کے رکن تھے۔ بنگلے نما مکان تھا۔ سواری کے لیے موٹر تھی، نوکر چاکر تھے۔ اسی خوشحال ماحول میں مودودی صاحب اپنے بھائی کے ساتھ رہتے تھے۔ مجھے یاد نہیں مودودی صاحب نے ماہنامہ "ترجمان القرآن" کی ادارت کب سنبھالی مگر اتنا یاد ہے کہ اب وہ معظم جاہی مارکیٹ سے ڈیڑھ دو فرلانگ کے فاصلے پر ایک دو منزلہ عمارت کے اوپر کے فلیٹ میں رہتے تھے۔ ہمارے شدید اصرار پر مولانا مودودی نے دو یا تین بار سینما بھی دیکھا۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ مجھ پر فلم کا نشہ سا سوار تھا اور مولانا مودودی پر ذرہ برابر اثر نہ تھا۔ سینما کی بلا چلتے وقت وہیں سینما ہال میں دامنِ فکر و خیال سے جھٹک کر چلے آئے۔ پھر ہمیں اس کا احساس ہو گیا کہ یہ شخص ان چٹخاروں میں ہمارا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اس زمانے میں مولانا مودودی ڈاڑھی بھی منڈواتے تھے۔ مولانا مودودی تنہا رہتے تھے۔ ایک ملازم تھا۔ جو ڈاک خانے ڈاک وغیرہ لے جانے کا کام بھی کیا کرتا تھا۔ چائے کا وقت ہوتا تو ہم مولانا کے ہاں چائے بھی پیتے، کئی بار ان کے ہاتھ کے تلے ہوئے انڈے بھی کھائے۔ ریاست حیدر آباد دکن کا محکمہ امورِ مذہبی بھی رسالہ "ترجمان القرآن" کے کئی سو پرچے خریدتا تھا۔ ایک سال یہ خریداری روک دی گئی۔ نواب صاحب (ذوالقدر جنگ بہادر) یہ چاہتے تھے کہ مودودی صاحب ان سے آکر خود کہیں تو وہ منظوری

دیں ـــــــ مولانا مودودی صاحب کو جب یہ اطلاع ملی تو بولے کہ میں قیامت تک اس کام کے لیے ان کے پاس نہیں جاؤں گا۔ یہ میرا نہیں دین کا کام ہے (مولانا مودودی ہی کے مختصر سے دورِ شاعری کا ایک مصرع یہاں یاد آگیا۔ ع

طالب تو ہوں ضرور، پہ سائل نہیں ہوں میں

(ادبیاتِ مودودی از پروفیسر خورشید احمد ص[۲۸])

غالباً محقق طوسی کی کوئی کتاب تھی (نہیں یہ تھی مُلّا صدرا شیرازی کی الحکمۃ المتعالیۃ[۱] فی الاسفار العقلیہ، معروف بہ اسفار اربعہ) اردو میں منتقل کرنے کے لیے دار الترجمہ کی طرف سے مولانا مودودی کو معاوضہ پر دی گئی تھی۔ مولانا مودودی نے پوری کتاب یا اس کے چند اجزا کا (دو اسفار کا ترجمہ کیا تھا جو طبع ہوتا تو ۳، ۲/۱ ۳ ہزار صفحات لیتا) ترجمہ صرف آٹھ مہینے میں کر کے دے دیا۔ جو معاوضہ ملا اس سے انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کی تمام جلدیں (اور تفسیر و حدیث کی بعض کتب) خرید لیں۔"

۱؎ علومِ عقلیہ میں ان کی (یعنی ملا صدرا کی) کتاب "الاسفار الاربعۃ" (الحکمۃ المتعالیہ فی الاسفار العقلیہ) کو سب سے زیادہ مشہور کتاب کہا جا سکتا ہے جو بلا شک و شبہ حکمتِ اسلامی کی وقیع ترین کتابوں میں سے ایک ہے۔ یہ کتاب چار جلدوں میں منقسم ہے، (۱) روح در سیر (۲) روح در سلوک۔ (۳) روح در وصالِ نہائی با حق چار ابواب میں (۴) روح در طی مراتبِ کمال۔

کتاب کے دیباچے میں مصنف نے لکھا ہے: "ـــــــ عارفین اور اولیاء کی راہ پر جو چلے ہیں ان کے چار سفر ہیں۔ پہلا سفر وہ ہے جو مخلوقات سے شروع ہوتا ہے دوسرا سفر وہ ہے جو حق کے ساتھ حق میں ہوتا ہے، تیسرا سفر پہلے سفر کے مدِّمقابل ہوتا ہے کیوں کہ اس میں حق سے خلق کی طرف حق کے ساتھ سفر کیا جاتا ہے اور چوتھا سفر دوسرے سفر کا ایک طریقے سے مدِّمقابل ہے کیونکہ یہ حق کے ساتھ خلق میں پایا جاتا ہے۔"

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

حیدر آباد کے متعلّق مولانا کا ایک مختصر قول بڑا اہم ہے۔ ہندوستان کی آزادی کی تحریک کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا۔

"اس کا ریلا جب یہاں پہنچے گا تو نظام کی حکومت کا یہ قصر ——— ایک ٹھیس میں زمین پر آ رہے گا۔ میں نے محسوس کیا کہ نظام کی حکومت گویا افیون ہے جسے کھا کر مسلمان غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔"

بیچ میں "ترجمان القرآن"، کا (۱۹۳۳ء) کا ذکر آ گیا۔ یہ صورِ حشر آفریں جس نے غارِ جمود کے کتنے ہی اصحابِ کہف کو اٹھا کر کھڑا کیا، جس نے اقبالؒ کے دل میں گھر کیا، اس کی قدر و قیمت کا اندازہ ایک مرحوم بزرگ کے چند الفاظ سے کیجیے جو ڈاکٹر محمد عطاء الرحمٰن ندوی کے ذریعے ہم تک پہنچے۔ ڈاکٹر صاحب ۱۹۳۶ء کی چھٹیوں میں گھر گئے اور "ترجمان القرآن" کے جمع شدہ پرچے والدِ گرامی کی خدمت میں پیش کیے۔ انھوں نے مطالعہ کر کے فرمایا:

"مجھے اس شخص کے متعلّق سخت غلط فہمی تھی۔ اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائے یہ تو علّامہ ابنِ تیمیہؒ کا رنگ ہے۔ تعجّب ہے کہ اس قحط الرجال کے دور میں اور وہ بھی ہندوستان میں ایسا شخص کیوں کر پیدا ہوا۔ یہ شخص عملاً جب اس کام کو کرے گا تو اس کی مخالفت بھی بڑے شدّ و مد سے کی جائے گی۔"

"بعد میں "ایک صالح جماعت"، کا مضمون پڑھ کر فرمایا:" اگر یہ جماعت وجود میں آئی تو میں اس کا پہلا ممبر بنوں گا۔"، لیکن تشکیلِ جماعت سے صرف دس دن قبل وفات ہو گئی۔ یقیناً مرحوم کو پابندِ شریعت زندگی کے اجر کے ساتھ اس نیّتِ جہاد کا اجر بھی ملیگا۔

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ کا) (اردو ترجمہ: از مناظر احسن گیلانیؒ سلسلہ جامعہ عثمانیہ، ج ۱، ص ۲۳) اس کتاب کی کئی شرحیں لکھی گئی ہیں، بہت سے حواشی بھی رقم ہوئے ہیں۔

(اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ۔ ج ۱۲۔ ص ۸۱ (اشاعت ۱۹۷۳ء)

اچھا تو ہمارا سفر طویل تر ہوتا جا رہا ہے۔ اب اگلی جست میں ہم پٹھان کوٹ کی بستی دارالاسلام (سرنا ریلوے سٹیشن) چلتے ہیں جہاں چودھری نیاز علی خاں کی وقف کردہ مختصر سی عمارات میں اقبالؒ کا تجویز کردہ ایک اسلامی کلچر سینٹر قائم ہونا تھا اور جس کے لیے اقبالؒ ہی نے مولانا مودودی کا نام تجویز کیا۔ مگر اِدھر مولانا مودودی حیدر آباد سے دارالاسلام منتقل ہوئے۔ اُدھر علامہ اقبالؒ نے دارِ بقا کی طرف انتقال فرمایا۔ آیئے اب میرے ہی ایک سابق مضمون کی عبارت کے آئینے میں آپ جنگل اور کھیتوں کے درمیان بسی ہوئی انوکھی بستی کے مکینِ اعلیٰ کا عکس دیکھیے:

"غالباً مغرب کی نماز کا وقت قریب ہوا تو بستی کی مختصر سی آبادی میں — تین چار افراد — مسجد کی طرف سمٹنے لگے۔ اذان ہوئی اور اس کی آواز پر قریب کے ایک کوارٹر سے ایک شخص برآمد ہوا۔ وائل کا کرتہ، لٹھے کا غرارہ نما پاجامہ، سر پر وائل ہی کی ٹوپی، پاؤں میں غالباً باٹا کے سیاہ رنگ کے سلیپر — پورا لباس نہایت اُجلا جو سبز پس منظر میں عجب شان سے نمایاں تھا۔ اس سادہ لباس کے ساتھ ایک روشن چہرہ (جلد کی سپیدی کے ساتھ جوہرِ سیرت کی مخفی سی دمک لیے ہوئے) جس پر سکہ بند مذہبی معیار سے چھوٹی شوخ سیاہ رنگ داڑھی، کسی تعارف کے بغیر میں پہچان گیا کہ یہ وہی شخص ہے جس کے خیالات سے میں نے تھوڑا سا استفادہ کیا ہے۔"

جمعہ کی متعدد نمازیں میں نے مولانا مودودی کے پیچھے دارالاسلام کی مسجد میں پڑھیں۔ مولانا نے جمعوں کے مواقع پر جو خطبے دیے وہ اب "خطبات" ہی کے نام سے یکجا ملتے ہیں۔ (رسالہ دینیات کے بعد مولانا کی سب سے عام فہم کتاب یہی ہے)۔ ان خطبوں میں دین، عقائد، عبادات کی پوری حقیقت اس طرح بیان ہوئی ہے کہ اسلام کے جامع نظام ہونے کا تصوّر بھی ملتا ہے اور اسلام کو غالب کرنے کا اسلامی جذبہ بھی حاصل ہوتا ہے۔ صرف ایک خطبے کی چند سطریں حاضر ہیں:

"اس دین کی تعلیم یہ ہے کہ زمین کا مالک اور انسانوں کا بادشاہ صرف

اللہ تعالیٰ ہے۔ لہٰذا اسی کی اطاعت اور بندگی ہونی چاہیئے۔ زمین میں صرف اللہ کا حکم چلے۔ عدالت میں فیصلہ اس کی شریعت پر ہو، پولیس اسی کے حکم جاری کرے۔ لین دین اسی کے ضابطے کی پیروی میں ہو، ٹیکس اسی کی مرضی کے مطابق لگائے جائیں اور اُنھیں مصارف میں صرف ہوں جو اس نے مقرر کیے ہیں۔ سول سروس اور فوج اسی کے زیرِ حکم ہو ـــــ اور فی الجملہ انسان اس کے سوا کسی کے بندے بن کر نہ رہیں۔ کسی دین کے ساتھ یہ دین شرکت کہاں قبول کر سکتا ہے۔ ہر دین کی طرح یہ دین بھی کہتا ہے کہ اقتدار خالصتاً و مخلصاً میرا ہونا چاہیے اور ہر دوسرا دین میرے مقابلہ میں مغلوب ہونا چاہیے، ورنہ میری پیروی نہیں ہو سکتی۔ میں ہوں گا تو دین جمہوری نہ ہوگا۔ (مراد لادین مغربی جمہوریت) دینِ بادشاہی نہ ہوگا دینِ اشتراکی نہ ہوگا، کوئی بھی دوسرا دین نہ ہوگا۔ اور کوئی دوسرا دین ہوگا تو میں نہ ہوں گا۔

اب ہمیں ملتان جیل چلنا ہے۔ (زمانۂ اکتوبر ۱۹۴۸ء تا اپریل ۱۹۵۰ء) وہاں پہنچنے تک باتوں باتوں میں ہم آگے آنیوالی گفتگو سے متعلق مولانا مودودی کے ماضی میں جھانک لیں۔ تحریکِ ترکِ موالات کا ذکر کرتے ہوئے مولانا کہتے ہیں کہ "میں اس وقت سولہ سترہ سال کا ایک نوجوان لڑکا تھا۔" یہ لڑکا اس طوفانی دور کی سیاست میں تحریکِ خلافت سے وابستہ ہوا۔ افتادِ طبع کے تحت تحریکِ خلافت کے سرچشمہ ـــــ ترکیہ ـــــ کے حالات کا مطالعہ کیا۔ مطالعہ سے یہ کھلا کہ ترکوں کی قیادت قوم پرستی کی بنیاد پر کھڑی تھی اور اس کے مزاج میں مغرب سے آمدہ لادینیت بھی شامل تھی۔ دوسری طرف فتنہ گرانِ مغرب نے ترکی قوم پرستی کے مقابلے میں عربی قوم پرستی کو کھڑا کر دیا۔ ۱۷ سالہ نوجوان کی طبیعت میں کھٹک پیدا ہوئی۔ پھر ہندو مسلم اتحاد کا تماشا دیکھا اور اس کے سامنے یہ سوال اُبھرا کہ مسلم اور غیر مسلم ایک قوم کیسے ہو سکتے ہیں۔ ۱۹۲۴ء میں ترکوں نے خلافت کے خاتمے کا اعلان کیا، اور اسی سال

ہندو مسلم اتحاد کا ڈرامہ بھی ختم ہو گیا۔ ۱۹۲۵ء میں سوامی شردھانند نے شدّھی (مسلمانوں کو ہندو بنانے) کی تحریک شروع کی۔ ۷ اسالہ نوجوان حیران تھا کہ یہ وہی شردھانند ہے جسے ہندو مسلم اتحاد کے زمانے میں مسلمان دہلی کی جامع مسجد میں خود لے کر گئے تھے۔ اور اس کو منبر پر کھڑا کر کے تقریر کرائی تھی اور اُس وقت نوجوان کہتا ہے کہ "میں نے پھر سارے مسئلے کا مطالعہ کرنا شروع کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ مسلمان حقیقت میں ایک مشنری قوم کا نام ہے، محض ایک قوم کا نام نہیں ——— محض ایک قوم کی حیثیت سے یہاں ان کی خیر نہیں ہے۔"

بات لمبی ہو رہی ہے، مگر افکار کی یہ ضروری کڑیاں جوڑنے کے بعد ہی ملتان والی زنجیر مکمّل ہو گی۔ ایک پرانی تحریر سے اقتباس جو کانگریس کی تحریکِ آزادی پر روشنی ڈالتا ہے:

"میرا رفیقِ زنداں (یعنی کانگریسی ہندو) اس تدبیر میں ہے کہ جیلر کو ہٹا کر خود اس کی جگہ لے لے اور اپنے ہاتھ پاؤں کی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں بھی میرے ہاتھ پاؤں میں ڈال کر مجھے اپنا قیدی بنا لے غضب یہ ہے کہ جیلر صاحب تو نرے جیلر تھے، مگر یہ ہمارے رفیق صاحب جواب برقنداز بنے ہیں ان کو مردم خوری کا لپکا بھی ہے۔ میں ہمّت کر کے اٹھوں گا اور جیل کی دیواریں اپنے ہاتھ سے توڑنے کی کوشش کروں گا۔"

مولانا نے دربیش حالات کے سارے نقشے کو سامنے رکھ کر یہ متعیّن کرنے کی کوشش کی ہے کہ آزادی کیا ہے اور وہ کیوں مطلوب ہے؟ پھر جواب میں بتاتے ہیں:

"آزادی سے مراد پہاڑوں اور دریاؤں کی آزادی نہیں، بلکہ باشندگان ملک کی آزادی ہے اور باشندگانِ ملک کی آزادی کی یہ صورت بھی مطلوب نہیں کہ ایک حلقۂ آبادی دوسرے کو محکوم بنا لے۔ جیسے اسی سرزمین پر آریہ آزاد اور شودر غلام رہ چکے ہیں۔ اور آزادی صرف معاشی

خوش حالی (جسے غالب گروہ چھین لے جا سکتا ہے) ہی کا نام نہیں کہ اسے باشندوں کے عقائد، طرزِ زندگی، زبان اور تہذیب و تمدّن سے کوئی تعلق ہی نہ ہو (جن سے قوموں کا نیشنل ٹائپ بنتا ہے) حالانکہ ایک قوم کی زندگی دراصل اس کے نیشنل ٹائپ کی زندگی ہے اور اس کے نیشنل ٹائپ کا مرجانا خود اس قوم کا مرجانا ہے۔ ہر قوم اپنی ضروریات کو اپنے ہی نیشنل ٹائپ کے مطابق پورا کرنا چاہتی ہے۔ اپنے نیشنل ٹائپ کی حفاظت اور اس کے نشوونما کی خواہش ہی دراصل آزادی کی طلب کا مبدا ہے۔"

یہ تو غیروں سے رزم گاہ میں بات ہو رہی تھی۔ جلد ہی وہ وقت آیا کہ اپنوں کی بزم میں مقدّمہ اُٹھانا پڑا کہ خدارا اپنے وعدوں کا پاس کیجیے اور قوم کے نیشنل ٹائپ (ایمانی و تہذیبی تشخّص) پر رحم کھائیے۔ چنانچہ مولانا مودودی نے ملک کے تمام شہروں میں جا کر قوم میں بیداری کی لہر پیدا کی۔

ان کی تقریر کے محض چند جملے:

"پچھلے دس سال سے بہ حیثیت قوم ہمارا مطالبہ یہ تھا کہ ہمیں ایک خطّہ زمین ایسا ملنا چاہیے جس میں ہم اپنے تہذیب و تمدّن کو از سرِ نو قائم کر سکیں۔"

"اب اللہ تعالیٰ نے آپ کو پاکستان دے کر آزمائش میں ڈال دیا ہے۔ اور وہ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ آپ سچّے تھے یا جھوٹے۔"

"اسلام کے نقطۂ نظر سے مسلمانوں کے ذہن و فکر کا دوسروں کی غلامی سے آزاد ہونا اوّلین مقصد کی اہمیّت رکھتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اُس نے ہمیں اغیار کی سیاسی محکومی سے تو آزاد کر دیا، لیکن انکی غلامی اور ان کی غیر اسلامی اقدار کے تسلّط اور ان کی فکری محکومی میں جس طرح ہم مبتلا تھے اس سے رُستگاری نصیب نہیں ہو سکی۔"

(مکاتیب مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی حصّہ اوّل خط نمبر ۱۶۴)

"اگر یہ انقلاب فطری طور پر رُونما ہوا ہوتا تو اس مطالبے کی ضرورت پیش نہ آتی، بلکہ انقلاب کے بعد فوراً آپ سے آپ اس ملک میں اسلامی حکومت قائم ہو جاتی، لیکن بحالاتِ موجودہ ایک مصنوعی انقلاب کے بعد اسلامی نظام اب ایک منظّم اور پُرزور مطالبے ہی کے ذریعے قائم کیا جا سکتا ہے۔"

"ہم تو وہ حکومت چاہتے ہیں جس کی ساری اسمبلیاں اور وزارتیں، نظامِ تعلیم اور نظامِ عدالت اور پورے کا پورا مالیاتی نظام اسلام کے سانچے میں ڈھل جائے۔"

ان تصوّرات کے ساتھ مولانا مودودی نے قوم کے ہاتھ میں ایک چار نکاتی مطالبہ تھما کر تحریک اٹھائی جس میں خدا کی حاکمیّت، قانونِ شریعت کی بالاتری، خلافِ شریعت قوانین کی منسوخی اور حاکمانہ اختیارات کو حدود اللہ کے اندر استعمال کرنے کے دستوری اعلان کو شدید ضروری قرار دیا گیا تھا۔

اس سلسلے میں فروری ۱۹۴۸ء میں لا کالج لاہور میں پہلی تقریر ہوئی۔ مئی میں دستوری مطالبے کے لیے دورہ کیا گیا اور اکتوبر میں مولانا مودودی ملتان جیل کی سلاخوں کے پیچھے تھے۔ اب ذرا جیل میں مولانا کے ذہن کی بلندی اور ادبی اسلوبِ بیان کا اندازہ کرنے کے لیے ان کی تحریروں کے اقتباسات ملاحظہ فرمائیے:

"جس راستے پر میں برسوں سے چل رہا تھا اس میں یہ منزل تو بہر حال آنی ہی تھی۔ حیرت اس کے آنے پر نہیں بلکہ اس بات پر ہے کہ اتنی دیر سے کیوں آئی۔ شیطان اور اس کی برادری نے اتنے دنوں تک مجھے برداشت کیسے کیا۔ یہ اُمید نہ رکھیے کہ کش مکش جلد ختم ہو جائے گی۔ لہٰذا میری ماں اور بھائی اور بیوی اور بچوں اور مجھ سے تعلق رکھنے والے سب لوگوں کو اپنا دل کڑا کر لینا چاہیے۔ جو کچھ سامنے آتا ہے میرے ارادے پر اس کا اثر اتنا بھی نہیں ہوتا جتنا کسی چٹان پر مچھّر کے حملے کا ہوتا ہے[1]۔"

---

[1] اس عبارت کا حوالہ سامنے نہیں رہا۔ مگر یہ عبارت یقیناً مولانا کی ہے۔

"میں نے اپنی ۷۴ سالہ عمر کا تقریباً دو تہائی حصہ مطالعہ و تحقیق اور غور و فکر میں صرف کیا ہے۔ میرے ذہن کا ایک خاص سانچہ بن چکا ہے۔ میری زندگی کا ایک نصب العین قرار پا چکا ہے۔ اب اگر کسی نے یہ سمجھا تھا کہ میرے ذہن اور خیالات اور مقصدِ زندگی، ہر چیز کو محض طاقت کی دھونس اور جیل کی دلیل سے بدلا جا سکے گا تو میں اس کو بتانا چاہتا ہوں کہ اس کا صحیح مقام ایوانِ حکومت نہیں، شفاخانۂ امراضِ دماغی ہے[1]۔"

"میں جس اصلاح کے لیے کام کر رہا تھا اس کے راستے میں پتھر کے پہاڑ حائل نہیں تھے بلکہ گندگی و غلاظت کے فلک بوس انبار حائل تھے میں نے تو خدا کی رضا کی خاطر اس گندگی کو صاف کرنے کے لیے قدم اُٹھا دیا تھا۔ اور جو غلاظت کے چھینٹے مجھ پر پڑنے شروع ہو گئے تھے ان کو صبر کے ساتھ برداشت کر رہا تھا مگر میرے خدا نے مجھ سے چوہڑوں اور بھنگیوں کا کام لینا پسند نہیں کیا۔ اس لیے اس نے مجھے ایک گوشۂ عافیت میں لا کر بٹھا دیا اور اب وہ گندگی کے انبار انہی لوگوں کے سروں پر اٹھوا کر پھنکوا رہا ہے جن کی وہ گندگی ہے۔ یہ کام ابھی ادھورا ہے، ابھی ایک ہی انبار صاف ہوا ہے چند انبار ابھی باقی ہیں، بلکہ غلاظت کا اصلی اور سب سے بڑا ڈھیر تو ابھی جُوں کا توں رکھا ہے، اس لیے میرے باہر آنے کا ابھی کوئی موقع نہیں ہے۔ جس روز یہ کام تکمیل کے قریب ہو گا، آپ لوگ مجھے ان شاء اللہ اپنے درمیان پائیں گے۔"

(مکاتیبِ زنداں ص ۶۲)

"میرا عمر بھر کا مطالعہ مجھے بتاتا ہے کہ دنیا میں کبھی وہ طاقتیں زندہ نہیں رہ سکی ہیں۔ جنھوں نے قلعوں میں پناہ لینے کی کوشش کی ہے۔ کیونکہ

---

[1] ترجمان القرآن جولائی تا ستمبر ۵۵ء ص ۲، ۳۔ رہائی کے بعد کے اشارات۔

میدان کے مقابلے سے جی چرانا اور قلعوں کے پیچھے چھپنا بزدلی کی کھلی علامت ہے، اور خدا نے اپنی یہ زمین بزدلوں کی فرماں روائی کے لیے نہیں بنائی ہے ـــــ جن لوگوں کا کاروبار جھوٹ اور فریب اور مکر کے بل پر چلتا ہے ـــــ اور جن کو اپنی حکمرانی کی حفاظت کے لیے سیفٹی قسم کے قوانین کی ضرورت پیش آتی ہے، ایسے اخلاقی بزدلوں کی جوبی ہنڈیا زیادہ دیر تک چولہے پر نہ کبھی چڑھی رہ سکی ہے اور نہ رہ سکتی ہے ـــــ اگر یہ دنیا کی ہزاروں مرتبہ آزمائی ہوئی حماقتوں کا تجربہ کرنے پر مصر ہی ہیں تو انھیں تجربہ کر لینے دو۔"

(مکاتیب زنداں ص ۷۶)

اب ہم ایک بڑے تاریخی لمحے کو واپس بلاتے ہیں جو ہمیں اپنے ساتھ ایک پھانسی کی کوٹھڑی میں لے چلے گا۔ چل کر دیکھتے ہیں کہ موت کو سامنے رکھ کر ایک نازک ترین لمحے کی میزان میں تلنے پر اس شخص کا وزن کیا نکلتا ہے۔ بات اتنی سی تھی کہ مولانا نے قادیانی جماعت کے لیے بہت سوچ سمجھ "سرطان کا پھوڑا" کے الفاظ استعمال کیے تھے۔ اس پر انھیں گرفتار کیا گیا۔ قلعے لے جایا گیا پھر مولانا جعفر تھانیسری والے سینٹرل جیل لاہور میں رکھا گیا۔ پھر فوجی عدالت کے سامنے مقدمے کا ڈرامہ ہوا۔ وہاں سے موت کی سزا سنائی گئی ـــــ اور مولانا پھانسی کی کوٹھڑی میں اس حال میں پہنچا دیے گئے کہ کھدّر کے پاجامے کے ساتھ ازار بند اس لیے نہ دیا گیا کہ قیدی خودکشی نہ کر لے، پھانسی کی کوٹھڑی کے جنگلے پر، رحم کی اپیل پر دستخط کرانے کے لیے آپ کے صاحبزادے عمر فاروق مودودی اپنے چچا کے ساتھ پہنچتے ہیں۔ مولانا ان کو جواب دیتے ہیں۔

"بیٹا! ذرا نہ گھبرانا۔ اگر میرے پروردگار نے مجھے اپنے پاس بلانا منظور کر لیا ہے تو بندہ بخوشی اپنے رب سے جا ملے گا اور اگر اس کا حکم ابھی نہیں تو پھر چاہے یہ الٹے لٹک جائیں مجھ کو پھانسی پر نہیں لٹکا سکتے۔"

سزائے موت ختم ہونے کے بعد مجھ سے پہلی سرِ راہے (جیل ہی میں) ملاقات کے دوران یہ الفاظ کہے:

"بڑے اطمینان سے تین راتیں گزریں اور کل انھیں باہر نکالنا پڑا۔ مجھ سے یہ لوگ چاہتے ہیں (سمجھتے) کہ میں رحم کی اپیل ان کے سامنے کروں، اس کے لیے تو میری جوتی کی نوک بھی تیار نہیں ہے۔"

اب سیدھے ہم ایک ہی جست میں ۱۹۶۳ء میں آپہنچے ہیں۔

۲۲ ستمبر ۱۹۶۳ء کا واقعہ ہے کہ ٹھیک ایک بجے دوپہر فون پر ایک صاحب نے اپنے آپ کو بڑا سرکاری افسر ظاہر کرتے ہوئے مولانا کو ان کے تازہ بیان کے اس فقرے پر متوجہ کر کے اس کی وضاحت چاہی کہ "اگر کنونشن لیگ کسی فرشتے کو بھی کھڑا کر دے تو اس کا ساتھ نہیں دیں گے۔" اور پھر کہا کہ ایک معذرت لکھدیں ورنہ حکومت کارروائی کریگی۔

مولانا نے جواب دیا:

"میں اسطرح کا آدمی نہیں ہوں جو معذرت نامے لکھ لکھ کر دیا کرتا ہو۔ میرے خلاف کسی کو جو کارروائی کرنا ہو کرتا رہے۔"

کارروائی یہ ہوئی کہ سالانہ اجتماع کے انعقاد میں جمہوریت کش طریقوں سے رکاوٹیں ڈالی گئیں اور پھر بھی جب اجتماع راوی روڈ کے ساتھ پون میل لمبی اجتماع گاہ میں منعقد ہو گیا تو غنڈوں سے حملہ کرا کے طنابیں کاٹ کر قناتیں گرائی گئیں۔ قرآن مجید اُچھالے گئے۔ گولی چلا کر اللہ بخش نامی ایک کارکن کو شہید کیا گیا۔ جب یہ ہنگامہ گرم تھا۔ چودھری غلام محمد مرحوم اُٹھے اور مولانا سے کہا۔ "مولانا بیٹھ جائیے۔"

جواب ملا:

میں ہی اگر بیٹھ گیا تو کھڑا کون رہے گا۔"

پریس کانفرنس میں کسی نے احتجاج کی بات چھیڑی تو کہا:

میں احتجاج کروں تو کس سے کروں؟

تقریر میں رفقاء کے سامنے اللہ بخش شہید کی قربانی کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

"یہ مقدّمہ کہیں اور درج ہو چکا ہے اور ایسا فیصلہ ہو گا جس کا تصوّر بھی یہ لوگ نہیں کر سکتے جو اللہ کی صفتِ انتقام کو بھول چکے ہیں۔"

اس موقع پر حریف قوّت نے مولانا کے خلاف جھوٹے الزامات لگا کر پروپیگنڈہ کا غبار اُڑانا شروع کر رکھا تھا۔ اس سارے سحرِ سامری کو قولِ حق کی ایک ہی ضرب سے باطل کر دیا فرمایا:

"میں کہیں خلا سے یکایک نہیں آگیا ہوں۔ اس سرزمین پر سالہا سال سے کام کر رہا ہوں میرے کام سے لاکھوں آدمی براہِ راست واقف ہیں، میری تحریریں صرف اسی ملک میں نہیں، دنیا کے ایک اچھّے خاصے حصّے میں پھیلی ہوئی ہیں اور میرے رب کی مجھ پر یہ عنایت ہے کہ اس نے میرے دامن کو داغوں سے محفوظ رکھا ہے۔ میرا مُنہ کالا کر دینا کوئی آسان کام نہیں ہے کہ جس کا جی چاہے اٹھ کر دس بیس الزامات لگا دے اور مجھے روسیاہ بنا کر رکھ دے۔ خصوصًا وہ لوگ جن کا نہ کوئی ماضی ہے نہ مستقبل، جنھیں اتفاقاتِ زمانہ چند روز کے لیے ابھار لائے ہیں۔ یہ کھیل کھیل کر ان شاء اللہ میرا کچھ بھی نہ بگاڑ سکیں گے۔"[1]

اب دو چار متفرّق باتیں:

۱۹۵۸ء میں مارشل لا لگا تو سیاسی لحاظ سے سناٹا چھا گیا۔ ایک بڑے سرکاری افسران دنوں جاپان میں تھے۔ جاپان سے واپس آئے تو اُن سے ملاقات ہوئی۔ کہنے لگے کہ مارشل لاء کے بعد مجھے جاپان میں صرف تین آدمیوں کی آواز سنائی دی۔ ایک جسٹس کیانی، دوسرے حمید نظامی، تیسرے مولانا مودودی۔[2]

ستمبر ۶۵ء کے معرکے کا خاتمہ جنگ بندی کے اعلان پر ہوا تو قوم کے ولولوں پر اوس پڑ گئی۔ عوام کی رُوحِ جہاد کو متحرّک رکھنے اور حکام کو سوچنے کی نئی راہ سجھانے

---

[1] روداد کل پاکستان اجتماع جماعتِ اسلامی پاکستان ۱۹۶۳ء مرتبہ نعیم صدیقی۔ سالِ اشاعت ۱۹۶۳ء ص ۵۱ - ۵۲۔

[2] یہ تھے مسعود کھگوان جن کے ساتھ ہوٹل شیزان میں سعید ملک کی معیّت میں ملاقات ہوئی۔

کے لیے مولانا مودودی نے جنگ بندی کو نیا مفہوم ان الفاظ سے دیا کہ:

"قتال بند ہوا ہے، جہاد جاری ہے۔" یہ جملہ تو باقاعدہ شعری بحر میں ہے۔

پھر معاہدۂ تاشقند نے جب بچے بچے کے دل کو مجروح کر دیا تو سمجھوتے کی میز پر معرکہ ہارنے والوں کو مولانا نے انتباہ کیا کہ:

> "دبانے والوں کی اس دنیا میں اگر آپ ایک بار دبتے ہیں تو یہ ایک دفعہ کا دبنا نہیں ہوگا۔ اس کے بعد آپ اپنا وجود تک قائم نہیں رکھ سکتے۔"

اور یہ حکیمانہ تلقین:

> "دنیا میں جنگ کوئی نہیں چاہتا ہے، لیکن جنگ سے زیادہ بُری چیز ایک اور ہے۔ اور وہ ہے ذلّت کی زندگی۔"

جی چاہتا ہے کہ اردو زبان و ادب کی جو خدمت مولانا مودودی نے کی ہے اس کا کچھ ذکر ہو جاتا۔ مولانا نے بنیادی طور پر دلّی کی زبان کے فریم میں توحید سے لے کر نظریۂ ارتقا تک، احیائے دین کی تاریخ سے لے کر ہیگل، مارکس کے فلسفے تک، خلافتِ راشدہ کے تذکرے سے لے کر D.N.A. (بنیادی حیاتی عناصر) کی بحثوں تک اور الجہاد فی الاسلام سے لے کر ضبطِ ولادت تک طرح طرح کے موضوعات پر جدید ترین اسالیب میں جو علمی و تحقیقی نگارشات قوم کو دی ہیں وہ ہماری کتابِ علم و فکر کے مستقل ابواب بن گئی ہیں یہ نگارشات اپنے اندر اصطلاحات، تشبیہات اور تمثیلات کا نیا سرمایہ لیے ہوئے ہیں۔

مگر جب حال یہ ہو کہ کاغذ کے قحط نے علم و ادب کے چمن اُجاڑ دیے ہوں اور اچھے اچھے جرائد کو جان کے لالے پڑے ہوں اور قلم کو وقت کے دربار میں فریادی بن کے پیش ہونے کے لیے پورا پیرہن بھی میسّر نہ ہو تو پھر علم و ادب کے تذکرے چھیڑ دینا بے تُکی بات ہے۔ جانے دیجیے۔

فی الوقت تو میری ساری توجہ اس خوش کُن اطلاع کی طرف پھر گئی ہے کہ مولانا مودودی دس ہزار میل کا فاصلہ طے کر کے جلد ہی پاکستان آنے والے ہیں۔

اور میں تصوّر ہی تصوّر میں دیکھتا ہوں کہ جیسے مولانا کے سرزمین پاکستان پر قدم

رکھتے ہی ہماری تاریخ پوری ممنونیت کے ساتھ ان کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہہ رہی ہے کہ اے ملّتِ اسلامیہ کی نشأۃ ثانیہ کے نقیب! تجھ سے زیادہ خوش نصیب کون ہوگا جس نے جیتے جی یہ منظر دیکھ لیا کہ تیرے پیغام کے بیج چاروں طرف پھل پھول کر ماحول کو خیاباں خیاباں بنا رہے ہیں۔ ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرے ہوئے انسان اپنے ریزے سمیٹ کر از سرِ نو اُٹھ رہے ہیں۔ "تفہیم القرآن"، مستقبل کے جہانِ افکار کو روشن کرنیوالا سُورج بن چکی ہے۔ آج تیرے مخالفین بھی تیری ہی اصطلاحوں کی مدد سے مسائل کو سوچتے اور تیرے ہی فکری سانچوں کو استعمال کرتے ہیں۔ مغرب کی ملحدانہ تہذیب کے خلاف ملک کے لاکھوں شریف اور باشعور شہری تیرے برپا کردہ جہاد میں کسی نہ کسی حیثیّت سے شریک ہیں، اور نئی نسلوں کے حلقے سے سرشار نوجوانوں کی ٹولیاں موج در موج اسلام کے محاذ پر آرہی ہیں ——— اور تو بُحرانوں کے اس دور میں سارے ملک کے لیے ایک سرچشمۂ امید ہے اور ایک علامتِ یقین افروز!

اس لمحے مولانا مودودی کے وہ الفاظ جو برسوں میرے ذہن میں رقصاں رہے ہیں، حالات کے تاریک افق پر روشنی کی ایک لکیر بن کر اُبھر آئے ہیں:

"میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ انقلاب کس طرح رونما ہوگا، لیکن جتنا مجھے کل سورج کے طلوع ہونے کا یقین ہے، اُتنا ہی اس بات کا یقین بھی ہے کہ یہ انقلاب بہر حال رونما ہو کر رہے گا۔"

تعلیمی انقلاب

کی

منفرد آواز

کسی قوم کی حقیقی آزادی کا نقطۂ آغاز دراصل باہر کے مسلّط کردہ نظریات و تصوّرات کے سلاسل و اغلال سے اس کے ایمان و فکر کا آزاد ہونا ہے۔ بیرونی سیاسی استیلار کے خاتمے اور کسی سامراج سے نجات پا لینے سے تو محض اس امر کا موقع پیدا ہوتا ہے کہ آزادی کی سمت میں گامزن ہونے والی قوم خارجی مداخلت کے اندیشے سے فارغ ہو کر اپنے جہانِ افکار کو تعمیر کر سکے، اپنے قومی تشخص کو مخصوص تہذیبی خدوخال کے ساتھ تاریخی حوادث کے اس ملبے سے نکال کر اور گردوغبار سے پاک کر کے ازسرِنو استوار کر سکے جس کے تودے کے تودے سامراجی یلغار کے نتیجے میں معاشرے کے ہر گوشے میں نمودار ہو جایا کرتے ہیں۔ ہم لوگوں کو اللہ کے فضل و کرم سے برطانوی شہنشاہیت اور اس کے سائے میں پل پوس کر ہمیں دبوچ لینے کی تیاری کرنیوالے برہمنی مہاجنی سامراج سے نجات پائے، آج ۲۹ سال پورے ہو گئے ہیں، لیکن افسوس کہ ابتک ہمارے معاشرے کے اُفق سے ایمان و فکر کا خورشیدِ زندگی افروز نہیں طلوع ہوا۔ ابھی ہم حقیقی آزادی کے اس نقطۂ آغاز تک پہنچنے کے لیے نت نئے راہزنوں کا دامن تھام کر خوف اور محرومیوں کی وادی میں ٹامک ٹوئیے مارتے پھرتے ہیں۔ ہماری ۲۹ سالہ داستانِ آزادی کتنی دُکھ بھری ہے! اس مدّت میں ہمارے سروں سے کبھی خون کی موجیں گزر گئیں اور کبھی آگ کی لہریں۔ یہاں تک کہ ہمارا نوتشکیل یافتہ وطن دو لخت ہو کر رہ گیا۔

دراصل ایمان و فکر کو کسی بھی نقشے پر نشوونما دینے میں کسی قوم کے نظامِ تعلیم کو بہت ہی مؤثر دخل حاصل ہوتا ہے۔ نظامِ تعلیم ہی نئی نسلوں کو کسی بلند نصبُ العین کی طرف پرواز کرنے کے لیے فکر و حکمت کے بال و پر دیتا ہے، مگر ہماری مصیبت یہ ہوئی کہ ہم آزادی کے ۲۹ سال گزار کر بھی رخصت ہو جانے والی سامراجی قوّت کے بنائے

ہوئے اس تعلیمی قفس میں گرفتار ہیں جس کی شان ہی یہی رہی کہ وہ نہ بال و پر اُگنے دیتا ہے اور نہ ذوقِ پرواز ہی سے اپنے پروردگان کو بہرہ مند ہونے دیتا ہے۔ یہ قفسِ تعلیم نہ جانے کیوں ایسی مقدّس میراث پا گیا ہے کہ اس میں ابتک معمولی قسم کے ردّ و بدل سے آگے بڑھ کر کسی حکمران قوّت نے یہ سوچنے تک کی جُرأت نہیں کی کہ اس قفس کو توڑ کر ملّت کا ایک آزاد نشیمن وجود میں لایا جائے۔ دوسرے لفظوں میں ہم تعلیمی غلامی سے نجات پانے کے قابل نہ ہو سکے۔

قومی زندگی میں نظامِ تعلیم کی وہی حیثیت ہے جو فرد کے لیے اس کے دماغ کی ہوتی ہے۔ اگر دماغ کسی ساحر کی ساحری اور کسی سامری کے طلسم کا شکار ہو جائے تو فرد کی ساری حرکات و سکنات اسی کی منشار کے مطابق نمودار ہوں گی، خواہ وہ اپنی جگہ یہ سمجھتا رہے کہ وہ اپنی آزاد سوچ بچار سے ہر اقدام کر رہا ہے۔ اگر اس کے اپنے دینی، ملّی اور خاندانی رجحانات کے خلاف متضاد قسم کے تہذیبی افکار و تصوّرات اس کے دماغ میں فاتحانہ شان سے گھس کر مستقل محاذ آرائی کی کیفیت پیدا کر دیں تو اس عقیدے اور اقدار ہر لمحہ ایک ایسی جنگ مسلسل سے دوچار رہیں گے جس میں روز اس کے اصول و روایات میں سے کچھ موت کے گھاٹ اُتر جاتے ہیں اور کچھ زخمی اور اپاہج ہو کے رہ جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں پراگندگیٔ افکار اور ذہنی انتشار کے روگ سے کوئی بچاؤ نہیں۔ ایسے ہی تضادات کے غیر مختتم تصادم کی وجہ سے بسا اوقات دماغ بالکل ہی چل جاتا ہے اور پھر جسم و اعضار کی تمام حرکات لایعنی بلکہ تخریبی ہو کے رہ جاتی ہیں۔ ٹھیک اسی طرح اگر ایک قوم کا نظامِ تعلیم فساد و اختلال کی کسی بھی خاص صورت کا شکار ہو جائے تو اس قوم کی تمام سیاسی معاشی اور ثقافتی سرگرمیوں میں بگاڑ اور ضرر پیدا ہو جاتا ہے۔

بدقسمتی سے ہم جس نظامِ تعلیم سے دوچار ہیں وہ ہمارے قومی وجود اور تہذیبی تشخّص سے غیر ہم آہنگ اور ہر لحظہ بر سرِ تصادم ہے۔ نتیجہ یہ کہ معاشرے کے کسی بھی شعبے کی کل سیدھی نہیں اور جو پہلے کچھ سیدھی تھی بھی، وہ بھی روز بروز ٹیڑھی ہوتی جا رہی ہے۔

لیکن کارفرما قوتوں نے کبھی تعلیم کے بنیادی مسئلے پر صحیح طور پر توجّہ ہی نہ دی۔

ہماری متذکرہ بنیادی قومی کوتاہی کے نتائج بد کی فصل ہمارے چاروں طرف لہلہا رہی ہے۔ ذہنی بانجھ پن، لامقصدیّت، جعل سازی، خیانت، ضمیر فروشی، ناشائستگی قانون شکنی بے ضابطگی، ہوس پرستی اور فحش پسندی کے روگ کتنے عام ہیں۔ اخلاقی کوڑھ میں اضافے کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ ہر شخص کام کے بغیر یا قلیل وقت میں کم کام کرکے جلد سے جلد بہت کچھ حاصل کرلینے کے درپے ہے۔ انفرادی اور قومی آمدنیوں کی افزائش سے پہلے معیارِ زندگی کو اونچا کرتے چلے جانے کا ماحصل اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ جائز وناجائز کی تمیز اٹھ جائے۔ حد یہ ہے کہ لوگ قوم کو بے وقوف بناکر اور قومی مفاد کو بیچ کر ذاتی زندگی کی جنتیں آراستہ کرتے ہیں۔ یہ خرابیٔ احوال تعلیم کی توسیع کے ساتھ ساتھ تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اس وجہ سے اس کی زیادہ تر ذمہ داری نظامِ تعلیم کے سر جاتی ہے۔ الغرض مدعا یہ ہے کہ مسئلہ تعلیم کسی قوم کا بے حد اہم اور بالکل اوّلین مسئلہ ہے اور اس پر توجّہ نہ دی جائے تو سارا معاشرہ چوپٹ ہو کے رہ جاتا ہے۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے تعلیمی افکار پر تحقیقی کام

ہماری تاریخ میں اپنے وقت کے حالات کو ملحوظ رکھ کر سر سیّد ایک تعلیمی اسکیم لے کر اٹھے تھے، لیکن اس اسکیم کا جو وقتی مقصد تھا وہ اپنے اچھے اور بُرے پہلوؤں کے ساتھ حاصل ہو چکا اور اب دورِ آزادی میں ایک آزاد مسلم ریاست کے لیے وہ اسکیم ذرّہ بھر کارآمد نہیں رہی۔

اس برِّصغیر میں آزادی ملنے سے کچھ عرصہ پہلے صحیح مسلم زاویۂ نگاہ سے پہلی بار ایک مکمل تعلیمی انقلاب کی آواز اٹھی۔ یہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی آواز تھی۔ صرف آواز ہی نہیں اٹھی، بلکہ آہستہ آہستہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں ایک جامع حکمتِ تعلیم، اس پر عمل پیرا ہونے کی اسکیم اور اس کے لیے خاکہ، نصاب وغیرہ مسائل پر اتنا مواد ہمارے سامنے رکھ دیا کہ اگر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور کوئی کام

نہ کرتے تو یہی ایک کارنامہ انھیں ہماری تاریخ کی ایک عظیم شخصیت بنانے کیلیے کافی تھا۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ماضی سے لے کر حال تک پھیلی ہوئی اس صفِ رجال میں سے ہیں جس کے ہر فرد کا سانحہ یہ ہے کہ اس کے سرچشمۂ علم سے استفادہ کرنے والے مخلصین کے مقابلے میں اس پر کیچڑ پھینکنے والوں کا انبوہ ہمیشہ کثیر التعداد رہا ہے۔ دراصل زمانہ ہر اس شخص سے انتقام لیتا ہے جو رُخ بدلنے کی سعی کرے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے انقلابی سعی نہ صرف تعلیم کے دائرے میں کی بلکہ دینی شعور و حکمت کے دائرے میں بھی پرزور طریق سے جاری رکھی۔ اتنے بڑے جرُم کی کچھ تو پاداشں ہونی چاہیے! مگر معاندین و حسود کے اٹھائے ہوئے طوفانوں کے درمیان قوم کے ذہین عناصر آہستہ آہستہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے پیغام کے حسین خدوخال کو پہچاننے لگے اور ان کے افکار سے استفادہ کرنے والوں کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔

ہر نظامِ تعلیم کسی تہذیب کا خادم ہوتا ہے

سب سے پہلے ہمیں گزشتہ پچاس سال سے نشو و نما پائی تاریخ کی وسعتوں میں تعلیمی انقلاب کے داعی کی حیثیت کو مشخّص کر لینا چاہیے۔ اس طرح ان کے افکار و اصطلاحات کو سمجھنا سہل تر ہو جائے گا۔

اصل میں مولانا مودودی مسلمانوں کے خلاف مغرب کی ملحدانہ و نفس پرستانہ تہذیب کی بڑھتی ہوئی فتوحات کے دور میں اُٹھے اور انھوں نے اس انسانیّت کُش اور اسلام دشمن تہذیب کی مزاحمت کا مجاہدانہ عزم باندھا اور کچلی پسی ہوئی مسلمان قوم کے اندر سے بیدار دل، زندہ ضمیر، اور محکم ایمان افراد کی بچی کھچی تعداد کو اپنی دردمندانہ پکار سے اُٹھا کر ایک محاذ پر لا کھڑا کیا۔

کوئی شخص جو اپنی تہذیب کے احیاء اور بیرونی تہذیب کی مزاحمت کے لیے اٹھا ہو، وہ اگر نظامِ تعلیم کے مسئلے سے تعارض نہ کرے تو اس کا شعور کیسے قابلِ اعتماد ہو سکتا ہے۔ چنانچہ مولانا نے جہاں اعتقادی، اخلاقی، سیاسی، اقتصادی اور

معاشرتی موضوعات کو نئے انداز سے چھیڑا، وہاں انھوں نے مروّجہ نظامِ تعلیم کو اپنی شدید تنقید کا ہدف بنایا اور اسلامی حکمتِ تعلیم کے خطوط اچھی طرح اُجاگر کیے اس سلسلے میں بنیادی کام تو حصُولِ آزادی اور تشکیلِ پاکستان سے پہلے ہی ہو چکا تھا، مگر پاکستان چونکہ بھاری مسلم اکثریت کی مملکت بنا اور اس کو اسلام کے نام پر استوار کیا گیا، اس تعلیم کی بحث کو مولانا مودودی نے اور بھی زور سے آگے بڑھایا، یہاں تک کہ اب اسلامی نظامِ تعلیم کا مکمّل تصوّر اُن کے آئینۂ افکار میں صاف دکھائی دیتا ہے۔

متذکرہ سطور کی تائید میں میں مولانا مودودی کے چند الفاظ یہاں درج کر رہا ہوں جن سے صاف عیاں ہے کہ مسئلہ تعلیم کو مولانا تہذیبی زاویۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں:

"ہر یونیورسٹی کسی کلچر کی خادم ہوتی ہے، ایسی مجرد تعلیم جو ہر رنگ اور ہر صورت سے خالی ہو، نہ آج تک دنیا کی کسی درس گاہ میں دی گئی ہے نہ آج دی جارہی ہے۔ ہر درس گاہ کی تعلیم ایک خاص رنگ اور ایک خاص صورت میں ہوتی ہے اور اس رنگ وصورت کا انتخاب پورے غور وفکر کے بعد اس مخصوص کلچر کی مناسبت سے کیا جاتا ہے جس کی خدمت وہ کرنا چاہتی ہے۔"[۱]

اس موضوع پر میرا موجودہ مطالعہ اتنا وسیع تو نہیں کہ میں حتمی طور پر دعویٰ کرسکوں کہ تعلیم کو ہمارے یہاں مولانا سے پہلے کسی شخص نے اس واضح سائنٹفک نظر سے نہیں دیکھا اور تعلیم و تہذیب (یا کلچر) کے ربطِ باہم کو یوں نمایاں نہیں کیا۔ مگر پھر بھی مولانا کا نقطۂ نظر بڑا امتیاز سا ہے۔ کچھ اقتباس اور:

"ترقیٔ علم و تمدّن کے موجبِ فلاح یا موجبِ ہلاکت ہونے کا تمام تر انحصار اس تہذیب پر ہے جس کے زیرِ اثر علوم وفنون اور تمدّن و حضارت کا ارتقاء ہوتا ہے ارتقار کا راستہ انسانی مساعی کا مقصد اور حاصل شدہ قوتوں کا مصرف متعیّن کرنے والی چیز دراصل تہذیب ہے۔"

(تنقیحات ص ۹۳)

---

[۱] مسلم یونیورسٹی علی گڑھ مجلسِ اصلاحِ نصاب دینیات کے استفسارات کے جواب میں وضاحتیں۔ تعلیمات ص۲۹

"حقیقت میں تعلیم کا مسئلہ ایک مملکت کے بنیادی مسائل میں سے ہے ——
اس کے سربراہ کاروں کو سب سے پہلے اس کی فکر ہونی چاہیے۔"

تقریر برکت علی محمڈن ہال لاہور ۲۵ فروری ۱۹۵۲ء

"اب اگر ہم اپنی ایک کلچر رکھتے ہیں، ہم ایک ایسی قوم ہیں جس کے اپنے کچھ عقائد ہیں، جس کا اپنا نظریۂ زندگی ہے، جس کا اپنا ایک نصب العین ہے، جو اپنی زندگی کے کچھ اصول رکھتی ہے تو لازماً ہمیں اپنی نئی نسلوں کو اس غرض کے لیے تیار کرنا چاہیے کہ وہ ہماری اس کلچر کو نہ صرف یہ کہ زندہ رکھیں بلکہ آگے انھیں بنیادوں پر اسے ترقی دیں جس پر ہماری یہ کلچر قائم ہے —— مجھے کوئی قوم ایسی معلوم نہیں جس نے اپنا نظامِ تعلیم خالص معروضی بنیادوں پر قائم کیا ہو اور اپنی نسلوں کو بے رنگ تعلیم دینے کی کوشش کی ہو۔ اسی طرح مجھے ایسی بھی کوئی قوم معلوم نہیں ہے جو دوسروں سے ان کا نظامِ تعلیم جوں کا توں لے لیتی ہو اور اپنی تہذیب کا کوئی رنگ اس میں شامل کیے بغیر اسی سانچے میں اپنی نئی نسلوں کو ڈھالتی چلی جاتی ہو"

(تقریر برکت علی محمڈن ہال لاہور ۲۵ فروری ۱۹۵۲ء (تعلیمات صفحہ ۱۴۲-۱۴۳)

"مولانا مودودی نے "تعلیمات" میں وہ چار وجوہ بیان کیے ہیں جن کی بنا پر وہ "انقلابِ تعلیم"، کو لازم گردانتے ہیں۔ یہاں ہم وجوہ درج نہیں کر رہے، بس واضح یہ کرنا مقصود ہے کہ انقلابِ تعلیم کی اصطلاح بھی خود موصوف کی وضع کردہ ہے اور ان کے تعلیمی افکار میں اس اصطلاح کا مفہوم مرکزی اہمیّت رکھتا ہے۔

نہایت اہم گفتگو وہ ہے جو مولانا نے نظامِ تعلیم کی بحث میں اسلام اور سائنس کے باہمی تعلّق کے بارے میں کی ہے۔ اس سے تعلیمی انقلاب کا وہ تصوّر اور اُجاگر ہو جاتا ہے جس کے علم بردار مولانا مودودی ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

"بہت سے لوگ اس خیال کو سُن کر بڑے پریشان ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سائنس کا آخر اسلام سے کیا تعلق، حالانکہ ان کے سامنے روس کی مثال

موجود ہے جو سوویٹ سائنس کا قائل ہے ــــــ کوئی کیمونسٹ اپنے اشتراکی معاشرے کے افراد کو بورژوا سائنس اور بورژوا فلسفہ و تاریخ اور سیاسیات وغیرہ پڑھانا پسند نہیں کرتا۔ یہ ان سب علوم کو مارکسزم کے رنگ میں رنگ کر پڑھاتا ہے تاکہ اشتراکی سائنس دان اور اشتراکی ماہرینِ علوم پیدا ہوں۔ بورژوا نقطۂ نظر سے مرتّب کیے ہوئے علوم کو پڑھا کر کوئی اشتراکی معاشرہ نہیں بن سکتا۔

یہ کہنا کہ سائنس تو ایک عالم گیر چیز ہے۔ اس کا کسی مذہب سے کوئی تعلق نہیں، فی الواقع بڑی ناسمجھی کی بات ہے۔ سائنس میں ایک چیز تو ہے وہ حقائق FACTS اور قوانینِ فطرت NATURAL LAWS جو تجربے اور مشاہدے سے انسان کے علم میں آتے ہیں۔ یہ بلاشبہ عالم گیر ہیں۔ دوسری چیز ہے، وہ ذہن جو ان حقائق اور معلومات کو مرتب کرکے ان پر نظریات قائم کرتا ہے اور وہ زبان جس میں وہ ان کو بیان کرتا ہے۔ یہ چیز عالم گیر نہیں، بلکہ اس میں ہر تہذیب کے پیرؤوں کا اسلوب الگ الگ ہے اور فطرتاً الگ ہونا چاہیے۔ ہم اس دوسری چیز کو بدلنا چاہتے ہیں نہ کہ پہلی چیز کو“

(طلبہ کے ایک سالانہ اجتماع میں تقریر (تعلیمات۔ ص ۲۳۸، ۲۳۹)

سائنس کے دائرے میں تجربات و مشاہدات حواس کے ساتھ مفروضاتِ قیاس سے مل کر کام کرتے ہیں۔ سائنس کے ایک ایک ذرّۂ حقیقت کے گرد بالعموم پورا ایک جہانِ مفروضات تعمیر ہو جاتا ہے اور اصطلاحِ عام میں یہ سب کچھ سائنس کہلاتا ہے۔ مولانا نے ایک مثال دے کر مدّعا کو واضح تر کر دیا ہے:۔

”مثال کے طور پر دیکھیے، یہ ایک سائنٹفک حقیقت ہے کہ دنیا کی تمام دوسری چیزیں سرد ہو کر سکڑتی چلی جاتی ہیں مگر اس کے برعکس پانی جب سرد ہوتے ہوئے جمنے کے قریب ہوتا ہے تو پھیل جاتا ہے اور برف

بن کر ہلکا ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے برف سطحِ آب پر تیرنے لگتی ہے۔ یہ ایک امرِ واقعہ ہے۔ اب ایک شخص اس چیز کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ پانی کی یہ خاصیّت ہے اور واقعتًا ایسا ہوا کرتا ہے۔ دوسرا شخص اس واقعہ کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ خدا نے اپنی حکمت وربوبیّت سے پانی میں یہ خصوصیّت اس لیے رکھی ہے کہ دریاؤں اور تالابوں اور سمندروں میں جاندار مخلوق باقی رہ سکے ـــــ دیکھیے ایک ہی امرِ واقعہ کو دو شخص اپنے اپنے طرزِ فکر کے مطابق دو مختلف طریقوں سے بیان کرتے ہیں اور ہر ایک کا بیان پڑھنے سے آدمی کے ذہن پر دو مختلف اثرات مرتب ہوتے ہیں ـــــ ایک طریقے سے اگر پڑھا جائے تو اس سے ایک مادّہ پرست سائنسدان تیار ہوگا اور دوسرے طریقے سے وہی سائنس پڑھائی جائے تو ایک مسلمان تیار ہو جائے گا۔"

تقریر متذکرہ بالا۔ (تعلیمات۔ ص ۲۳۹-۲۴۱)

مروّجہ سائنس جن بنیادی تصوّرات پر کھڑی ہے ان سے زیادہ غیر عقلی تصوّر شاید ہی کوئی ہو کہ سائنس جہانِ مادّی کے ایک ایک ذرّے پر "قانون" کی کارفرمائی کا دعویٰ کرتی ہے، لیکن اتنے وسیع و بے پایاں عقلی قانونی نظام کے بارے میں وہ یہ رائے رکھتی ہے کہ اس سارے عقلی نظامِ قانون نے غیر عقلی "اتفاق" سے جنم لیا ہے۔ سیدھی بات ہے کہ جہاں قانون ہے وہاں تمھیں کسی حکیم و علیم قانون ساز کے وجود کو ماننا ہوگا اور قانون کے صحیح طور پر مسلسل چلتے رہنے کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ قانون ساز قانون کو چلانے کے لیے قوت و اقتدار بھی رکھتا ہے، لیکن مادّہ پرستوں کی مرتب کردہ سائنس کی اتنی بڑی عقلی حماقت کو نظامِ تعلیم کے واسطے سے ہم مسلمانوں نے بلا کسی ردّوکد کے قبول کر لیا ہے۔

تعلیمی انقلاب کے داعی نے سائنس کی تعلیم کے بارے میں کلمۂ تکمیل کے طور پر کہا ہے کہ:

"حقیقت یہ ہے کہ سائنس کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جو انسانوں کے دل میں ایمان کو گہری جڑوں سے راسخ کر دینے والا نہ ہو۔ فزکس، بیالوجی، فزیالوجی اناٹومی، اسٹرانومی، غرض جس علم کو بھی آپ دیکھیں اس میں ایسے ایسے حقائق سامنے آتے ہیں جو انسان کو پکّا اور سچّا مومن بنا دینے کے لیے کافی ہیں ــــ یہی وہ آیات ہیں جن کی طرف قرآن بار بار توجہ دلاتا ہے، مگر صرف اس وجہ سے کہ کافر سائنس دان نے ان حقائق کو اپنے نقطۂ نظر سے مرتب اور بیان کیا ہے، ان کو پڑھ کر آدمی اُلٹا مادّہ پرست اور ملحد بنتا ہے اور خدا کے تصوّر پر ہنستا اور اس کا مذاق اُڑاتا ہے ـــــ ہم بے خدا سائنس اور بے خدا فلسفہ اور اجتماعی علوم پڑھا کر خدا پرست انسان تیّار نہیں کر سکتے۔"

"(تعلیمات ص ۱۴۱)

زیرِ تحقیق انقلابی نظریۂ تعلیم اسلامی فکر کو پورے مضامین و نصابات پر جس طرح غالب و مسلط کر دینا چاہتا ہے اس کا اندازہ سائنس کے متعلق متذکرہ اقتباس سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

نظامِ تعلیم اور مسئلۂ قیادت و امامت

مولانا مودودی نے ستمبر ۱۹۳۴ء میں لکھا تھا کہ "دنیا گویا ایک ریل گاڑی ہے جس کو فکر و تحقیق کا انجن چلا رہا ہے۔" (تنقیحات ۔ص ۲۱)

جنوری ۱۹۴۱ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں، انجمن اتحادِ طلبہ کے سامنے جو خطبہ مولانا نے پڑھا، اس میں فرمایا کہ "امامت کا دامن ہمیشہ علم سے وابستہ رہے گا۔"

(تقریر ندوۃ العلماء، ۵ جنوری ۱۹۴۱ء (تعلیمات ص ۶۸)

دنیائے انسانیت کی امامت یا قیادت LEADERSHIP کے اسی تصوّر کی بنا پر اسلامی یونیورسٹی کا خاکہ مرتب کرتے ہوئے مولانا نے مقصدِ تعلیم یہ قرار دیا کہ "وہ ایسے صالح علماء تیار کرے جو اس دورِ جدید میں ٹھیک دینِ حق کے مطابق

دنیا کی رہنمائی کرنے کے قابل ہوں۔" تقریر متذکرہ (تعلیمات۔ص ۶۸)

اگر میں یہ کہوں تو شاید بات غلط نہ ہوگی کہ تعلیم و امامت کے اسی تعلق کی بنا پر ۱۹۴۴ء میں دارالاسلام پٹھان کوٹ کی مجلسِ تعلیمی کے سامنے مولانا نے صراحت سے کہا تھا کہ:

"اس وقت ہمارے ملک میں جتنے نظام ہائے تعلیم رائج ہیں، ان میں سے کوئی بھی اس مقصد کے لیے آدمی تیار نہیں کرتا جو ہمارے پیشِ نظر ہے —— ہمیں صرف یہی نہیں کرنا ہے کہ نوخیز نسلوں کی علمی اور ذہنی تربیّت کا انتظام اپنے نصب العین کے مطابق کریں بلکہ اس کے ساتھ ان کی اخلاقی اور عملی تربیّت کا بھی بندوبست کرنا ہے۔"

(رودادِ مجلسِ تعلیمی پٹھان کوٹ۔ منعقدہ ۱۹۴۴ء)۔(تعلیمات ص ۱۰۴)

یہاں بات اصل تصوّر سے کسی قدر محدود شکل میں سامنے آتی ہے۔ اس کی وجہ بھی سُن لیجیے:

"اس وقت ہم کسی ملک کے انتظام کا چارج نہیں لے رہے ہیں کہ ہمیں اپنے نظامِ تعلیم میں ان ضرورتوں کے لیے آدمی تیار کرنے ہوں جو ایک ملک کے تمدّن کی پوری مشینری کو چلانے میں پیش آتی ہیں۔ ہمارے سامنے اس وقت صرف ایک کام ہے اور وہ یہ ہے کہ دنیا میں اخلاقی، فکری اور عمرانی انقلاب برپا کرنے کے لیے موزوں لیڈر اور کارکُن تیّار کریں۔"

رودادِ مجلسِ تعلیمی پٹھان کوٹ ۱۹۴۴ء (تعلیمات۔ ص ۱۰۵)

بہر حال مولانا ابوالاعلیٰ مودودی جس انقلابی دعوتِ تعلیم کو لے کر اٹھے ہیں، اسکی رُو سے علم و تعلیم اور امامت و قیادت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جو قوم تعلیم اور علم و تحقیق میں آگے بڑھتی ہے، وہی دوسروں کے لیے پیش رو بنتی ہے اور اسی کی تقلید کی جانے لگتی ہے۔ علم اسے اس فکری و ذہنی استیلا اور سیاسی و اقتصادی فوقیت کا راستہ بنا کے دیتا ہے۔

اس خاص بحث کے لیے تنقیحات (از مولانا ابوالاعلیٰ مودودی) کے بیشتر مضامین خصوصًا اس کے پہلے مقالے "ہماری ذہنی غلامی اور اس کے اسباب" سے بہت مفید مواد اخذ کیا جا سکتا ہے۔

تعلیم اور امامت کے تعلق کو سامنے رکھ کر نظامِ تعلیم پر سوچنے کے لحاظ سے بھی مولانا بڑی حد تک منفرد مقام رکھتے ہیں اور پھر اس تعلق کی وضاحت بھی انھوں نے اپنی تحریروں میں بڑے زورِ بیان سے کی ہے۔

"علم برائے امامتِ عالم" کے اس نظریے کے فریم میں تعلیم کے متعلق ان کا انقلابی فکر نصب ہوا ہے، اور اس کلیے کی روشنی میں ان کے مختصر سے اس فقرے کا مدّعا سمجھ میں آسکتا ہے کہ:

"اسلام میں ایک نشأۃِ جدید RENAISSANCE کی ضرورت ہے۔"

کیونکہ:

"پرانے اسلامی مفکّرین و محققین کا سرمایہ اب کام نہیں دے سکتا ـــــ علم و عمل کے میدان میں وہی رہنمائی کرسکتا ہے جو دنیا کو آگے کی جانب چلائے، نہ کہ پیچھے کی جانب۔ لہٰذا اب اگر اسلام دوبارہ دنیا کا رہنما بن سکتا ہے تو اس کی بس یہی ایک صورت ہے کہ مسلمانوں میں ایسے مفکّر اور محقق پیدا ہوں جو فکر و نظر اور تحقیق و انکشاف کی قوّت سے ان بنیادوں کو ڈھا دیں جس پر مغربی تہذیب کی عمارت قائم ہے۔"

(تنقیحات۔ ص ۲۲، ۲۳)

اتنا بڑا معرکہ مولانا کے سامنے، وہ عالمگیر تصوّر رکھنے والی، مغربی تہذیب کی عمارت کی بنیادیں ڈھا دینا چاہتے ہیں اور اس کے لیے علم و تحقیق اور نظامِ تعلیم کی قوت کو برسرِ عمل لانا چاہتے ہیں۔

مسلم تعلیم گاہوں کا ناقدانہ جائزہ

مولانا مودودی کے انقلابی فکر کو سمجھنے میں ہمیں وہ تنقیدی تحریریں بہت مدد

دیتی ہیں جو جدید اور قدیم ہر دو قسم کی قائم شدہ مسلم تعلیم گاہوں کی اسکیموں کے اساسی تصوّرات کا احتساب کرتی ہیں۔ کسی ڈھانچے کے اندر جامد ذہن کے لوگ تو سکون سے چلتی رو میں بہتے رہتے ہیں اور کسی ڈھانچے کے اندر بعض پسندیدہ اجزار دیکھ کر خوش ہو جاتے ہیں۔ پھر کچھ مصلحین ہوتے ہیں جو اساسیّات کو چھیڑے بغیر تفصیلی مظاہر میں دو چار تبدیلیوں کے لیے کوشش کرتے ہیں، لیکن انقلابی ذہن کا آدمی اساسیات اور ڈھانچے کی مجموعی حیثیت کی غلط ساخت پر گرفت کرتا ہے اور اس میں تبدیلی کی دعوت دیتا ہے۔ جدید و قدیم دونوں قسم کی مسلم تعلیم گاہوں اور ان کی تعلیمی اسکیموں پر مولانا مودودی نے اسی حیثیت سے ناقدانہ نگاہ ڈالی ہے۔

علی گڑھ یونیورسٹی کا قیام جن اُمنگوں اور آرزوؤں کے ساتھ کیا گیا تھا، ان کے لحاظ سے دیکھیں تو یہ تعلیمی مرکز بڑی تاریخی اہمیّت کا حامل تھا اور اس کے داعئ اوّل سر سیّد احمد خاں کے حصّے میں یہ کریڈٹ ضرور جاتا ہے کہ وہ مسلم قوم کے ایک خوف ناک دورِ شکست میں فکری لیڈر بن کر اُبھرے اور ڈوبتی قوم کو بچانے کے لیے جو کچھ بھی ان کی سمجھ میں آیا اس کے لیے جدّوجہد شروع کر دی۔ ان کی مساعی کی قیمت وقتی اور فوری بلکہ اضطراری تدبیر کے لحاظ جو ہے سو ہے مگر ان کی اسکیم نے آگے چل کر کچھ اچھّے نتائج کے ساتھ جو بہت سے بُرے نتائج پیدا کیے اُن کا احساس خود سر سیّد احمد خاں کو بھی ہو گیا تھا۔ مگر اب جو دریا بہہ نکلا اس کا رُخ بدلنا ان کے بس میں نہ تھا اور نہ ان کے بعد مضطرب ہو کر اصلاحات کرنے والے کوئی مؤثر اقدام کر سکے۔ خرابی خود اسکیم کے اندر ایسی تھی کہ اس کے سانچے میں ڈھل کر مسلم تہذیب کی علم برداری کرنے والے اور مغربی تہذیب کے مقاصد کا مقابلہ کرنے والے دل و دماغ پیدا نہ ہو سکتے تھے۔ وہ صرف ابتدائی دور تھا جس کے جذباتی ماحول میں چند قابلِ قدر نمایاں شخصیّتیں اُبھریں۔ اس کے بعد مسلم قوم پرستوں سے لیکر ملحدوں اور کمیونسٹوں تک کی کھیپیں تیّار ہونے لگیں۔ "مسلم بلا اسلام" یا "افرنگ پرست مسلم" کا نیا کردار بھی اس "اسلامی" ادارے نے ڈھالنا شروع کر دیا۔ اور یہ کردار مسلمانوں کے بیشتر طبقوں میں آج بھی نمایاں دکھائی دیتا ہے۔

اور اس کے کارناموں کے برگ و بار زندگی کے ہر شعبے میں پھیلے ہوئے ملتے ہیں۔ مولانا کا مطالعۂ احوال یہ تھا یہ سب کچھ اتفاقی حادثے کے طور پر نہیں ہو رہا بلکہ علی گڑھ کی تعلیمی اسکیم سے اسی کی توقع کی جا سکتی ہے۔

علی گڑھ کا نظامِ تعلیم

آئیے خود مولانا کے الفاظ کے آئینے میں حقیقت کا انعکاس دیکھیں:

"علی گڑھ سے جو تعلیمی تحریک اٹھی تھی اس کا وقتی مقصد یہ تھا کہ مسلمان اس نئے دور کی ضرورت کے لحاظ سے اپنی دنیا درست کرنے کے قابل ہو جائیں ـــــــ اس وقت اس سے زیادہ کچھ کرنے کا شاید موقع نہ تھا۔ اس وقت اتنی مہلت نہ تھی کہ غور و تفکّر کے بعد کوئی ایسی محکم تعلیمی پالیسی متعیّن کی جاتی جو نقصانات سے پاک اور فوائد سے لبریز ہوتی ـــــــ مسلمانوں کو اس طرزِ تعلیم کی طرف دھکیل دیا گیا جو ملک میں رائج ہو چکا تھا اور خطرات سے بچنے کے لیے کچھ تھوڑا سا عنصر اسلامی تعلیم و تربیت کا بھی رکھ دیا گیا۔ جس کو جدید تعلیم اور جدید تربیت کے ساتھ کوئی مناسبت نہ تھی ـــــــ اس تحریک نے ہماری دنیا تو ضرور بنا دی مگر جتنی دنیا بنائی اس سے زیادہ ہمارے دین کو بگاڑ دیا ـــــــ اس نے ہم میں کالے فرنگی پیدا کیے ـــــــ اس نے ہماری قوم کے طبقۂ علیا اور طبقۂ متوسّط کو، جو اصل قوم کے اعضائے رئیسہ ہیں، باطنی اور ظاہری دونوں حیثیتوں سے یورپ کی مادّی تحقیق کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ صرف اتنے معاوضے پر کہ چند عہدے، چند خطاب، چند کرسیاں ایسے لوگوں کو مل جائیں جن کے نام مسلمانوں سے ملتے جلتے ہوں۔

ـــــــ سوال یہ ہے کہ کیا اب دائماً ہماری یہی تعلیمی پالیسی ہونی چاہیے۔ اگر یہی ہماری دائمی پالیسی ہے تو اس کے لیے علی گڑھ کی کوئی ضرورت اب باقی نہیں رہی۔ ہندوستان کے ہر بڑے مقام پر ایک علی گڑھ موجود ہے۔"

(ترجمان القرآن اگست ۳۶ء میں ایک خصوصی بحث۔ "تعلیمات۔ ص ۱۸، ۱۹)

اس تعلیمی پالیسی میں خرابی کی وجہ کیا ہے اس پر مولانا کی رائے سُنیئے:

آپ ان کو (یعنی نئی نسلوں کو) وہ فلسفہ پڑھاتے ہیں جو کائنات کے مسئلے کو خدا کے بغیر حل کرنا چاہتا ہے۔ آپ ان کو وہ سائنس پڑھاتے ہیں جو معقولات سے منحرف اور محسوسات کا غلام ہے۔ آپ ان کو تاریخ، سیاسیات، معاشیات، قانون اور تمام علوم عمرانیہ کی وہ تعلیم دیتے ہیں جو اپنے اصول سے لے کر فروع تک اور نظریات سے لے کر عملیات تک اسلام کے نظریات اور اصولِ عمران سے یکسر مختلف ہے ـــــ اس کے بعد کس بنا پر آپ یہ امید رکھتے ہیں کہ ان کی نظر اسلامی نظر ہوگی، ان کی سیرت اسلامی سیرت ہوگی، ان کی زندگی اسلامی زندگی ہوگی؟ قدیم طرز پر قرآن وحدیث اور فقہ کی تعلیم اس نئی تعلیم کے ساتھ بے جوڑ ہے ـــــ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے فرنگی سٹیمر میں پرانے بادبان محض نمائش کے لیے لگا دیے جائیں، مگر ان بادبانوں سے فرنگی سٹیمر قیامت تک اسلامی سٹیمر نہ بنے گا۔" (مضمون ترجمان القرآن متذکرہ۔ (تعلیمات۔ ص۔ ۱۹، ۲۰)

مزید چند سطور:

"اس وقت مسلم یونیورسٹی میں جو طریقِ تعلیم رائج ہے، وہ تعلیمِ جدید اور اسلامی تعلیم کی ایک ایسی آمیزش پر مشتمل ہے جس میں کوئی امتزاج اور کوئی ہم آہنگی نہیں ـــــ یہ دونوں عنصر نہ صرف الگ رہتے ہیں بلکہ ایک دوسرے کی مزاحمت کرکے طلبہ کے ذہن کو دو مخالف سمتوں کی طرف کھینچتے ہیں۔"

(تعلیمات۔ ص ۲۵)

"میری نظر میں مسلم یونیورسٹی کی دینی و دنیاوی تعلیم بہ حیثیتِ مجموعی بالکل وہی ہے کہ آپ ایک شخص کو از سر تا پا غیر مسلم بناتے ہیں پھر اس کی بغل میں دینیات کی چند کتابوں کا ایک بستہ دے دیتے ہیں ـــــ اگر آپ ان حالات اور اس طرزِ تعلیم کو بعینہٖ جاری رکھیں ـــــ تو اس کا حاصل صرف یہ ہوگا کہ فرنگیت

اور اسلامیات کی کشمکش زیادہ شدید ہو جائے گی اور ہر طالبِ علم کا دماغ ایک رزم گاہ بن جائے گا۔

(مجلس اصلاح نصاب علی گڑھ کے استفسارات کا جواب) (تعلیمات۔ ص ۲۷، ۲۸)

ندوہ کا نظامِ تعلیم

۵ جنوری ۱۹۴۱ء کو دارالعلوم ندوۃ العلماء کے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے مولانا نے اس تعلیمی ادارے کی اسکیم پر بھی ایک تنقیدی نگاہ ڈالی۔ فرمایا:

"لوگ اس گمان میں ہیں کہ پرانی تعلیم میں خرابی صرف اتنی ہے کہ نصاب بہت پرانا ہو گیا ہے اور اس میں بعض علوم کا عنصر بعض علوم سے کم یا زیادہ ہے اور جدید زمانہ کے بعض علوم اس میں شامل نہیں۔ اس لیے اصلاح کی ساری بحث اس حد تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے کہ کچھ کتابوں کو نصاب سے خارج کر کے دوسری کتابوں کو داخل کر دیا جائے ــــــ اور بہت زیادہ روشن خیالی پر جو لوگ اتر آتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ صاحب ہر مولوی کو میٹرک تک انگریزی پڑھا کر نکالو تاکہ کم از کم تار پڑھنے اور لکھنے کے قابل تو ہو جائے ــــــ اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اگر کچھ ہو سکتا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ پہلے سے کچھ زیادہ کام یاب قسم کے مولوی پیدا ہو جائیں جو کچھ جرمنی اور امریکہ کی باتیں بھی کرنے لگیں اس ذرا سی اصلاح کا نتیجہ یہ کبھی نہیں نکل سکتا کہ دنیا کی امامت و قیادت کی باگیں علماء اسلام کے ہاتھوں میں آجائیں۔" (تعلیمات۔ ص ۶۶، ۶۷)

مولانا کے نزدیک اس تعلیم کا متوقع ماحصل بس یہ ہے کہ:۔

"آپ گھٹیا قسم کے نہ سہی، بڑھیا قسم کا مقتدی بن جائیں، امامت بہر حال آپ کو نہیں مل سکتی۔ اس وقت تک جتنی اصلاحی تجاویز میری نظر سے گزری ہیں وہ سب کی سب بہتر مقتدی بنانے والی ہیں، امام بنانے والی کوئی تجویز ابھی تک سوچی نہیں گئی۔" (تعلیمات۔ ص ۷۳)

عام قسم کے اسلامی کالج

انگریزی نظامِ تعلیم پر کام کرنے کے لیے جو اسلامی کالج قائم ہوتے رہے ان پر مولانا کی تنقید نسبتاً زیادہ سخت انداز میں سامنے آتی ہے اور اس تنقید میں ان کا ذوقِ انقلابیت خوب نمایاں ہے۔ ایک ایسے ہی کالج کے جلسۂ تقسیم اسناد کا جو زلزلہ افگن خطبہ مولانا نے دیا اس کے چند جملے پیش ہیں:

"دراصل میں آپ کی اس مادرِ علمی کو اور مخصوص طور پر اسی کو نہیں بلکہ ایسی تمام مادرانِ تعلیم کو درس گاہ کے بجائے قتل گاہ سمجھتا ہوں، اور میرے نزدیک آپ فی الواقع یہاں قتل کیے جاتے رہے ہیں، اور یہ ڈگریاں جو آپ کو ملنے والی ہیں یہ دراصل موت کے صداقت نامے DEATH CERTIFICATE ہیں جو قاتل کی طرف سے آپ کو اس وقت دیے جا رہے ہیں جب کہ وہ اپنی حد تک اس بات کا اطمینان کر چکا ہے کہ اس نے آپ کی گردن کا تسمہ تک لگا رہنے نہیں دیا ہے ——— میری مثال اس شخص کی سی ہے جو اپنے بھائی بندوں کا قتل عام ہو چکنے کے بعد لاشوں کے ڈھیر میں یہ ڈھونڈتا پھرتا ہو کہ کہاں کوئی سخت جان نیم بسمل ابھی سانس لے رہا ہے۔"

(تعلیمات ص ۵۳، ۵۴)

"ہر قوم کے بچّے دراصل اس کے مستقبل کا محضر ہوتے ہیں۔ قدرت کی طرف سے یہ محضر ایک سادہ لوح کی شکل میں آتا ہے اور قوم کو یہ اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ خود اس پر اپنے مستقبل کا فیصلہ لکھے۔ ہم وہ دیوالیہ قوم ہیں جو اس محضر پر اپنے مستقبل کا فیصلہ خود لکھنے کے بجائے اسے دوسروں کے حوالے کر دیتے ہیں کہ وہ اس پر جو چاہیں ثبت کر دیں، خواہ وہ ہماری اپنی موت ہی کا فتویٰ کیوں نہ ہو۔"

(تعلیمات۔ ص ۵۸)

اس نظامِ تعلیم کا یہ مایوس کن پہلو ہے کہ وہ کوئی مقصد طلبہ کو نہیں دیتا اس کی طرف مولانا نے خصوصی توجہ دی ہے۔

"مجھے بکثرت ایسے نوجوانوں سے ملنے کا موقع ملتا ہے جو اعلیٰ تعلیم پا رہے ہیں، یا تازہ تازہ فارغ ہوتے ہیں — مگر میری مایوسی کی انتہا نہیں رہتی جب میں دیکھتا ہوں کہ مشکل سے ہزاروں میں کوئی ایک ایسا ملتا ہے جو اپنے سامنے زندگی کا مقصد رکھتا ہو — اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کی یہ حالت دیکھکر میرا سر چکرانے لگتا ہے۔ میں حیران ہو کر سوچنے لگتا ہوں کہ اس نظامِ تعلیم کو کس نام سے یاد کروں جو پندرہ بیس سال کی مسلسل دماغی تربیّت کے بعد بھی انسان کو اس قابل نہیں بناتا کہ وہ اپنی قوّتوں اور قابلیتوں کا کوئی مصرف اور اپنی کوششوں کا کوئی مقصد متعیّن کر سکے — یہ انسانیّت کو بنانے والی تعلیم ہے یا اس کو قتل کرنے والی ؟"

(تعلیمات۔ ص ۵۹، ۶۰)

اور اسلامی نقطۂ نگاہ سے :

"کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ موجودہ نظامِ تعلیم میں ملّتِ اسلام کے نونہالوں کی تعلیم و تربیت کے لیے جو انتظام کیا جاتا ہے وہ دراصل ان کو اس ملّت کی پیشوائی کے لیے نہیں بلکہ غارت گری کے لیے تیّار کرتا ہے۔"

(تعلیمات۔ ص ۶۲)

مُثبت دعوت

مولانا مودودی نے ایک صحیح اسلامی نظامِ تعلیم کے سلسلے میں متعدّد اہم چیزیں تحریر کی ہیں، ان کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ یہاں اجمال سے ان کا مرکزی نقطۂ نظر عرض کیا جاتا ہے۔

"— اگر فی الواقع ہم ایک اسلامی نظامِ تعلیم قائم کرنا چاہتے ہیں تو

محض مرمّتیں اور داغ دوزیاں کرنے سے کام نہیں چل سکتا بلکہ اس کے لیے ایک انقلابی قدم اٹھانے کی ضرورت ہے۔"

"درحقیقت اب یہ ناگزیر ہو چکا ہے کہ وہ دونوں نظامِ تعلیم ختم کر دیے جائیں جو اب تک ہمارے ہاں رائج ہیں۔ پُرانا مذہبی نظامِ تعلیم بھی ختم کیا جائے اور یہ موجودہ نظامِ تعلیم بھی جو انگریز کی رہنمائی میں قائم ہوا تھا۔ ان دونوں کی جگہ ہمیں ایک نیا نظامِ تعلیم بنانا چاہیے جو ان کے نقائص سے پاک ہو اور ہماری ان ضرورتوں کو پورا کر سکے جو ہمیں ایک مسلمان قوم، ایک آزاد قوم اور ایک ترقی کی خواہش مند قوم کی حیثیّت سے اس وقت لاحق ہیں۔"

(تعلیمات۔ ص ۱۴۰۔ ۱۴۱)

انقلابِ تعلیم کا یہ پیغام دیتے ہوئے مولانا نے ایک سے زیادہ مقالات میں مطلوبہ اسلامی نظامِ تعلیم کا خاکہ اور اس کے اساسی اصول واضح کیے ہیں۔ مزید تفاصیل کوئی دیکھنا چاہے اصل مقالات و مباحث میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

لسانی و ادبی خدمات

اُردو زبان کی خوبیٔ قسمت کہ اِسے مودودی جیسا قلم راں ملا، جس کے گرد ہم خیالوں کی سلطنتِ محبّت جتنی جتنی وسیع ہوتی گئی، اُردو کے جھنڈے بھی اسی قدر دُور دُور تک گڑتے چلے گئے۔

عجیب بات یہ ہے کہ اگر ہم اردو کی پچھلی ساری تاریخ کو دیکھیں تو دینی تحریکوں، مذہبی اکابر اور رُوحانی شخصیتوں نے اس کے فروغ میں اتنا زیادہ حصّہ لیا ہے کہ اب اربابِ الحاد اور فریفتگانِ مادیّت جب اسے اپنی مقصد برآری کے لیے استعمال کرتے ہیں تو یہ کچھ ایسا ہی لگتا ہے جیسے کسی مسجد کی اینٹیں اُکھیڑ اُکھیڑ کر کچھ تیز طرّار لوگ میخانہ تعمیر کر رہے ہوں۔ اردو کا خزانہ جمع کرنے میں تو اسلامی ذہنوں کا حصّہ ہے، لیکن آج یہ خزانہ ایسے لکھ لُٹوں کے ہتھّے چڑھ گیا ہے جن کا بس چلے تو اسلام کے لفظ کو گالی بنا دیں۔

پچھلے قریبی دور میں دیکھیں تو تحریکِ خلافت نے اردو زبان کے دامن میں بیشمار اہلِ قلم کے واسطے سے بہت کچھ ڈالا۔ تحریکِ آزادی اور تحریکِ پاکستان نے کتابوں اور مقالات، شاعری اور تقاریر کے واسطوں سے اُردو کو نوازا۔ تحریکِ مجاہدین نے نہ صرف اپنے عہد میں ہمارے کلاسیکل اساتذۂ سخن کے کلام اور اس دور کی اردو صحافت میں نفوذ کیا بلکہ آج درجن بھر کتابیں ہماری تاریخ کے اس طوفانِ ساحل شکن پر موجود ہیں۔ تحریکِ ختمِ نبوّت کے لیے جو اثباتی کام ہوا اور قادیانیّت کے خلاف ہزار ہا قلموں اور زبانوں کی جنبشوں سے معانی کے جو زیور بانوئے اردو کے لیے تیار ہوئے، لسانی صیرفیوں کا کام ہے کہ ان کے وزن اور قیمت کا اندازہ کریں۔ پاکستان کے بننے پر، اور پاکستان میں تحریکِ اسلامی یا تحریکِ دستورِ اسلامی کے اٹھنے پر خاصا بڑا کام ہوا۔ ۱۹۶۵ء میں جب قومی آزمائش کا زمانہ آیا تو الحاد اور سیکولرازم اور فحاشی کے تمام رجحانات ادب سے غائب ہو گئے اور سازِ سخن سے جہاد و شہادت کے نغمے اُبلنے لگے۔ ۱۹۷۰ء میں سوشلزم اور

پھر اسلامی سوشلزم کے فکری تموّج کے خلاف اُردو میں قرآن و محمدؐ سے محبت کرنے والوں نے بھی طوفانی لہریں اٹھائیں۔ ۱۹۷۱ء میں پاکستان کا ایک ٹکڑا الگ ہونے کا حشر انگیز سانحہ پیش آیا تو اس کے نتیجے میں صدّیق سالک اور مسعود مفتی کے دائیں بائیں اور بھی سینکڑوں افراد تھے جنھوں نے کتابوں، ڈائجسٹوں اور اخباروں میں اپنے خونِ دل کے قطروں کو موتیوں میں بدل کر اردو کے قدموں میں نچھاور کیا۔ آزمائشیں اور مصیبتیں جب کبھی آئیں اور ان کا مقابلہ کرنے کے لیے جب بھی تحریکیں اٹھیں تو ہمارے آزاد طبقوں کے اندر سے بھی یہ شعورِ مدفون اُبھر آیا کہ تم مسلمان ہو۔ تفسیرِ قرآن اور سیرتِ رسولؐ اور تاریخ ملّتِ اسلامیہ اور اسلاف کی سوانح اور فقہی احکام سے مالا مال اردو زبان اسلام کی کرامات اور عنایات سے فیض یافتہ ہے۔ اس زبان کا حق آتا ہے کہ جو شخص بھی اسلام کی بات کرنے کے لیے اُٹھے وہ اُردو کے ساتھ لطف و احسان کا معاملہ کرے۔ اور سیّد مودودی نے اُردو کا حق ادا کیا اور اس زبان کے سامنے ہزارہا صفحوں کی کتابوں کا ایک گلدستۂ عظیم بنا کر پیش کیا۔

یاد آیا کہ پٹھانکوٹ کے زمانے میں اپنے پیش رو قمرالدّین خاں کے چلے جانے کے بعد علمی اور تحریکی مباحث سے متعلق مولانا مودودی کے روز بروز بڑھتے ہوئے خطوط کے جواب ارسال کرنا میرے ذمّہ تھا۔ طریقہ یہ تھا کہ ہر دوسرے تیسرے دن جب مولانا کو وقت ملتا تو وہ مجھ کو بلوا لیتے اور جواب املا کرا دیتے۔ کئی خطوط ایسے ہوتے کہ جونہی فرستندہ کا نام سامنے آتا خط کو پڑھوائے بغیر اپنی یادداشت سے مولانا اس کا جواب لکھواتے۔ کبھی خط کا مضمون میں پڑھ دیتا اور پھر اس میں شامل مختلف سوالات کے جوابات نمبر وار لکھواتے جاتے۔ کئی دفعہ ایسا بھی ہوتا کہ خود ہی فرماتے کہ فلاں صاحب کا خط نکال لیں (واضح رہے کہ مولانا ہمیشہ صیغہ جمع مخاطب میں بات کرتے تھے، "نکال لیں" وغیرہ) بعض سرسری خطوط کے متعلق اجمالاً جواب مجھے بتا کر کہہ دیتے کہ خود لکھ لینا۔

اسی زمانے کی بات ہے کہ کسی خط کو پڑھتے ہوئے میں نے لفظ ادا کیا "کُترنا" مولانا نے فرمایا، "کُترنا نہیں کترنا۔" اس پر میں نے پوچھا کہ ان دونوں میں فرق کیا ہے؟ مولانا نے فرمایا کہ پرندے اگر کسی پھل یا اس کے چھلکے کو کاٹ دیں یا چوہے کسی کاغذ یا کتاب

کو یا ٹڈیاں کسی کپڑے کو، تو ایسے موقعے پر کُتَرنا بولتے ہیں۔ لیکن جب قینچی وغیرہ سے کاغذ یا کپڑے کو آدمی کاٹیں یا کھیل کے لیے چھوٹے بچےّ، تو ایسی صورتوں میں کَترنا کہتے ہیں۔

اس ذرا سی بات کو جو حافظے میں محفوظ ہے، میں نے اس لیے بیان کیا کہ سوال صرف اردو زبان ہی کا نہ تھا بلکہ صحیح زبان کا بھی تھا۔ مولانا بہت صحیح زبان لکھتے اور بولتے تھے۔

مولانا مودودیؒ کی زبان کے ابتدائی سرچشمے "دلیّ اور دکن" کی خاص فضائیں تھیں۔ پھر گھرانا ایسا تھا، خصوصًا مولانا کے والدین اور دیگر بزرگ، کہ جس نے زبان کی شستگی ورفتگی کا تحفّظ کیا۔ مولانا ابوالخیر مودودی تو آخر دم تک مولانا کے قریب رہے اور ان کی زبان تو اور بھی زیادہ مقطرّ و مصفّا تھی، بلکہ وہ کبھی کبھی اپنے خاص انداز کے قولِ قاطع سے یہ بھی کہا کرتے تھے کہ ابوالاعلیٰ نے تو اپنی زبان خراب کرلی ہے۔ زبان وادب سے متعلّق جن معروف لوگوں سے ابتدائی عمر میں مولانا نے کسی حد تک استفادہ کیا، ان میں مولانا ابولکلام بھی تھے، جوشؔ ملیح آبادی اور نیاز فتحپوری بھی تھے اور خاص طور پر مولانا محمد علی جوہؔر تھے۔ اقبالؔ کا اثر بھی خاصا تھا مگر یہ اس وقت کی باتیں ہیں جب آتش جوان نہیں تھا۔ وہ جب جوان ہوکر میدان میں اُترا تو اپنی الگ ایک خاص زبان ساتھ لے کر آیا۔ مولانا مودودی کی زبان کے پودے پر جو پہلا پھل کھلا وہ "الجہاد فی الاسلامؔ" کے نام سے موسوم ہے۔ "الجہاد فی الاسلامؔ" میں تحقیقی رجحان زیادہ ہے، مگر لوگوں کو اپیل کرنے والی ادبی زبان بھی اچھےّ خاصے زور سے آئی ہے۔ ورنہ اگر تحقیقی کام سنگلاخ قسم کا ہوتا تو مولانا مودودیؒ وہ کچھ نہ ہوتے جیسے کہ وہ بنے۔ یہاں ایک دوراہا تھا۔ امکان یہ بھی تھا کہ مولانا مودودی ایوانِ تحقیق میں بیٹھ کر ٹھوس علمی کام کرنے میں لگ جاتے، مگر قدرت نے ان کو دوسرے راستے پر ڈالا۔ انھوں نے ترجمان القرآن کو حاصل کرکے اس میں بڑے جذبۂ بیتاب کے ساتھ مسلمانوں کو آنیوالے خطرناک گردابوں سے بچانے کے لیے آواز اٹھائی۔

کام آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ ایک خاص زبان کی نشوونما ہوتی گئی۔ کوئی بھی مسلمان

لہ اس سے پہلے بھی مولانا نے متفرّق طور پر چھوٹی چھوٹی کتابیں دو ایک لکھیں، مگر بامقصد علمی کتاب یہی پہلی تھی۔

جو دعوتِ حق کا کام وسعتِ شعور و مطالعہ سے کرتا ہے ۔ اس کے ذہن پر الہامی زبان گہرا اثر ڈالتی ہے ۔ میرے نظریے کے مطابق انسانی ادب کا آغاز انبیاء کی الہامی تعلیمات و تلقینات سے ہوا ۔ الہامی ادب پاروں میں اتنی جان ہے کہ ـــــ اگر کوئی قدیم ترین عبارت بھی اپنی اصلی شکل میں سامنے آتی ہے تو آج بھی اس کی ادبیّت کی تروتازگی میں کوئی فرق نہیں محسوس ہوتا ۔ پھر قرآن تو ادبِ الہامی کا وہ آخری گلدستہ ہے کہ جس کی ادبیّت فصحائے عرب کے لیے چیلنج بن کر آئی اور بڑے نامور لسّان اور خطیب، شاعر اور فنکار گنگ ہو کر رہ گئے ۔ عظمتِ خداوندی کا بیان، آیاتِ کائنات کا تذکرہ ، بندوں کے جذبۂ عبودیّت کا اظہار، ذکر و دعا کا درد بھرا اسلوب ، عزم و صبر کے جذباتِ عالیہ کی عکّاسی، رزمِ خیر و شر کے احوال، نیکی کی طرف بلانے کے لیے پکار اور بدی سے بچنے کے لیے انتباہ، دنیا کی لذّت اور مفاد کا عارضی امتحانی ہونا ، آخرت میں اعمال کی بازپُرس، یہ سب ایسے موضوعات ہیں کہ ان کو بیان کرنے سے خوب صورت پُر جوش اور پاکیزہ ادب نمودار ہوتا ہے ۔ اس لیے پیغمبروں کی ایک جُداگانہ زبان ہوتی ہے ،جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آنحضورؐ نے فرمایا تھا کہ میری زبان ابراہیم و اسمٰعیلؑ کی زبان ہے ۔

اس زبان کو جب مودودی صاحب نے اردو ادب کے مخصوص اسالیب کو ملحوظ رکھ کر جدید ذہنی ماحول کے شعور کے ساتھ برتا تو ان کی اپنی انفرادی زبان ابھرنے لگی ۔ جو شخص ایک طرف علمی و تحقیقی دنیا کا آدمی ہو اور دوسری طرف اُسے عوام میں کام کرنا ہو، یعنی اُسے زہد و تقشّف کے گنبد میں معتکفِ خلوت نہ رہنا ہو بلکہ ہجوم میں آ کر لوگوں کو ایک جہاد کے لیے ساتھ لینا ہو وہ پُرشکوہ علمی زبان کو کیسے اختیار کر سکتا ہے ۔ پس مولانا نے معناً پُرشکوہ اور لفظاً سلیس و سادہ طرزِ بیان اختیار کیا ۔ انھوں نے بھاری بھرکم مطالب اختیار کیے، مگر انھیں بالکل عام فہم بنا دیا ۔ وہ اسٹیج پر آتے تو ٹھہر ٹھہر کر بولتے ،مسئلہ کا تجزیہ کرتے ، سوالات اُٹھاتے جواب دیتے اور حقائق کی کڑیاں اس طرح نمبر وار بیان کرتے اور جملے ایسے رواں بولتے کہ معلوم ہوتا ساری تقریر سامنے رکھی ہوئی ہے ۔ ان کی تقریر کا انداز معلّمانہ ہوتا تھا ۔ جیسے جلسہ گاہ کلاس رُوم ہو اور پروفیسر یا ٹیچر اپنے عزیز طلبہ کو کوئی مضمون سمجھا رہا ہو ۔ مولانا

مودودیؒ کی زبان کا ایک نمونہ الجہاد فی الاسلام میں ہے، مگر اس کے بالمقابل ان کے دورِ دعوت کی تحریروں مثلاً رسالہ دینیات، خطبات، سلامتی کا راستہ، زندگی بعد موت کو ملاحظ فرمایئے۔ پھر ادق موضوعات پر ان کی نگارشیں، مثلاً سود، پردہ، حقوق الزوجین، خلافت وملوکیت، ضبطِ ولادت، اشتراکیت، دستوری مباحث لٹریچر، آدمی حیران ہوجاتا ہے کہ بعض بھاری بھرکم مباحث کو کس طرح اس شخص نے عام فہم بنادیا۔ دورِ آخر میں تفہیم القرآن کا رنگ دیکھیے، اس کو لکھنے کا مطالبہ ہونے لگا۔ پٹھان کوٹ میں مقامی حضرات اور باہر سے آنے والے مہمان مولانا مودودیؒ کا درس عام فہم سلیس زبان میں سُنتے، نہ ترجمے میں لفظوں کا اُلٹ پھیر ہوتا، نہ تشریح اور توضیح میں گرامر اور بلاغت اور منطق فقہ کی اُلجھی اُلجھی بحثیں، تو آہستہ آہستہ یہ مطالبہ اُبھرتا گیا کہ مولانا اپنے درس کے طرز پر تفسیر قرآن لکھیں۔ مولانا اس پر تیار ہوگئے۔ اور آج ایک ایسی تفسیر وہ ہمارے ہاتھوں میں دے گئے ہیں جس سے ایک عالمِ دین، ایک وکیل، ایک طالبِ علم، ایک استاذ اور ایک صحافی سبھی یکساں استفادہ کرسکتے ہیں۔ پروفیسر منظور الحق صدّیقی نے بھی ذکر کیا ہے کہ پٹھان کوٹ کے دورِ اوّل میں انھوں نے مولانا کو تفہیم القرآن لکھنے پر آمادہ کیا۔ اس زمانے میں وہ لاہور میں فوقانی تعلیم حاصل کررہے تھے اور کبھی کبھی وہ پٹھان کوٹ آتے تھے۔

مولانا کی پرورش دادہ زبان کو میں "اُردوئے مبین" کہوں گا۔

اس اُردوئے مبین پر مشتمل ہزاروں صفحات پر پھیلا ہوا لٹریچر مولانا مودودیؒ نے فراہم کیا اور پھیلانے والوں نے اسے شہر شہر گاؤں گاؤں اور گھر گھر ہی نہیں ملکوں ملکوں پہنچادیا جہاں تک مولانا مودودیؒ کی محبّت یا دعوت کی پہنچ ہے وہاں تک اُردو نے بھی رسائی حاصل کی ہے۔

مولانا مودودیؒ کی زبان کو سامنے رکھ کر میں یہ اندازہ کرتا ہوں کہ کوئی ہمہ پہلو اچھی شخصیّت ایسی نہ ملے گی جس کی زبان اچھّی نہ ہو۔ زبان اگر بے ڈھنگی ہوگی، اس میں گندگی محسوس ہوگی۔ اس میں سفلہ پن ہوگا یا کوئی اور عیب، تو وہ شخصیّت ہی کے عیوب کی آئینہ دار ہوگی۔ بالکل اس طرح جیسے رسم الخط کسی شخصیّت کے ذہن وکردار کا عکّاس ہوتا ہے۔ بس بڑے کام کرنے والے بڑے لوگوں کی زبان ہمیشہ اعلیٰ درجہ کی صاف سُتھری اور قاعدے قرینے کی ہونی چاہیے

مولانا مودودیؒ نے عمر بھر صحیح اُردو لکھی اور بولی۔ کبھی کسی بچّے کی زبان پر کوئی غلط محاورہ آجاتا تو محسوس ہوجاتا کہ جیسے ذہن کی جھیل میں کوئی کنکری پھینکی ہو۔ ہم لوگوں کی تحریر یا بول چال میں بھی کوئی انحراف آتا تو ٹوکتے تو نہیں تھے مگر محسوس ضرور کرتے تھے۔ مولانا مودودیؒ کو جہاں "جدیدیّت" کی بے جا کنوتیاں پسند نہ تھیں وہاں دل میں اتنی کشادگی کہ ان کے رفقاء اپنی تحریروں یا ادبی نگارشوں میں جو نئے تجربے کرتے ان پر کبھی گرفت نہ کرتے

تحریر میں رموزِ اوقاف کا بہت خیال رہتا۔ سوال، استعجاب، ندا، وقفِ کامل، وقف ناقص (یعنی مروجہ کاما،) اور حوالوں اور اقتباسات اور روایت پر "واوین" کا استعمال بڑے قرینے سے کرتے، حتّٰی کہ کتابت شدہ کاپیاں آتیں تو ان میں علامات کو توجّہ سے درست کرتے۔ ضمناً یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کتابت شدہ کاپیوں کی نظرثانی کا کام مولانا اس انہماک سے کرتے کہ شاذونادر ہی کوئی غلطی ان کی زد سے بچ نکلتی۔ کمال یہ ہے کہ انتہائی مصروف زندگی میں اپنی ساری کتابوں کی کاپیاں بھی پڑھی ہیں اور ان کے ایڈیشنوں کی تصحیح بھی کی ہے۔ سال بھر پہلے میرے ذریعے مرتّب شدہ کتاب "یہودیّت و نصرانیّت" چھپ کر آئی تو شائع شدہ اوراق میں اتنی غلطیوں پر مولانا نے نشان لگائے کہ ناشر اور کاتب اور مقرّر کردہ مصحّح تو کیا، خود میں سخت شرمسار ہوا۔

ہاں تو علاماتِ اوقاف کے سلسلے میں بعض باتیں قابلِ ذکر ہیں۔ مرکّباتِ صلہ موصول کے جُملوں کے درمیان وقف نہیں لگاتے تھے۔ ورنہ عام قاعدہ یہ ہے کہ جہاں کہیں بھی لفظ "ہے"، یا "ہیں" آجائے تو لوگ وقف لگا دیتے ہیں۔ اسی طرح حرفِ بیان "کہ" سے پہلے وقف نہیں لگاتے تھے۔ علاماتِ اوقاف کا صحیح استعمال اجزاء کو متعیّن کردیتا ہے بلکہ اس کی مدد سے لب ولہجہ میں مناسب تبدیلیاں کرنا ممکن ہوتا ہے۔

ایک خصوصیّت مولانا کی یہ تھی کہ وہ ایسے الفاظ پر جن کے تلفّظ کی ایک سے زیادہ صورتیں ہوسکتی ہیں یا جن میں لوگ اکثر مغالطہ کھاتے تھے اُن پر اعراب لگا دیتے۔ خصوصیّت سے قرآن، سیرت، سوانح، تاریخ اور حدیث پر جب کبھی کچھ لکھتے تھے تو اسماء و اعلام پر اعراب لگاتے۔ عربی ناموں کے بارے میں جیسی بھاری غلطیاں ہمارے ہاں ہوتی ہیں اُن سے

قارئین کو وہ بچانا چاہتے تھے۔ خصوصًا صحابہ کرامؓ اور صحابیّات اور دیگر بزرگانِ دین کے اسمار کا تلفّظ ضرور واضح کر دیتے۔ زبان کی تنہا یہی بہت بڑی خدمت ہے۔

مختصر یہ کہ مولانا نے دینی حقائق کو بیان کرنے کا اُردو زبان میں بالکل ایک نیا اسلوب پیدا کیا۔ مقالاتی اور خطابتی ادب میں ان کے قلم نے کئی سنگ میل نصب کیے ہیں۔ ان کی تحریروں میں جا بجا ایسے پُرزور ادب پارے بکھرے ہوئے ہیں کہ اُن کو جمع کیا جائے تو ایک خاص کتاب انہی پر مشتمل بن سکتی ہے۔ یہی وہ قوّتِ بیان کا نیا استعمال تھا جس کی مدد سے انھوں نے جامد مذہبی رجحانات کو ایک تحریک میں بدل دیا! مولانا مودودیؒ نے اردو زبان کو بے شمار انگریزی الفاظ کے نئے تراجم دیے ہیں۔ بہت سی اصطلاحات وضع کی ہیں، جگہ جگہ امثال سے مدد لی ہے۔ حسبِ ضرورت تشبیہات، استعارات اور تراکیب ایجاد کی ہیں۔ یہ پوری گفتگو ایک مقالہ چاہتی ہے جو میں اس وقت نہیں لکھ رہا۔

خطوط نویسی میں بھی ان کا خاص مقام تھا۔ کبھی کوئی سرپھرا گالیاں لکھ کر بھیجتا تو رسیدِ خط بھیجتے مگر گالیوں کا جواب دینے کے بجائے خط پھنکوا دیتے۔ بحثا بحثی کے سے اندازِ گفتگو سے بچتے اور کسی کے پیچھے پڑ کر زور دے دے کر ایک ہی بات کو نہ دہراتے رہتے "مکتوب الیہان"، کو محترمی و مکرمی کے القاب سے مخاطب کرتے اور آخر میں اپنے نام کیساتھ لفظ "خاکسار" لکھتے، یہ ان کا مستقل رنگ تھا۔ جو آخر تک رہا۔ لکھنے پڑھنے کی باتیں تو الگ رہیں، ان کی تحریک کی سرکاری زبان پہلے روز سے اردو قرار پائی۔ تمام بیانات، رپورٹیں، سرکلر، اردو زبان میں ہوتے۔ پھر خط و کتابت کا بڑا وسیع دائرہ تھا۔ ہزاروں خطوط مولانا نے لکھے اور لکھوائے، یہ سب اُردو ہی میں لکھے گئے۔ غیر ملکی خط و کتابت یا کسی غیر معمولی مقامی ضرورت کے لیے انگریزی سے کام لیا جاتا اور اصل اردو تحریروں کا ترجمہ ہو جاتا باہر سے آکر ملنے والے لوگ شہری ہی نہیں، دیہاتی، قریبی علاقوں ہی کے نہیں، دیر، چترال، بلوچستان اور سندھ کے، لکھے پڑھے ہی نہیں، غیر خواندہ، سب کے سب مولانا کے ساتھ بیٹھتے تو اردو میں باتیں سنتے اور اپنی بات اردو ہی میں کہتے۔ بہت سے دوست ٹوٹی پھوٹی اردو بولتے جس میں ان کی علاقائی بولی کے الفاظ شامل ہوتے، مگر بات

سمجھ میں آجاتی۔

حیرت کی بات ہے کہ مولانا مودودیؒ، جو نہ لپک لپک کر لوگوں سے معانقے کرتے تھے، نہ اُن کی ضیافتیں کرتے تھے (اس کے حالات ہی نہ تھے) اور نہ غیر ضروری طور پر ملاقاتیوں کے دل خوش کرنے کے لیے مصنوعی تکلّم فرماتے، مگر لوگ بڑے جذبۂ محبّت و فدائیت سے اُن کی باتیں سُنتے اور ان کے بولے ہوئے لفظوں کو اپناتے اور اُردو ہی میں اپنا مدّعا بیان کرتے۔ یہ سب مولانا مودودی کے جذبۂ اخلاص اور حُبّ فی اللّٰہ کی وجہ سے تھا۔

تہائی صدی کے عرصے میں کبھی کسی علاقے کے لوگوں نے لسانی تعصّب کا مظاہرہ نہیں کیا۔ جلسوں اور مجالسِ شوریٰ میں اور عام کھُلی اجتماعی ملاقاتوں میں ہر شخص بے تکلفی سے جیسے چاہتا اظہارِ خیال کرتا، کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ نہ تو اردو زبان کو کوئی جبراً ٹھونس رہا تھا نہ اُسے قبول کرنے میں کسی کے اندر تعصّب کارفرما تھا۔

پھر مولانا کے متاثرّین جب اپنے اپنے علاقوں میں جاتے تو وہاں اپنی مجالس میں بیٹھ کر مقامی بولی سے بھی کام لیتے، لیکن اجتماعات کی غیر علاقائی نوعیّت انھیں مجبور کر دیتی کہ وہ اُردو ہی میں کارروائی کریں۔ یہ لوگ پشاور میں بیٹھے ہیں اور ان میں کوئی پنجابی ہے، کوئی حیدرآباد سے آیا ہوا کراچی کا آدمی، کوئی سندھ میں آباد بہاری، ان کا مل کے کام کرنا سوائے اس کے ممکن نہ تھا کہ اردو کو ذریعۂ اظہار بنایا جائے۔

لوگ گھروں میں جاتے، مرد بھی اور عورتیں بھی، تو ڈائریوں میں اپنے مشاہدات و تاثرّات اور مولانا مودودی کے بعض ارشادات نوٹ کرکے لے جاتے۔ پھر دوستوں اور گھروں میں ان کو سناتے۔ اس طرح اردو زبان تحریک کے ساتھ ساتھ سفر کرتی رہی۔

یہاں میں یہ بھی وضاحت کر دینا چاہتا ہوں کہ مولانا زبان کے معاملے میں تعصّب سے پاک تھے۔ برّصغیر کی تقسیم سے پہلے بھی ابتدائی لٹریچر کے تراجم دوسری زبانوں میں ہونے لگے تھے، مگر جب تقسیم کا وقت قریب آگیا تو جنوبی ہند کے اجتماع ارکان میں مولانا نے ساتھیوں کو توجّہ دلائی کہ اب جب کہ ملک تقسیم ہونے والا ہے۔ نئے بھارت میں اردو زبان میں کام کرنا مشکل ہو جائے گا اور حکومت ہندی زبان کو جبراً پھیلا دے گی۔ اندریں

صورت مناسب یہ ہے کہ آپ لوگ فوری طور پر تمام لٹریچر کو ہندی زبان میں منتقل کرنیکا انتظام کریں۔ اسی طرح حالیہ بنگلہ دیش کا علاقہ جب ہمارے ساتھ تھا تو وہاں بنگلہ تراجم کا آغاز کرایا۔

ادھر صوبہ سرحد میں پشتو میں، اور صوبہ سندھ میں سندھی زبان میں ترجموں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ بنگلہ اور سندھی میں تو بعض اخبار بھی مقامی زبانوں میں جاری ہو گئے۔ مولانا مودودیؒ کا نظریۂ لسانیات یہ تھا کہ ساری زبانیں خدا کی عطا کردہ ہیں اور ہم پر لازم یہ ہے کہ ہم ہر زبان کو خدا کے دین کی خدمت کے لیے استعمال کریں۔ کسی زبان کے بولنے والوں کو دعوتِ حق سے محروم نہیں رہنا چاہیے۔ آج ۲۰، ۲۵ زبانوں میں اسلامی لٹریچر کے تراجم موجود ہیں اور مغربی ممالک، افریقہ، عرب ممالک، جاپان اور انڈونیشیا تک پھیل رہے ہیں۔

اس عام وسیع لسانی خدمت کے علاوہ مولانا مودودی مغفور نے نوجوانوں میں ادبِ اسلامی کو فروغ دینے کے لیے تحریک پیدا کی۔ اس میدان میں ابتدائی متاثرین میں میں بھی تھا۔ مولانا کا ادب سے متعلق مشہور جملہ جو کئی جگہ شائع ہوا ہے۔ جماعت بننے سے پہلے میرے ایک سوال کے جواب میں مولانا نے مجھے ہی لکھا جسے میں نے اپنے زمانۂ ادارت میں چراغ راہ میں شائع کیا تھا ملاحظہ ہو۔

> "معاش کے لیے کوئی ادب پیدا کرنا میرے نزدیک غلط چیز ہے۔ اس سے بہتر ہے کہ آدمی معاش کے لیے اینٹیں ڈھولے۔ ادب دماغوں کو ڈھالنے والی چیز ہے۔ یہ کام محض معاش کے لیے نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ اس کو تو بالکل اپنے نظریہ و مسلک پر کرنا ہوگا۔"

اس جملے کے مثبت تقاضے پر تو بات بعد میں ہوگی۔ منفی حیثیت سے کبھی گوارا نہیں ہوا کہ کسی معاوضے یا مفاد کے حصول کے لیے اپنے ضمیر کی آواز کو مسخ کر کے کوئی ادبی تخلیق مہیّا کی جائے۔ بلکہ خدا نے مجھے اتنی توفیق دی کہ بہت سی علمی وادبی اور صحافیانہ خدمات بلا معاوضہ کرتا رہتا ہوں، کیونکہ میری فقیرانہ زندگی میں دولت کی اندھی تونس نہیں پائی جاتی۔

مثبت حیثیت سے تقسیم سے پہلے کے دور ہی میں کام شروع ہوگیا، اور شاید اس میدان میں پہلے پہل مجھے ہی زیادہ موقع ملا۔ میں نے ملک نصر اللہ خاں عزیز کے سہ روزہ

اخبار میں نئے خطوط پر لکھنے کے کچّے پکّے تجربات شروع کیے۔ ترقی پسند ادبیات کو پڑھکر سوچا تھا کہ میں اپنے نظریے کے تقاضے سے زندگی کو کس طرح دیکھتا ہوں اور اس کے مسائل پر کس طرح اظہارِ خیال کر سکتا ہوں۔ میں بڑی مشکلوں سے اس انقلاب سے گزرا ہوں پھر تقسیم کے بعد حلقۂ ادبِ اسلامی بھی قائم ہوا، تعمیر پسند مصنفین کی تنظیم بھی موجود رہی، اور آج کل شہر بہ شہر جدا جدا تنظیمیں ادب میں اسلامی قدروں کو اجاگر کرنے والے افراد کو ابھار رہی ہیں۔

ادب کے متعلق مولانا مودودیؒ کا یہ بڑا احسان ہے کہ انھوں نے کھُل کر اسلامی مقاصد کی روشنی میں زندگی کے مسائل کو پیش کرنے کی تعلیم وقتاً فوقتاً ادیبوں کو دی۔ اس سے ایک طرف جدید دور کے منحنی افکار سے ہٹ کر لکھنے والو کی ہمّت بندھی اور دوسری طرف نوجوانوں کی ایک ایسی ٹیم میدان میں کام کرنے لگی جس نے نگارشوں کو الحاد، مذہب بیزاری مذہبی شعائر کی تضحیک، اسلامی قدروں کی نفی، جنسی جنون اور عریانی و فحاشی، انسان کو معاشی حیوان قرار دینے کی روایت اور مغربی نظریات و افکار کو سرمایۂ فن بنانے کے مروّجات کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

ہر چند کہ اس نوجوان قوّت کو کم ذرائع و وسائل ملے۔ مختلف حکومتوں کی مخالفانہ پالیسیوں کا بوجھ ان پر پڑتا رہا۔ نشری اور اشاعتی ادارے ان کی دسترس سے باہر، بلکہ مخالف قوتوں کے تسلّط میں تھے۔ نامور ماہرینِ تنقید جو منڈی کے صیرفی تھے وہ بھی دوسرے ہی نقطۂ نظر کے تھے۔ پھر ان کا بائیکاٹ اور بلیک آؤٹ کیا گیا، مگر مولانا مودودیؒ کی پکار میں ایک ایسی نامعلوم تاثیر تھی کہ جس ادیب تک وہ آواز پہنچتی اس نے پھر صحیح کام کرنا نہیں چھوڑا، خواہ شہرت اور مفاد سب کچھ قیمت میں دینے پڑے ہوں۔

خدا کے فضل سے آج اس ملک میں بیسیوں شاعر اور سینکڑوں نثر نگار ایسے موجود ہیں جو ادبی دائرے میں اسلامی قدروں کو اجاگر کرنے کے جذبے کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ اسلامی مزاج کا جو بھی ادب آئندہ اس سرزمین ابھرے گا اس کا کریڈٹ سارے کا سارا علاّمہ اقبالؒ مرحوم اور مولانا مودودی مغفور ہی کو جائے گا۔

جدید اسلامی ادب کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ زندگی کے اہم موضوعات میں سے کوئی ایسا موضوع نہیں جس پر ان کے خیالات ریکارڈ نہ ہو چکے ہوں، تحریکِ پاکستان ہو، اسلامی دستور کا مطالبہ ہو، جہادِ کشمیر ہو ۱۹۶۵ء کا معرکہ ہو اے ۱۹ء کا سانحہ ہو، تاریخ کے ان سارے ابواب کی جھلک ہمارے جدید اسلامی ادب میں پوری پوری موجود ہے بلکہ بعض موضوعات ایسے ہیں کہ جن پر دوسرے لوگوں کی توجہ گئی ہی نہیں اور اسلامی حلقوں نے کام کر دکھایا۔ مثلاً سیز فائر (۱۹۶۵ء) کے سلسلے میں کوئی کام کی چیز نہیں آئی۔ ہمارے یہاں اس پر خاصی قابلِ قدر تخلیقات ہیں۔ یا مسئلہ فلسطین اور بیت المقدس اور اخوان اور جہاد افغانستان کے متعلق مسلم ادیبوں اور شاعروں نے جو کام کیا ہے اس کے مقابلے میں دوسرا گروہ کچھ پیش نہیں کر سکتا۔ اسی طرح اتحادِ اسلامی پر بڑا قابلِ قدر مواد مسلم اہلِ فن نے فراہم کیا ہے۔ خصوصاً مسلم ادیبوں کا ایک مستقل میدان نعت ہے جس کے لیے ابتداءً ادبی رسائل کے دروازے بند تھے، مگر آج اس صنف میں اتنی توانائی ہے کہ ہر رسالہ نعتیں شائع کرتا ہے۔ اسی طرح مرثیہ مسلمانوں کی خاص صنف ہے اور اس میں بے شمار دینی جذبات کو ظہور کا راستہ ملتا ہے۔ ہر چند کہ دوسری جانب سے بھی لہو لگا کے شہیدوں میں شمار ہونے کے لیے غمِ حسین پر تھوڑی بہت نظم اور نثری چیزیں لکھی جاتی ہیں مگر اس صنف پر غلبہ مسلم ادیبوں ہی کا ہے۔ یہ موقع کسی ایسے تقابُل کا نہیں کہ میں لکھ کر بعض مثالوں کی مدد سے بتاؤں کہ کن میدانوں اور موضوعات پر مسلم ادیبوں کا کام زیادہ وقیع ہے۔

یہاں اس امر کا تذکرہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کبھی کبھار مولانا کے ساتھ مشاعرے کی خصوصی نشستیں ہو جاتیں، جیسے ماہر القادری کی آمد پر یا جیسے جگر مراد آبادی کو خاص طور پر مدعو کرنے پر۔ کبھی اجتماعات کے موقعوں پر شعرا اکٹھے ہوتے تو مشاعرے کا انعقاد کر لیتے۔ چند سال پہلے ایک خصوصی نشست مولانا کے ساتھ رشید پارک میں ہوئی تھی اور اس موقع پر ملک نصر اللہ عزیز مرحوم بھی شریک تھے۔ اس مجلس کی ٹیپ میرے پاس محفوظ ہے۔ میں نے اس میں ایک غزل پڑھی تھی جس کی بحر میں

ذرا سا تصرّف کرلیا تھا۔ اس کا ایک شعر بھی اس وقت مجھے یاد ہے ؎

نہیں کچھ دیر کہ مٹ جائے گا جادو کا یہ سب جاہ وجلال
ہم دکھادیں گے کبھی اپنی کرامات! کوئی بات نہیں

اس کا ایک اور مصرع تھا ؎

عزم سنگیں ہو تو سنگینئ حالات کوئی بات نہیں

وہ جو میں نے کہا کہ ہم دکھادیں گے کبھی اپنی کرامات، تو تاریک ترین حالات کے ستائے ہوئے حاضرین میں سے ایک بول اُٹھا کہ پھر دکھا دیجیے ناں۔ عرض کیا کہ آپ جلد ہی دیکھیں گے۔ زیادہ دیر نہیں گزری کہ فسطائیت کا تخت ٹوٹ گرا۔

یہ کہانی خواہ مخواہ طویل ہو جائے گی، کہنا یہ چاہتا ہوں کہ مولانا مودودیؒ اپنی دینی خدمات کا جو صلہ خدا تعالیٰ سے پائیں گے وہ تو پائیں گے۔ انھوں نے اُردو کو اسلامی حقائق سے مالا مال کرنے، اسے بنانے، سنوارنے اور اسے پھیلانے کے لیے جو عظیمُ الشّان خدمت انجام دی ہے اس کی بھی وہ بہترین جزا، اپنے مالک کی بارگاہ میں پائیں گے۔

مگر اُردو والوں کو بھی کچھ احساس ہے؟

ادب والے بھی اعتراف کرتے ہیں؟

جو احساس و اعتراف کریں ان کی اپنی فلاح، نہ کریں تو مولانا مودودیؒ کے اعمال نامے میں ان کی خاطر خدا تعالیٰ کوئی کمی نہیں کردے گا اور نہ ان کے تیار کردہ سپاہیانِ حق دین اور زبان اور ادب کی خدمت کی سرگرمیوں سے پیچھے ہٹیں گے اور نہ تاریخ کسی کی خوشنودی کے لیے مولانا مودودی کے لسانی و ادبی کام کو مٹانے یا چھپانے پر تیار ہو سکتی ہے[1]

---

[1] مجھے اندازہ ہے کہ مولانا کی نگاہ میں ادب کی کتنی اہمیت تھی اور وہ ادبی تحریک کو مضبوط دیکھنا چاہتے تھے، مگر بدقسمتی سے ذہین دوستوں کی قلیل تعداد کی توجّہات کو کام کے دوسرے بیشمار دائروں نے اپنی طرف منعطف کرلیا، اور ادبی کام کا حق ادا نہ ہوسکا۔ کاش کہ اب نوجوان صفیں اس مہم کو سنبھالیں۔

مولانا مودودی

اور

جماعتِ اسلامی

جماعتِ اسلامی کا وجود دراصل مولانا کے تحریکی تصوّرِ اسلام کا ایک خارجی عملی ظہور تھا۔

میں چاہتا ہوں کہ خود مولانا مودودیؒ کے اپنے ہی نقطۂ نظر کی روشنی میں جماعت کا مختصراً تذکرہ کیا جائے۔

صورتِ واقعہ یہ نہ تھی کہ ۲۵ اگست کو تاریخ کے باغ میں ایک کیاری اجاڑ پڑی تھی اور اچانک اگلی صبح کو اس میں ایک نئی جماعت کا پیڑ اُگ آیا جس کے لیے نہ موسم سازگار تھا اور نہ کسی باغبان نے کوئی بیج بویا تھا۔ مناسب ہو گا کہ یہاں میں مؤسّس جماعت مولانا ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ پیش کروں:

> "دراصل یہ کوئی اتفاقی واقعہ نہ تھا کہ کسی شخص کے دل میں یکایک یہ شوق چرایا ہو کہ وہ اپنی ایک جماعت بنا ڈالے، اور اس نے چند لوگوں کو اکٹھا کر کے ایک جماعت بنا ڈالی ہو، بلکہ وہ میرے ۲۲ سال کے مسلسل تجربات، مشاہدات، مطالعے اور غور و خوض کا نچوڑ تھا جس نے ایک اسکیم کی شکل اختیار کی تھی اور اسکیم کے مطابق جماعتِ اسلامی بنائی گئی تھی۔"
>
> (جماعتِ اسلامی کے ۲۹ سال۔ ص ۵)

مولانا کے مشاہدات و مطالعات پر نگاہ ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ برِّصغیر کے مسلم معاشرے میں اس وقت اتنے تضاد نمودار تھے کہ جن سے پیدا ہونے والے سوالات اس وقت تک تو ڈھکے رہے جب تک تحریکِ خلافت کا عروج تھا۔ ترکی میں نظامِ خلافت اور برِّصغیر میں تحریکِ خلافت کے انہدام کے بعد مسلمان مایوسی کے اندھیروں میں ڈوب گئے اور درپیش سوالات کے جواب میں ان کے پاس ذہنی خلاء کے سوا کچھ نہ تھا۔ کسی تضاد زدہ معاشرے میں جب لاینحل سوالات کی وجہ سے ذہنی خلاء کی کیفیت چھا جاتی ہے،

تو یہ ایسا وقت ہوتا ہے کہ اس خلاء کو پُر کرنے کے لیے کسی نہ کسی نئی حرکت کا آغاز ہوتا ہے۔
معاشرے کے جن تضادات اور لاینحل سوالات اور ذہنی خلا کا میں تذکرہ کر رہا ہوں زیادہ تر لوگ ان پر کوئی توجّہ نہیں دیا کرتے، پھر کچھ توجہ دینے والے محض دھیما سا احساس کر کے رہ جاتے ہیں، بعض سوچتے بھی ہیں مگر نہ مثبت طور پر کوئی راستہ نکال سکتے ہیں' نہ دوسروں کو پکار کر جمع کرنے کی صلاحیّت رکھتے ہیں۔ سیّد مودودیؒ کو خدا نے جس خاندان میں پیدا کیا، جیسی تربیّت کا انتظام کیا اور جو صلاحیتّیں عطا کی تھیں ان کی وجہ سے ایک ایسی شخصیّت بنی جس نے گرد و پیش کے احوال کو محسوس کیا، واقعات کا تجزیہ کیا، سوالات کو مشخّص کیا اور اجتماعی الجھن کے حل کا راستہ نکالا۔ ان کا اپنا قول ہے:

> "ابتدار سے میری افتادِ طبع یہ رہی ہے کہ جس مسئلے سے بھی مجھے سابقہ پیش آیا یا جس سے مجھے دل چسپی ہوئی، میں نے اس کے متعلّق معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تاکہ اُسے اچھّی طرح سمجھ سکوں۔"

(جماعتِ اسلامی کے ۲۹ سال۔ ص ۷)

ایسے شخص کے سامنے ایک طرف مسلمانوں کا یہ جذبہ تھا کہ وہ ترکی خلافت اور مقاماتِ مقدّسہ کو بچانے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دیں، دوسری طرف جلیانوالہ باغ کے حادثے نے ملک بھر میں آگ بھڑکا دی اور تحریکِ آزادی نے زور پکڑا، پھر گاندھی جی کی قیادت میں ہندو مسلم اتحاد قائم ہوا جس کے بل پر ترکِ موالات کی تحریک شروع ہوئی، پھر ترکی قوم پرستی کا ظہور اور جوابًا عرب قوم پرستی کا نشو و نما، پھر خلافت کا انہدام اور تحریکِ خلافت کا تزلزل، اُدھر ہندو مسلم اتحاد کے ٹوٹنے کا حادثہ اور ملک بھر میں ہندو مسلم فسادات کی آگ کا بھڑکنا، پھر شدھی کی تحریک، سوامی شردھانند کا قتل، پھر مسلمانوں پر مغربی تہذیب کی یورش اور الحاد اور بے دینی کا حملہ، لادین وطنی اسٹیٹ کے لیے متّحدہ قومیّت کا غلغلہ، ادب میں الحاد اور فحّاشی اور کمیونزم کے اثرات کا ابھار اور جواہر لعل نہرو کا نقیبِ اشتراکیّت بن کے اٹھنا، یہ سب کچھ ۱۹۲۴ء کے بعد دس پندرہ سالوں کے وہ حوادث تھے جن میں سے ایک ایک پر جماعتِ اسلامی کے مؤسّس نے

غور کیا اور آخر اس نتیجے تک پہنچا کہ:

"مسلمانوں کی نجات اگر ہے تو اسی میں ہے کہ وہ پھر سے ایک مبلغ قوم کی حیثیت اختیار کرلیں۔ صرف اسی طرح ہندوستان میں مسلمان اس پیچیدگی سے نکل سکتے ہیں جس میں وہ مبتلا ہیں۔" (۲۹ سال۔ ص ۱۴)

مسلمانوں پر مغربی تہذیب و افکار کے غلبے کا سدِّ باب کرنے کے لیے انھوں نے یوں سوچا:

یہ بات ان کے ذہن نشیں کی جائے کہ اسلام اپنا ایک نظامِ زندگی رکھتا ہے، اپنا ایک نظامِ تہذیب رکھتا ہے، اپنا ایک سیاسی نظام رکھتا ہے، اپنا ایک معاشی نظام رکھتا ہے، اپنا ایک نظامِ فکر اور نظامِ تعلیم رکھتا ہے جو ہر لحاظ سے مغربی تہذیب اور اس کے متعلقات سے فائق ہے۔ یہ خیال ان کے دماغ سے نکالا جائے کہ تہذیب و تمدّن کے معاملے میں اُنھیں کسی سے بھیک مانگنے کی کوئی ضرورت ہے۔" (۲۹ سال۔ ص ۲۲)

اگر مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ کے نظامِ فکر میں سے اتنا ہی اقتباس ہمارے پاس ہوتا تو بھی ہم اس فکری نہج کو پوری طرح سمجھ سکتے تھے جس پر سوچنے والا سوچ رہا تھا اور جس کے مطابق جماعتِ اسلامی کی تشکیل ہوئی۔ مؤسّسِ جماعت نے صرف ان واقعات پر ہی نگاہ نہیں ڈالی جن کی طرف میں نے اجمالی اشارے کیے ہیں، بلکہ ایک عظیم تر سوال پر خصوصی توجّہ دی۔ وہ سوال سُنیے:

ہماری تاریخ کا ایک نہایت اہم اور نتیجہ خیز واقعہ ہے کہ ہمارے ملک پر انیسویں صدی میں ـــــ ہزاروں میل سے آئی ہوئی ایک غیر مسلم قوم مسلّط ہو گئی تھی، ـــــ یہ واقعہ ہمارے لیے کئی لحاظ سے قابلِ غور ہے

پہلا سوال جس کی تحقیق ہمیں کرنی چاہیے یہ ہے کہ آخر یہ واقعہ پیش کیسے آگیا؟ کیا یہ کوئی اتفاقی سانحہ تھا جو یونہی بے سبب ہم پر ٹوٹ پڑا؟ کیا وہ قدرت کا کوئی ظلم تھا جو اس نے بے قصور ہم پر کر ڈالا؟ کیا ہم

بالکل ٹھیک چل رہے تھے، کوئی کمزوری اور کوئی خرابی ہم میں نہ تھی۔؟
یا فی الواقع ہم اپنے اندر مدّتوں سے کچھ کمزوریاں اور کچھ خرابیاں پال رہے تھے جن کی سزا آخر کار ہمیں ایک بیرونی قوم کی غلامی کی شکل میں ملی ؟
دوسرا سوال یہ ہے کہ یہ بلا جو باہر سے آکر ہم پر مسلّط ہوئی، آیا یہ صرف ایک غلامی ہی کی بلا تھی یا وہ اپنے جلو میں اخلاق، افکار، تہذیب، مذہب، تمدّن، معیشت اور سیاست کی دوسری بہت سی بلائیں بھی ساتھ لائی تھی؟
تیسرا سوال یہ ہے کہ اِن بلاؤں کے مقابلے میں ہمارا اپنا ردِّ عمل کیا تھا ؟
(مسلمانوں کا ماضی، حال اور مستقبل ص ۶، ۷)

کسی معاملے کو اس طرح سوالات اُٹھا اُٹھا کر اس کا باریکی سے تجزیہ کرنے والے لوگ بہت کم ہوا کرتے ہیں، اور سیّد مودودی رحمۃ اللہ علیہ ایسی ہی ایک غیر معمولی شخصیت تھے۔ بظاہر یہ سوالات تشکیلِ جماعت کے بہت بعد جماعت کے سالانہ اجتماعِ عام منعقدہ کراچی سال ۱۹۵۱ء کی تقریر میں سامنے لائے گئے تھے، مگر فی الحقیقت یہ مولانا کے ابتدائی فکر کا اہم حصّہ ہیں جس کا ثبوت ان کی انقلاب آموز کتاب تنقیحات کی تحریریں دیتی ہیں، بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مغرب کی ملحدانہ تہذیب کے سیلاب کا رُخ پھیرنے کے لیے یہ شخص اُٹھا تھا، اور اس کے کارنامے کا ایک بڑا حصّہ یہ ہے کہ اُس نے مغرب کی مرعوبیت کا شکار ہوتی ہوئی قوم میں سے ایسی فعّال قوت اٹھا کھڑی کی جو مغربی تہذیب کے مقابلے میں اسلامی تہذیب کا علم لے کے نکلی۔ یہ گویا ایک سیلاب کے خلاف جوابی سیلاب کو ٹکرانے کا عمل تھا جو موصوف نے شروع کیا۔

سیّد مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے انسانی زندگی کے صلاح و فساد پر غور و خوض کر کے جو نتیجہ نکالا وہ یہ ہے :

"دنیا میں فتنہ کی اصل جڑ اور فساد کا اصلی سرچشمہ انسان پر انسان کی خدائی ہے۔ اسی سے خرابی کی ابتدا ہوئی اور اسی سے آج بھی بِس کے زہریلے چشمے پھوٹ رہے ہیں ـــــ کہیں ایک قوم دوسری کی

الٰہ ہے، کہیں ایک طبقہ دوسرے طبقوں کا الٰہ ہے، کہیں ایک پارٹی نے الٰہیّت وربوبیّت کے مقام پر قبضہ کر رکھا ہے، کہیں قومی ریاست خدائی کے مقام پر براجمان ہے اور کہیں کوئی ــ ڈکٹیٹر ــ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ إِلٰهٍ غَيْرِي (القصص ـ ۳۸) کی منادی کر رہا ہے ـــــ یہی وہ چیز ہے جو انسان کے سارے مصائب، اس کی ساری تباہیوں، اس کی تمام محرومیوں کی اصل جڑ ہے۔ یہی اس کی ترقی میں اصل رکاوٹ ہے ـــــ اس روگ کا علاج بجز اس کے کچھ ہے ہی نہیں کہ انسان سارے ارباب اور تمام الٰہوں کا انکار کر کے صرف اللہ کو اپنا الٰہ اور ربُّ العالمین کو اپنا رب قرار دے ـــــ یہی وہ بنیادی اصلاح تھی جو انبیاء علیہم السّلام نے انسانی زندگی میں کی۔

(اسلامی ریاست۔ مضمون اسلام کا نظریۂ سیاسی۔ اقتباسات از ص ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳)

تجدید واحیائے دین

مختلف حوادث کے مشاہدے اور مختلف سوالات کے تجزیے سے گزر کر مولانا مودودی جس مقام تک پہنچے وہ دین کو جڑ بنیاد سے نمایاں کرنے کا تجدیدی کام تھا۔ اس تجدیدی کام کی نوعیّت کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ جب مولانا ہی کی مختصر تالیف "تجدید واحیائے دین" کے مندرجات سامنے ہوں۔ تجدید واحیائے دین کی بنیادی بحث پڑھنے والے کو یہ کتاب پوری تاریخ کی ایک نئی تعبیر سے آگاہ کرتی ہے۔ اوّل روز سے ایک قوّت اسلام ہے اور دوسری قوّت جاہلیّت، جس کے رنگ وروپ بدلتے رہتے ہیں اور جس کی تین بڑی قسمیں مولانا نے تفصیل سے بتائی ہیں۔ یعنی جاہلیّتِ خالصہ، جاہلیّت مشرکانہ اور جاہلیّتِ راہبانہ! اسلام اور جاہلیّت کی ان دونوں قوتوں میں ایک معرکۂ مسلسل جاری ہے۔ اسلام کے محاذ پر سپہ سالار انبیاء ہیں اور ان کے ساتھ تعاون کرنے اور اُنکے کام کو جاری رکھنے والے صِدّیقین، شہداء اور صالحین سب ہیں۔ تاریخ میں جب

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جاہلیّت کی تاریکی ہر طرف چھا جاتی ہے اور اس کے خلاف لڑنے والی قوتیں دب جاتی ہیں تو خدا کا کوئی نہ کوئی بندہ اٹھتا ہے اور وہ کام کر جاتا ہے جس کے متعلّق اقبالؒ نے کہا تھا کہ "سپاہِ تازہ برانگیزم از ولایتِ عشق"۔ وہ جاہلیت کے خلاف از سرِ نو جہاد برپا کرتا ہے۔

بہر حال مجھے یہ کہنا ہے کہ مولانا مودودی عام جماعت سازی یا لیڈری کی راہ پر چلنے کی بجائے تجدید و احیائے اسلام یا اقامتِ دین کی اس راہ پر چلے جس پر سے کسی قافلے کو گزرے بہت مدّت گزر چکی تھی۔ یہ کام شروع کرتے ہوئے مولانا مودودی نے تجدید و احیائے دین کے نام سے ایک کتاب لکھی جسمیں تجدید کی حقیقت اور تجدیدی کام کے مختلف پہلوؤں کو واضح کرنے کے ساتھ کارِ تجدید کی مختصر تاریخ بیان کی گئی اور چند ممتاز مجدّدین کے کارناموں کا ذکر کیا گیا۔ اس کتاب کا بہت بڑا پارٹ یہ ہے کہ اسلام کے احیاء کے متعلّق برسوں سے جو مایوسی پھیلی ہوئی تھی اور جسے متعدّد اسلامی مساعی کی ناکامی نے اس حد تک پہنچا دیا تھا کہ قوم کی قوم نے سارا معاملہ ظہورِ مہدی پر چھوڑ دیا تھا کہ وہ بزرگ جب آئیں گے تو کراماتی طور پر کفار و مشرکین کو زیر کر کے اسلام کا اقتدار قائم کر دیں گے۔ ان سے پہلے چونکہ اسلام کو بہ طور ایک دین، ایک تحریک، ایک نقلاب اور ایک نظام کے جلوہ گر کرنا ناممکن ہے، لہٰذا فی الحال تھوڑے بہت انفرادی عقیدوں اور مذہبی تقریبوں کے ساتھ ہمیں اپنے اپنے مشغلوں میں مگن رہنا چاہیے بلکہ کافرانہ اور مشرکانہ قوتوں کے تحت امن چین اور صلح و سازگاری سے دب دبا کر معاملہ کر لینا چاہیے۔ یعنی مایوسی اتنی شدید تھی لشکرِ ملّت اور اس کے مذہبی سپہ سالاروں نے ہتھیار کھول دیے تھے بلکہ ہتھیار ڈال دیے تھے۔ اس ظلمتِ یاس میں "تجدید و احیائے دین" میں اسلام اور جاہلیت کے دوامی معرکے کا جو نقشہ کھینچا گیا تھا کہ کس طرح ایک ایک یا چند افراد نے جانوں کی بازی لگا کر علمِ حق کو بلند رکھنے کی کوششیں کی ہیں۔ بجائے خود وہ ولولہ انگیز تھا۔ لیکن اس کے ساتھ اہم تر کوشش یہ کی گئی کہ جن احادیث کی بنا پر مایوسی پھیلائی جا رہی تھی اور جن سے یہ نتیجہ نکالا جاتا تھا کہ بس نظامِ حق تو

تہائی صدی تک رہا، پھر بات بگڑتی ہی چلی گئی اور آگے مزید بگڑتی ہی جائے گی، انہی احادیث سے مولانا مودُودی رحمۃ اللہ علیہ نے امیدوں کی نئی روشنی فراہم کی۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلّم کی ایک پیشین گوئی جسے امام شاطبیؒ نے موافقات میں اور مولانا اسمٰعیل شہیدؒ نے منصبِ امامت میں نقل کیا ہے، اسی کو "تجدید و احیائے دین" کے ذریعے جب نوجوان قوتوں کے سامنے لایا گیا تو ان کی آنکھیں کھُل گئیں۔ اس حدیثِ مبارکہ میں پہلے دورِ نبوّت کے نظامِ رحمت کا ذکر ہے، پھر خلافتِ راشدہ علیٰ منہاجِ نبوّت کا، پھر ملک عضوض کا پھر ملکِ جبر کا اور آخری یا پنچویں زمانے کے متعلّق یہ مُژدہ ہے کہ:

ثُمَّ تَكُونُ خِلَافَةٌ عَلَىٰ مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ تَعْمَلُ فِي النَّاسِ بِسُنَّةِ النَّبِيِّ وَتُلْقِي الْإِسْلَامُ بِجِرَانِهِ فِي الْأَرْضِ يَرْضَىٰ عَنْهُ سَاكِنُ السَّمَاءِ وَسَاكِنُ الْأَرْضِ لَاتَدَعُ السَّمَاءُ مِنْ قَطْرٍ إِلَّا صَبَّتْهُ مِدْرَارًا وَلَاتَدَعُ الْأَرْضُ مِنْ نَبَاتِهَا وَبَرَكَاتِهَا شَيْئًا إِلَّا أَخْرَجَتْهُ۔

پھر وہی خلافت بطریقِ نبوّت ہوگی جو لوگوں کے درمیان نبیؐ کی سُنّت کے مطابق عمل کرے گی اور اسلام زمین میں پاؤں جمائے گا۔ اس حکومت سے آسمان والے بھی خوش ہوں گے اور زمین والے بھی۔ آسمان دل کھول کر اپنی رحمتوں کی بارش کرے گا اور زمین اپنے پیٹ کے سارے خزانے اُگل دے گی۔

☆ ☆ ☆ ☆

اس پر مولانا مودودیؒ نے اپنی تشریح میں یہ لکھا ہے کہ تمام قرائن بتا رہے ہیں کہ انسانی تاریخ تیزی کے ساتھ اس کی طرف (متذکرہ پانچویں دَور کی طرف) بڑھ رہی ہیں انسانی ساخت کے سارے ازم آزمائے جا چکے ہیں اور بُری طرح ناکام ہوئے ہیں آدمی کے لیے اب اس کے سوا چارہ نہیں کہ تھک ہار کر اسلام کی طرف رجوع کرے۔ اس گفتگو میں مضمر بات یہ ہے کہ عالمگیر حد تک اس دَور کے آنے سے پہلے مختلف اقوام اور خطوّں میں نظامِ حق کی تجدید ہو سکتی ہے اور یہ کہ اس طرح کا کام کرنیوالی مختلف تحریکیں کشمکش کر کے وہ ماحول تیّار کریں گی جس میں ملّتِ اسلامیہ کا وہ کامل

لیڈر پیدا ہو جسے الامام المہدی کے لقب سے متعارف کرایا گیا ہے۔ سب سے اہم قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ آنے والے دورِ سلامتی کے ظہور کے سلسلے میں ہم نے کیا خدمات انجام دیں۔

ٹوٹی ہوئی اُمیدوں کو بحال کرنے کے لیے تجدید واحیائے دین کا ایک بہت ہی مؤثر اور اہم پارٹ یہ ہے کہ مولانا نے کراماتی اور طلسماتی فضا سے نکال کر امام مہدی کے تصوّر کو کھلی اور روشن فضا میں لا کھڑا کیا۔ کہنے کو اتنی سی بات کہی کہ مہدی اپنے زمانے کے لحاظ سے ایک جدید ترین طرز کا لیڈر ہوگا۔ لیکن اس چھوٹی سی بات کا بڑا اثر یہ نمودار ہوا کہ کسی عظیم المرتبہ اور مافوق الفطرت اوصاف سے آراستہ شخصیت کا انتظار کرنے کے بجائے لوگوں میں یہ جذبہ پنپنے لگا کہ ایمان واخلاق اور فکر وحکمت سے آراستہ گوشت پوست کی عام شخصیّتوں کے ساتھ مل کر دین کی خدمت کی جاسکتی ہے، مگر چونکہ یہ طرزِ فکر لوگوں کے ذہنوں میں بنے ہوئے محلّاتِ فکر کو متزلزل کرنے والا تھا اس لیے طرح طرح کے اعتراضات بھی اٹھے اور سوالات بھی ہوئے۔ خصوصًا تادیر جماعت کے شرکا، اکابر اور خود مولانا مودودی پر حملہ ہوتا رہا کہ تقویٰ تو ہے نہیں اور چلے ہیں دین کی خدمت کرنے۔ معترضین کا یہ اعتراض بالعموم مروّجہ تصوّف کے دیے ہوئے تصوّرِ تقویٰ کے لحاظ سے تھا۔ اس سلسلے میں تجدید واحیائے دین کے ضمیموں کے علاوہ رسائل ومسائل میں بحثیں ملیں گی، مگر ایک جگہ اپنے ساتھیوں کو ہدایات دیتے ہوئے مولانا نے یہ فرمایا:

> "رہیں بشارتیں اور کشوف وکرامات اور انوار وتجلّیات، تو آپ ان کے اکتساب کی فکر میں نہ پڑیں۔ سچّی بات یہ ہے کہ اس مادّی دنیا کے دھوکا دینے والے مظاہر میں توحید کی حقیقت کو پالینے سے بڑا کوئی کشف نہیں ہے۔ شیطان اور اس کی ذرّیّت کے دلائے ہوئے ڈراوؤں اور لالچوں کے مقابلے میں راہِ راست پر قائم رہنے سے بڑی کوئی کرامت نہیں ہے۔ کفر وفسق اور ضلالت کے اندھیروں میں حق کی روشنی دیکھنے اور اتباع

کرنے سے بڑا کوئی مشاہدۂ انوار نہیں ہے، اور مومن کو اگر کوئی سب سے بڑی بشارت مل سکتی ہے تو وہ اللہ کو رب مان کر اس پر جم جانے اور ثابت قدمی کے ساتھ اس کی راہ پر چلنے سے ملتی ہے۔"

مروّجہ تصوّف کے بجائے ان جملوں میں سچّا اسلامی تصوّف بیان ہو گیا ہے۔ جس کے مراتب کو ایک عامی مسلمان بھی حاصل کر سکتا ہے۔ ان جملوں میں تصوّف کی اصل روح اور اصل حقیقت آگئی ہے۔ نقطۂ نظر کی تبدیلی نے عام مسلمان نوجوانوں میں بھی حوصلہ پیدا کر دیا کہ وہ دین کی خدمت کر سکتے ہیں اور ایمان و تقویٰ سے بہرہ مند ہو سکتے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ دنیا میں کوئی عام لیڈر تک ایسا نہیں گزرا جس نے لوگوں کو سرمایۂ اُمید فراہم کیے بغیر ان کو منظم و متحرک کر لیا ہو۔ کجا کہ تجدید و احیائے دین کی راہ میں کام کرنے والا کوئی داعی و نقیب اُٹھے اور جن لوگوں کو پکارے اُن کے دلوں کو مایوسی کی تاریکیوں سے نکالے بغیر ذرا سا بھی مؤثر کام کر سکے۔ ہر وہ شخص جس نے کسی بھی دور میں حق کی علمبرداری کا کام کیا ہے وہ شدید ناسازگاریٔ ماحول اور مخالفتوں کی بوچھاڑوں میں بھی اُمید کا ایک اٹل مینارۂ نور ثابت ہوا ہے۔ مولانا مودودیؒ شروع سے آخر تک مضبوط اُمید کے ساتھ کام کرتے رہے ہیں اور انھوں نے مایوسی اور جمود کی برف توڑنے کا کام "تجدید و احیائے دین" اور دوسرے مقالات و مضامین لکھ کر کیا ہے۔

فضا کی تیاری کا ۹ سالہ دَور

تشکیلِ جماعت سے پہلے کے مرحلۂ کار کو خود مؤسّسِ جماعت نے ۹ رسال پر پھیلا ہوا بتایا ہے، یعنی ۱۹۳۲ء سے ۱۹۴۱ء تک۔

فضا کی تیّاری کے اس مرحلۂ تنقید و تبلیغ میں ہر دو پہلوؤں سے جو کام ہوا اس کی بہترین مختصر رپورٹ وہی ہے جو خود مولانا مودودی کی مرتّب کردہ ہے۔ ملاحظہ ہو:

"ایک طرف جاہلیت کے ہر گوشے پر تنقید کی گئی۔ قدیم مشرکانہ اور راہبانہ

جاہلیتوں پر بھی اور جدید مغربی جاہلیت پر بھی۔ جاہلیت کے ان اثرات پر بھی جو اپنی پچھلی تاریخ کے دوران میں ہم قبول کرتے رہے ہیں، اور ان اثرات پر بھی جنھیں آج ہم اپنی زندگی میں لیے ہوئے ہیں۔ ان ساری جاہلیتوں پر تنقید کر کے ان کی عقلی کمزوریوں اور ان کے اخلاقی و تمدّنی نقصانات کو واضح کیا گیا اور پورا تجزیہ کر کے بتایا گیا کہ اسلام کا راستہ اپنی فکری بنیادوں اور اپنے عملی نتائج میں ان جاہلیتوں سے کس کس طرح ممیّز ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کے مختلف مدارسِ فکر پر بھی تنقید کی گئی۔ فقہی جمود کے حامیوں پر بھی اور اجتہادِ مطلق کے مدّعیوں پر بھی۔ حدیث کا انکار کرنے والوں پر بھی اور حدیث کے بارے میں غلو کرنے والوں پر بھی۔ دین سے آزاد ہونے والوں پر بھی اور دین کو اپنی خواہشات کا پابند بنانے والوں پر بھی۔ اس پورے تنقیدی کام میں جو کچھ ہمارے پیشِ نظر تھا وہ صرف یہ تھا کہ مسلمانوں کے صاحبِ فکر لوگوں کی ان ذہنی الجھنوں کو دور کیا جائے جن کی وجہ سے ان کے لیے اسلام کو سمجھنا اور خیالات کے جنگل میں شاہ راہ کو دیکھنا مشکل ہو رہا تھا، اسی وجہ سے جب کبھی ہماری تنقیدوں پر بگڑ کر کسی نے ہمکو بحث میں الجھانا چاہا اور اس کی نوبت بارہا آئی ہے۔ تو ہم نے اس کے ساتھ الجھنے سے انکار کر دیا۔

دوسری طرف اس مرحلے میں اسلام کے پورے نظامِ زندگی کو، جیسا کہ وہ خدا کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت میں بیان ہوا ہے، معقول اور مدلّل اور مفصّل طریقے سے پیش کیا گیا۔ اس کے عقائد اور ایمانیات کیا ہیں، اس کا نظریۂ کائنات وانسان کیا ہے، اس کا فلسفۂ اخلاق کیسا ہے، اس کی عبادات کس غرض کے لیے ہیں، وہ انسانی سیرت و کردار کو کس سانچے میں ڈھالنا چاہتا ہے، اس کی تہذیب کے بنیادی اصول کیا ہیں، وہ تمدّن، معیشت، معاشرت اور سیاست کے لیے کیا قاعدے تجویز کرتا ہے،

اس کے مزاج سے کس قسم کا نظامِ تعلیم مناسبت رکھتا ہے، وہ انسانی زندگی کے مسائل کو پہلے کس طرح حل کرتا تھا اور آج کس طرح کر سکتا ہے، اسکے نظامِ زندگی کو برپا کرنے کے لیے پہلے کیا کچھ کیا گیا ہے اور آج کیا کیا جا سکتا ہے۔ ان تمام امور کو جہاں تک ہمارے بس میں تھا ہم نے ایسے طریقوں سے پیش کرنے کی کوشش کی جو موجودہ دَور کے تعلیم یافتہ آدمی کو مطمئن کر سکیں، مگر اس کام کا مقصد محض ایک علمی خدمت انجام دینا نہ تھا بلکہ اوّل روز سے ہمارے پیشِ نظر یہ تھا کہ جو لوگ سوچ سمجھ کر اسلام کے معتقد ہوں وہ اس کو عملاً قائم کرنے کے لیے بھی تیار ہو جائیں۔ اس لیے ہم ہر قدم پر دماغوں کو مطمئن کرنے کے ساتھ دلوں کو اُکسانے کی کوشش بھی کرتے رہے اور ایمان کی دعوت کے ساتھ یہ بات بھی ذہن نشیں کرتے رہے کہ کوئی دین کسی دوسرے دین کی آغوش میں پرورش نہیں پا سکتا لہٰذا جو لوگ بھی سچّے دل سے اسلام کی پیروی کرنا چاہتے ہوں انھیں دُنیا میں کفر کی امامت کے بجائے اسلام کی امامت قائم کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگانے پر تیّار ہونا چاہیے۔"

(جماعتِ اسلامی کا مقصد۔ تاریخ۔ لائحۂ عمل۔ ص ۲۳ تا ۲۶)

ان مقاصد کو جن تحریروں سے پورا کیا گیا وہ بیس مطبوعات کی شکل میں موجود ہیں[1] ان کے علاوہ مرحلۂ دعوت سے قبل الجہاد فی الاسلام شائع ہو چکی تھی۔ اسلامی انقلاب

---

[1] ان کتابوں کی فہرست حسبِ ذیل ہے:

- اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی اور مسئلۂ جبر و قدر (۳۳ء تا ۳۸ء)
- تنقیحات اور تفہیمات حصّۂ اوّل و دوم کے بیشتر مضامین (۳۳ء تا ۳۸ء)
- حقوق الزوجین اور اسلام اور ضبطِ ولادت (۳۵ء)
- خطبات (۳۸ء)

(باقی صفحۂ آئندہ پر)

کے لیے بڑی حد تک ضروری فکری مواد ان کے اندر آ گیا تھا، اور یہ لٹریچر تیزی سے اثرانداز ہونے لگا۔ یہ تحریریں جگہ جگہ لوگ پڑھتے اور دوسروں کو سناتے اور از خود اُنکو پھیلاتے۔ مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ سے بے شمار لوگ خط وکتابت میں متعلقہ مباحث کو چھیڑتے اور ملاقاتوں میں سوالات اور اعتراضات پیش کر کے وضاحتیں حاصل کرتے قارئین کے حلقوں میں جا بجا بحثوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ سب کچھ آثار تھے اس ذہنی حرکت کے جو چاروں طرف پیدا ہو رہی تھی۔

تجدیدِ اصطلاحات

لیکن یہ کام جس کا اجمالاً ذکر کیا گیا ہے اس کا ایک اور پہلو بڑا اہم تھا۔ دنیا کے ہر نظام یا دین کو سمجھنے کے لیے اس کی اصطلاحات کلید کی حیثیت رکھتی ہیں۔ خود لفظِ "اسلام" اور لفظِ "مسلم" اصطلاحی معنویّت رکھتے تھے۔ اسی طرح دوسری بے شمار معروفِ عام اصطلاحات ایسی تھیں جن پر جمود کی گرد اتنی پڑ چکی تھی کہ اُن کی صحیح معنویّت کو پہچاننا مشکل ہو گیا تھا۔ ہماری دینی اصطلاحات کے وہ بیج جن سے پورے ایک نظامِ فکر اور نظامِ عمل کی فصل اُگتی رہنی چاہیے تھی، جیسے اپنی قوّتِ نمو کھو چکی تھیں، مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ کے کارنامۂ عظیم کے فہم کے لیے یہ حقیقت جاننا ضروری ہے کہ انھوں نے تمام مستعمل و معروف اسلامی اصطلاحات کی اصل معنویّت کو از سرِ بحال کر دیا۔

باقی صفحہ گزشتہ کا

"رسالۂ دینیات، سود، پردہ (۱۹۳۶ء، ۱۹۳۷ء)
"اسلام کا نظریۂ سیاسی اور اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر (۱۹۳۹ء)
"تجدید و احیائے دین، اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے اور ایک اہم استفتاء (۱۹۴۰ء)
"قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں، اسلام اور جاہلیت، نیا نظامِ تعلیم اور انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل (۱۹۴۱ء)

جب ہمارے کانوں میں یہ آواز آتی ہے کہ "مسلمان اور چور؟ مسلمان اور قاتل؟ مسلمان اور زانی؟" تو اسے سُنتے ہی ہم چونک جاتے ہیں اور سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ مسلمان آخر کیا ہوتا ہے۔ پھر آواز آتی ہے کہ "آج مسلمانوں کی اتنی ہی قسمیں پائی جاتی ہیں جتنی سانپوں کی ہوتی ہیں، حالاں کہ مسلمان انسانوں کی صرف ایک ہی قسم کا نام تھا۔" پھر جب ہم مولانا کے جہانِ افکار سے گزرتے ہوئے یہ جملہ پڑھتے ہیں کہ ــــ "ساری کائنات کا مذہب اسلام ہے ــــ سورج، چاند اور تارے سب مسلم ہیں، زمین بھی مُسلم ہے، ہوا اور پانی اور روشنی بھی مسلم ہیں، درخت اور پتھر اور جانور بھی مُسلم ہیں اور وہ انسان بھی جو خدا کو نہیں پہچانتا اور خدا کا انکار کرتا ہے، جو خدا کے سوا دوسروں کو پوجتا ہے، جو خدا کے ساتھ دوسروں کو شریک کرتا ہے، ہاں وہ بھی اپنی فطرت اور طبیعت کے لحاظ سے مسلم ہی ہے ــــ اس کے تمام اعضاء اور اس کے جسم کے ایک ایک رونگٹے کا مذہب اسلام ہے ــــ حتیٰ کہ اس کی وہ زبان بھی مسلمان ہے جس سے وہ نادانی کے ساتھ شرک اور کفر کے خیالات ظاہر کرتا ہے، اس کا وہ سر بھی پیدائشی مسلم ہے جس کو وہ زبردستی خدا کے سوا دوسروں کے سامنے جھکاتا ہے۔"

(رسالۂ دینیّات۔ ص ۱۱، ۱۲)

پھر نسلی اور مردم شماری کے مسلمانوں اور شعوری طور پر اسلام پر ایمان رکھنے والے مسلمانوں کا فرق سامنے آتا ہے۔

سچّی بات یہ ہے کہ زندگی میں پہلی مرتبہ جب اللہ کا مفہوم متذکرہ لٹریچر میں واضح ہو کر سامنے آیا تو کلمۂ طیبہ سمجھ میں آیا اور اندازہ ہوا کہ مسجدوں کے مؤذّنوں کی پکار کتنی انقلابی ہوتی ہے جسے نہ وہ سمجھ رہے ہوتے ہیں، نہ ان کے سُننے والے۔

پھر جب دین اور مذہب اور ربّ اور عبادات کی اصطلاحیں واضح ہوئیں تو نگاہوں میں چکا چوند سی ہو گئی۔ سمجھ میں آیا کہ کیا کیا قوّتیں دنیا میں ربّ اور الٰہ بنی ہوئی ہیں اور خود ہم مسلمان ان ارباب والٰہ کو اپنی خدمات سے مضبوط کرنے میں مصروف ہیں

سمجھ میں آیا کہ دنیا کے مختلف سیاسی اور تمدّنی نظام اپنی جگہ ایک دین کی حیثیت رکھتے ہیں لادین جمہوریّت ہو یا اشتراکیّت یا قوم پرستی یا سیکولر وطنی اسٹیٹ یا خاندانی بادشاہت یا شخصی آمریّت، ان سارے پیرایوں میں خدا کے باغی انسانوں نے اپنی جھوٹی خدائیاں قائم کررکھی ہیں اور باطل ادیان و شرائع چلا رکھےّ ہیں۔ پہلی بار یہ واضح ہوا کہ دین جہاں ایک طرف تہذیب کی وسعتوں پر حاوی ہے وہاں دوسری طرف وہ جدید اسٹیٹ جیسا خدائی اقتدار سیاست میں چاہتا ہے۔

عبادت کے متعلق کبھی یہ سوچا نہ تھا کہ عبادتِ خمسہ کی اوّلیت واہمیّت اپنی جگہ، مگر حقیقت میں مطلوب یہ ہے کہ مومن ومسلم کی پوری زندگی عبادت میں گزرے، یعنی اس کا ہر قول و فعل خدا کے امر واِذن کے دائرے میں آجائے۔ کبھی سوچا نہ تھا کہ خدا کے اوامر ونواہی کی حدود سے بے نیاز ہوکر کسی کی بگٹٹ اطاعت کرنا اس کی عبادت کی تعریف میں داخل ہے اور عنداللہ یہ شرک وبغاوت کا رویّہ ہے۔

پھر دعوت،جہاد، شہادت، ہجرت اقامت دین، صبر وغیرہ دوسری ساری اصطلاحات پر پڑے ہوئے پردے ہٹتے چلے گئے۔ اُمّت اور ملّت اور جماعت، امامت اور خلافت کے تصوّرات واضح ہوئے، اسلام کے نظریۂ سیاسی میں تو داعیٔ حق نے دو نئی اصطلاحات وضع کرکے بہت سے ذہنوں کو چونکا دیا۔ اُن میں سے ایک اصطلاح THEO-DEMOCRACY کی تھی، یعنی خدا پرستانہ جمہوریّت دوسری تھی POPULAR-VICEGERENCY یعنی جمہوری خلافت۔ خاص طور پر جمہوری خلافت کی بحث نے ان بے شمار الجھنوں کا خاتمہ کردیا جو اس دور میں اسلام اور جمہوریت کے متعلق پھیلی ہوئی تھیں۔ مسلمانوں کے لیے قوم ہونے کے بجائے جہانی انقلابی پارٹی ہونے کا تصوّر بھی سوچ بچار کی نئی راہیں کھولنے والا تھا۔

بعد کے تمام ادوارِ کار میں مولانا مودودی نے بے شمار اصطلاحات کی اصل دینی معنویّت کو اس طرح نکھار کر پیش کیا کہ عام آدمی نے بھی بات پالی۔ مثلاً سُنّت و بدعت والی تقریر کو نگاہوں میں لائیے۔ فرقہ وارانہ طرزِ فکر نے متذکرہ دونوں

اصطلاحوں کو اسلحۂ جنگ بنا دیا ہے، مگر مولانا مودودی نے حکیمانہ انداز سے یہ حقیقت سامنے رکھی ہے کہ سُنّت ایک مستقل روش کا نام ہے اور بدعت اس کے مقابل دوسری روش ہے۔
تنقیحات ایک ایسی کتاب ہے جس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ اعلانِ جنگ ہے دورِ حاضر کے خلاف۔ یوں تو بہت سے دوسرے مقالات اور تقاریر میں مغربی فکر اور مغربی تہذیب اور لادینی نظام ہائے سیاست و معیشت پر بصیرت افروز گفتگوئیں ملتی ہیں، لیکن مغربی تہذیب و معاشرت کے حملے اور اس کے مسلم مفتوحین کو پیشِ نظر رکھ کر جس خوبی سے مولانا نے اہلِ مغرب کے غلبے اور مسلمانوں کی مغلوبیت کے اسباب، مغرب کی فکری امامت اور اس کا تنقیدی تجزیہ، مغربی طرزِ تعلیم اور اس پر تبصرہ اور مغربی یورش کے جواب میں مسلمانوں کے اختیار کردہ مختلف موقفوں کا جائزہ تنقیحات کے اوراق میں پیش کیا ہے، یہ سارا مواد مخاطب نوجوان طبقوں کو مغرب کے تہذیبی سیلاب کے خلاف جوابی سیلاب اُٹھانے کے لیے تیّار کرنے کا محرّک بنا۔

سیاسی حالات میں بھاری تبدیلیاں

اس نوسالہ مرحلے کے متعلق مولانا فرماتے ہیں کہ شاید کچھ اور دراز ہوتا اور راقم کے خیال کے مطابق بھی دراز ہونا چاہیے تھا۔ مگر ملک کے سیاسی حالات میں تیزی سی ایسی بھاری تبدیلیاں نمودار ہوئیں کہ مرحلۂ دوم میں قدم رکھنا پڑا۔ وہ تبدیلیاں کیا تھیں؟ مولانا فرماتے ہیں کہ:

> ”۱۹۳۷ء میں مجھ کو حیدرآباد سے دہلی جانے کا اتفاق ہوا۔ اس سفر کے دوران میں میں نے محسوس کیا کہ ہندوستان کے چھ صوبوں میں کانگریس کی حکومت قائم ہو جانے کے بعد مسلمانوں پر کھلی کھلی شکست خوردگی کے آثار طاری ہو چکے ہیں۔ ــــــــ میں نے دیکھا کہ مسلمان، ڈاکٹر کھرے سے بالکل اس طرح باتیں کر رہے تھے جیسے ایک محکوم قوم کے افراد ایک حاکم قوم سے کرتے ہیں۔ یہ منظر میرے لیے ناقابلِ

برداشت تھا۔ حیدر آباد پہنچا تو یقین کیجیے کہ میری راتوں کی نیند اڑ گئی۔ سوچتا رہا کہ یا اللہ اب اس سرزمین میں مسلمانوں کا کیا انجام ہونا ہے۔"

(۲۹ سال۔ ص ۲۳)

تب مولانا نے وہ سلسلۂ بحث لکھنا شروع کیا جو مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصّہ اوّل کے نام سے شائع ہوا۔

پھر ۱۹۳۸ء میں کانگریس نے مسلمانوں میں رابطہ عوام یا MUSLIM MASS CONTACT کی جو تحریک شروع کی اس کے متعلق مولانا لکھتے ہیں:

"مسلم رابطۂ عوام کی مہم شروع کی گئی جس کے اصل کارکن مسلمان کیمونسٹ تھے اور غضب یہ کہ اس کام میں علمائے کرام کا ایک گروہ بھی ان کا ساتھ دے رہا تھا۔ یہ گروہ اس بات کا قائل تھا کہ ہندو اور مسلمان مل کر ایک قوم بن سکتے ہیں اور اس قوم کے اندر ایک ایسا جمہوری نظام رائج ہو سکتا ہے جس میں فیصلہ اکثریّت کرنے والی ہو۔ اس پر میں نے وہ مضامین لکھنے شروع کیے جو مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصّہ دوم اور مسئلۂ قومیّت کے نام سے شائع ہو چکے ہیں ——— میں نے اپنا پورا زور اس کام میں صرف کر دیا کہ مسلمانوں کو غیر مسلم قومیّت کے اندر جذب ہونے سے بچایا جائے۔"

(۲۹ سال۔ ص ۲۴) [1]

اپنے اس نقطۂ نظر کی توجیہ مولانا نے یوں پیش کی کہ:

"ظاہر بات ہے کہ جو شخص بھی اسلام کو یہاں سربلند کرنا چاہے گا وہ ضرور یہ خیال کرے گا کہ میرے پاس پہلے سے جو سرمایہ موجود ہے وہ ضائع نہ ہو جائے۔"

(۲۹ سال۔ ص ۲۵)

اس داستان کا اگلا باب یہ ہے کہ بقول مولانا:

---

[1] صرف ۲۹ سال لکھنے سے مراد "جماعت اسلامی کے ۲۹ سال۔ (ملاحظہ ہو گزشتہ ص ۲۲۷۔۲۲۸)

"اس کے بعد ۱۹۳۹ء اور اس کے بعد کا دور آیا۔ مسلم لیگ کی تحریک نے زور پکڑا۔ پاکستان کی تحریک اٹھنی شروع ہوئی، جس نے آخر کار ۱۹۴۰ء میں قراردادِ پاکستان کی شکل اختیار کی ——— اس زمانے میں جو بات میرے نزدیک اہم تھی وہ یہ تھی کہ مسلمانوں کو اس بات کا احساس دلایا جائے کہ تم محض ایک قوم نہیں ہو، تم ایک مبلغ قوم ہو، ایک مشنری قوم ہو، تمھیں وہ حکومت قائم کرنی چاہیے جو دنیا میں اسلام کے لیے ایک مشنری حکومت بن جائے ——— اس غرض کے لیے میں نے وہ سلسلۂ مضامین لکھنا شروع کیا جو بعد میں مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصّہ سوم کے نام سے شائع ہوا۔"

(۲۹ سال۔ ص ۲۵، ۲۸)

تشکیلِ جماعت کی تیاری

مولانا فرماتے ہیں:

" جب میں نے دیکھا کہ میری آواز صدا بصحرا ثابت ہو رہی ہے تو پھر دوسرا قدم جو میری سمجھ میں آیا، یہ تھا کہ اپنی طرف سے ایک ایسی جماعت منظم کرنی چاہیے جو صاحبِ کردار لوگوں پر مشتمل ہو اور ان فتنوں کا مقابلہ کرسکے جو آگے آتے نظر آرہے ہیں ——— اس وقت جو اہم ترین سوالات میرے سامنے تھے وہ یہ تھے کہ حالات جس رُخ پر جا رہے ہیں ان میں ایک شکل تو یہ پیش آسکتی ہے کہ پاکستان کے لیے کوشش کرکے مسلم لیگ ناکام ہوجائے اور ہندوستان میں انگریز واحد ہندوستانی قومیّت کی بنیاد پر ایک جمہوری حکومت قائم کرکے اُسے ہندوؤں کے حوالے کرکے چلا جائے۔ اس صورت میں کیا کرنا ہوگا؟ دوسری شکل یہ پیش آسکتی ہے کہ مسلم لیگ اپنے مقصد میں کامیاب ہوجائے اور ملک تقسیم ہوجائے۔ اس صورت میں

کروڑوں مسلمان ہندوستان میں رہ جائیں گے۔ ان کا حشر کیا ہوگا؟
یہ موقع تھا۔ جب میں نے قطعی طور پر فیصلہ کر لیا کہ جماعتِ اسلامی کے
نام سے ایک جماعت قائم کی جائے۔"

(۲۹ سال۔ ص ۲۵، ۲۶، ۲۷)

تشکیلِ جماعت کے اقدام سے پہلے پہلے، الجھنوں کے اور بھی بہت سے جھاڑ جھنکاڑ تھے جن کو موسّسِ جماعت نے صاف کیا۔ جابد الانفرادی مذہب پر مطمئن ذہنوں کو ہلا دیا، قرنوں سے دین و سیاست کا جو انقطاع رائج چلا آرہا تھا اسے ختم کیا اور واضح کیا کہ اسلام مذہب نہیں بلکہ ایک ایسا دین ہے جو سیاست پر بھی بہت حاوی ہے اسی طرح دین کے لیے جماعتی زندگی کی اہمیت اور منظّم نیکی کی ضرورت سے خواص و عوام کو آگاہ کیا

پھر جماعت قائم کرنے سے پہلے کے ماحول میں جب کہ بہت سے متأثرین میں اضطراب کی ایک لہر اٹھ چکی تھی اور وہ اسلام کے انقلابی مشن کے لیے کام کرنے کا کوئی اسلوب چاہتے تھے، موسّسِ جماعت نے یہ بھی بتایا کہ حالات کے سیلاب کا رُخ پھیر دینے، طاغوتی قوتوں سے عہدہ برآ ہونے اور زمانہ ستیزی کا مسلک اسلام کی علمبرداری کے لیے اختیار کرنے کا فریضہ کیسی جماعت ادا کر سکتی ہے۔ اس مقصد کے لیے مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مضمون لکھا "ایک صالح جماعت کی ضرورت" جو ابتداءً اپریل ۱۹۴۱ء کے ترجمان القرآن میں شائع ہوا۔ اس کا ایک اقتباس:

"اب انسانیّت کی نجات اسلام میں ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ بس اسلام کی دعوت شائع کر دیں اور دنیا مفتوح ہو جائے گی۔ ہر موجود تہذیب کی شکست و ریخت کے لیے ایک قوۃ اور ایک گروہ کی ضرورت ہوتی ہے اور پھر نئی تہذیب لانے کے لیے ایک فکر اور ایک جماعت کی ضرورت ہوتی ہے۔ بس دنیا کو آئندہ دورِ ظلمت کے خطرے سے بچانے اور اسلام کی نعمت سے بہرہ ور کرنے کے لیے صرف اتنی بات

کافی نہیں ہے کہ یہاں صحیح نظریہ موجود ہے۔ صحیح نظریے کے ساتھ ایک صالح جماعت کی بھی ضرورت ہے۔"

(ترجمان القرآن۔ اپریل ۱۹۴۱ء)

اس مضمون مین زور دیا گیا کہ اسلامی نظریے کی پشت پر ایسے صادق الایمان لوگوں کی جماعت موجود ہونی چاہیے جو اعلیٰ سیرت اور سرفروشی کی صفات رکھتے ہوں۔ کیوں کہ انھیں مسلّط نظام سے بغاوت کرتے ہوئے:

"اُن تمام فائدوں، لذّتوں، آسائشوں اور امیدوں کو چھوڑنا ہوگا جو اس نظام سے وابستہ ہوں اور رفتہ رفتہ ان تمام نقصانات، تکلیفوں اور مصیبتوں کو برداشت کرنا ہوگا جو ایک فاسد نظام کے تسلّط کو مٹانے اور ایک صحیح نظام قائم کرنے کے لیے ضروری ہے۔"

(حوالۂ مذکور۔ ترجمان القرآن اپریل ۱۹۴۱ء)

اور اس مضمون کی پشت پناہی تنقیحات کے ایک مضمون سے ہوتی ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

"یہ شریعت ان بہادر شیروں کے لیے اُتری ہے جو ہوا کا رُخ بدل دینے کی ہمّت رکھتے ہوں، جو صبغۃ اللہ کو دُنیا کے ہر رنگ سے زیادہ محبوب رکھتے ہوں، اور اس رنگ میں تمام دنیا کو رنگ ــــــ دینے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔ مسلمان جس کا نام ہے وہ دریا کے بہاؤ پر بہنے کے لیے پیدا ہی نہیں ہوا۔ اس کی آفرینش کا مقصد ہی یہ ہے کہ زندگی کے دریا کو اس راستہ پر رواں کر دے جو اس کے ایمان واعتقاد میں راہِ راست اور صراطِ مستقیم ہے۔"

(تنقیحات۔ کیشِ مرداں کہ مذہبِ گوسفنداں)

ایک اور ضروری حوالہ عرض ہے:

"ــــــ ضروری ہے کہ ویسی ہی تحریک اُٹھے، اسی قسم کے انفرادی

کیریکٹر تیار ہوں، اسی طرح کا اجتماعی اخلاق بنے، اسی طرز کے کارکن تربیت پائیں، اسی ڈھنگ کی لیڈر شپ ہو، اور اسی کیفیت کا اجتماعی عمل ہو جس کا اقتضا اس خاص نظامِ حکومت کی نوعیّت فطرتاً کرتی ہے جسے ہم بنانا چاہتے ہیں۔" (سیاسی کشمکش حصّہ سوم۔ طبع سوم۔ ص ۱۲۶)

کیسے لوگ درکار ہیں؟

پھر یہ سوال کہ کیسے لوگ درکار ہیں، اس کے متعلق یہ عبارت خصوصی اہمیّت رکھتی ہے کہ:

"اس جدّوجہد میں اس کے علمبردار مصیبتیں اٹھاکر، سختیاں جھیل کر، قربانیاں کر کے، مار کھاکر اور جانیں دے کر اپنے خلوص اور اپنے ارادے کی مضبوطی کا ثبوت دیں ———— اپنی لڑائی کے دوران میں اپنے ہر قول اور فعل سے اپنی مخصوص آئیڈیا لوجی کا مظاہرہ کریں۔ جس کے علمبردار بن کر وہ اٹھے ہیں، اور ان کی ہر بات سے عیاں ہو کہ واقعی ایسے بے لوث، بے غرض، راست باز پاک سیرت، ایثار پیشہ، بااصول خداترس لوگ انسانیّت کی فلاح کے لیے جس اصولی حکومت کی طرف دعوت دے رہے ہیں اُسمیں ضرور انسان کے لیے عدل اور امن ہوگا۔" (سیاسی کشمکش سوم ص ۱۳۲)

دوسرا ایک حوالہ:

"اس کو ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جن کے دلوں میں خدا کا خوف ہو، جو خدا کے سامنے اپنی ذمہ داری کا احساس رکھتے ہوں، جو دُنیا پر آخرت کو ترجیح دینے والے ہوں، جن کی نگاہ میں اخلاقی نفع و نقصان کا وزن دنیوی نقصان سے زیادہ ہوں۔ جو ہر حال میں اس ضابطہ اور طرزِ عمل کے پابند ہوں جو ان کے لیے مستقل طور پر بنا دیا گیا ہے۔ جن کی تمام سعی وجہد کا ہدفِ مقصود خدا کی رضا ہو، جن پر شخصی یا قومی اغراض کی بندگی اور ہوا و ہوس

کی غلامی مسلّط نہ ہو۔ جو تنگ نظری اور تعصّب سے پاک ہوں، جو مال اور حکومت کے نشے میں بدمست ہو جانے والے نہ ہوں۔ جو دولت کے حریص اور اقتدار کے بھوکے نہ ہوں۔ جن کی سیرتوں میں یہ طاقت ہو کہ زمین کے خزانے ان کے دستِ قدرت میں آئیں تو وہ پکّے امانت دار ثابت ہوں جب بستیوں کی حکومت ان کے ہاتھ میں آئے تو وہ راتوں کی نیندوں سے محروم ہو جائیں اور لوگ ان کی حفاظت میں اپنی جان، مال، آبرو، ہر چیز کی طرف سے بے خوف رہیں۔ جب وہ فاتح کی حیثیت سے کسی ملک میں داخل ہوں تو لوگوں کو اُن سے قتل و غارت گری، ظلم و ستم اور بدکاری و شہوت رانی کا کوئی اندیشہ نہ ہو۔"

(سیاسی کش مکش۔ حصّہ سوم۔ ص ۱۳۱)

یہ تھا فکری پس منظر جس کی تیاری مکمّل ہونے پر اگست ۱۹۴۱ء میں جماعتِ اسلامی قائم ہوئی۔ جماعت کے قیام کی فضا بڑی دل گداز تھی، شرکا میں احساس ذمّہ داری پوری طرح موجود تھا اور ایک طرح کا جذبۂ نومسلمانہ جذبۂ بے تاب کام کر رہا تھا۔

جماعت کی پندرہ۱۵ خصوصیّات

جماعتِ اسلامی کے امتیازی خدوخال یہ تھے:

(۱) دعوت، عقیدے اور نصبُ العین کی طرف تھی، نہ کہ کسی شخصیّت کی طرف۔

(۲) جماعت کی ہیئت فرقوں کی طرز کی نہ تھی، اور واضح طور پر یہ طے کیا گیا کہ ہمارا اِدّعا یہ نہیں ہوگا کہ اسلام صرف اسی جماعت کے اندر ہے۔

(۳) نہایت اہم بات یہ تھی کہ شرکا سے مطالبہ یہ تھا کہ جماعت کی دعوت اور نصبُ العین اور اس کے طریقِ کار کو پورے شعور سے سمجھ کر آئیں اور متفرّق تصوّرات اور دلچسپیوں کو چھوڑ کر اقامتِ دین کے کارِ عظیم کے لیے یکسو ہو جائیں۔

(۴) بنیادی کام یہ سونپا گیا کہ ہر شخص اپنے علمِ دین کو بڑھانے اور اپنی اصلاح

کرنے کے ساتھ ساتھ نظامِ حق کی دعوت کو بالمشافہ دوسروں تک پہنچائے اور اس سلسلے میں جو لٹریچر تیار ہوا ہے اسے پھیلائے۔ کوئی شک نہیں کہ اس پہلو سے ہمارے ابتدائی کارکنوں نے شاندار مثال قائم کر دی۔ انھوں نے رشتہ داروں، پڑوسیوں، تعارف کے لوگوں، دفتر اور کاروبار کے ساتھیوں تک پہنچ پہنچ کر سچّے اخلاص سے دعوت پیش کی، وہ بستی بستی گھومتے پھرے۔ انھوں نے ایک ایک دروازے پر دستک دی، وہ ہر مرحلے میں جماعت کا لٹریچر تھیلیوں میں ڈال کر نکل کھڑے ہوئے کہیں مخالفت ہوتی، کہیں مولانا اور جماعت کو گالیاں دی جاتیں، کہیں بات سنی جاتی کہیں سے یکایک تائید مل جاتی۔ میرا خیال ہے کہ ان کی ہر دس ملاقاتوں میں سے چار لازماً نتیجہ خیز رہیں۔ یہ انہی کی کمائی ہے جس کے نتیجے میں آج ہم وسیع تر دائرے میں کام کر رہے ہیں۔ انقلابی کام کرنے والوں کے لیے یہ وہ طریقِ کار ہے جس کا کوئی بدل نہیں اور جس کا کوئی توڑ نہیں۔ یہ وہ کام ہے جو ہر قسم کے حالات میں جاری رہ سکتا ہے۔ صرف عزم اور جرأت کی ضرورت ہے۔ اس کام کے بغیر نہ انقلابی عمل تیز ہو سکتا ہے، نہ انتخابی سرگرمی سے کچھ بڑے نتائج نکل سکتے ہیں۔ جماعتِ اسلامی کے کارکن کا یہ وہ مجنونانہ مشغلہ ہے کہ جو اگر جاری نہ رہے تو کارکن کارکن نہیں رہتا بلکہ ایمانی و اخلاقی لحاظ سے وہ زوال کا شکار ہو جاتا ہے، آج ہمارے جو ساتھی اس بنیادی کام کو باقی رکھے ہوئے ہیں، ہمارا حقیقی سرمایۂ زندگی وہی ہیں۔

(۵) جماعت کا انتظامی ڈھانچہ اس طرز پر بنایا گیا کہ اس کے اربابِ حل وعقد رفقاء کی راویوں کی تائید حاصل کر کے چلیں، مگر کوئی شخص خود کسی منصب کے لیے اُمید وار بن کر سعی نہ کرے۔

(۶) تنظیمی دائرے میں ایک دوسرے کے خلاف نجویٰ اور کنویسنگ اور گروہ بندیوں کو ممنوع قرار دیا گیا۔

(۷) تنظیم کا بنیادی واحدہ یا یونٹ مقامی جماعت کو قرار دیا گیا اور یہ ضروری قرار پایا کہ مقامی جماعتیں ہفتہ وار اجتماعات کر کے ان میں اجتماعی طور قرآن و حدیث کا مطالعہ کریں، پچھلے کاموں کی رپورٹیں جمع کریں اور آئندہ کے لیے نقشۂ کار طے کریں،

نیز مرکز سے شائع ہونے والے نئے لٹریچر (خصوصاً ماہنامہ ترجمان کی تازہ اشاعت اور وہاں سے آنے والی ہدایات اور اطلاعات کو اجتماع میں پیش کر کے ان پر غور کریں۔ علاوہ ازیں مقامی کام کے سلسلے میں جو مشکلات، رکاوٹیں اور مخالفتیں پیش آئیں اُن کا باہمی مشورے سے حل سوچیں یا مرکز یا بالاتر نظامِ حلقہ سے رہنمائی لیں۔

یہ مقامی تنظیموں اور ان کے ہفتہ وار اجتماعات کا نظام، دینی کام کے سلسلے میں گویا اوّلین تجربہ تھا اور کارِ دعوت کی اس تکنک کو اختیار کیا گیا جو دنیا کے جدید ترین تجربات کے لحاظ سے نہایت مؤثر تھی۔

(۸) جماعتِ اسلامی کا یہ بھی ایک امتیاز ہے کہ اس نے یہ فیصلہ کیا کہ جماعت کی دعوت و تنظیم کا سارا کام اپنے اندر ہی چندوں سے چلایا جائے اور باہر سے چندہ حاصل کرنے کی کوشش اپنی طرف سے نہ کی جائے، ہاں اگر عقیدہ و نصبُ العین سے اتفاق اور جماعت پر اعتماد کرنے والے اصحاب بے لوث اور بے ریا طریق سے اس دینی مہم میں حصّہ لینا چاہیں تو اس کے لیے دروازے بند نہ کیے جائیں، چنانچہ اللہ کے فضل سے آج تک جماعت کے لوگوں میں چندہ بازی اور چندہ خوری کی بیماری نہیں پائی گئی۔ صرف خدمتِ خلق یا دوسرے اہم قومی کاموں (مثلاً مجاہدین یا مہاجرین کی امداد وغیرہ) کے لیے۔ اگر عام لوگوں سے امانتیں لی گئیں تو رسید پرچے اور حساب کتاب کا کڑا نظم برسرِ عمل رہا اور وقتاً فوقتاً ایسے کاموں کے آمد و خرچ کے حسابات شائع کر دیے جاتے رہے۔ خدا کا کرم ہے کہ آج تک جماعت اور اس کے کارکنوں پر ان امانتی رقوم کے متعلق کوئی الزام عائد نہیں ہوا۔ پوری قوم حتیٰ کہ اختلاف کرنے والے لوگ بھی اس پہلو سے اعتماد کرتے ہیں۔

جماعت کے مالی بوجھ اُٹھانے کی ذمّہ داری اس کے ارکان اور ہمدردوں اور متفقین پر پڑی تو ان میں انفاق فی سبیل اللہ کے جذبے اُبھرے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا

خاص احسان ہے کہ جماعت کا کبھی کوئی کام مالی وجوہ سے نہ رُکا، نہ خراب ہوا۔

(۹) جماعتِ اسلامی نے اپنے لیے ایک غیر مصنوعی نظامِ تربیّت قرآن وسُنّت کی روشنی میں اختیار کیا جس کے چند پہلو یہ تھے: تربیّت بذریعہ لٹریچر، تربیّت بذریعۂ مطالعۂ قرآن وحدیث، تربیّت بذریعہ اجتماعات، تربیّت بذریعہ توسیع دعوت، تربیّت بذریعہ کشمکش۔ اس نظامِ تربیّت کو مضبوط بنانے کے لیے تربیّت گاہوں کا ایک نظام شروع کیا گیا جو آج تک جاری ہے۔

(۱۰) جماعت کے لیے فکری انداز، اور اس کے خاص نظامِ تربیت کی بعض برکات بالکل آغاز سے نمودار ہونے لگیں۔ مثلاً ایک یہ کہ اجتماعات اور جماعتی کاموں میں پابندیٔ وقت کو بڑے اہتمام سے اختیار کیا گیا۔ مجھے یاد ہے کہ اس دور میں کسی مقرّرہ وقتِ حاضری سے تاخیر ہوجاتی تھی تو احساسِ گناہ پیدا ہوتا تھا کہ ہم نے نظمِ جماعت کا حق ادا نہیں کیا۔ اس طرح امتیازی خوبی یہ اُبھری کہ جماعت کے اجتماعات میں بڑی سنجیدگی اور بڑا نظم وضبط پیدا ہوا۔ خصوصاً پچھلے دور میں مسلمان واعظوں اور لیڈروں نے بگٹٹ تقریروں کا جو اسلوب پیدا کردیا تھا جماعت نے اسے توڑدیا۔ اس کے بجائے تقریریں اس انداز سے کی جانے لگیں کہ اوّل تو مقرّرہ موضوع خطیب کے سامنے رہے اور اِدھر اُدھر نہ گھومے، دوسرے محض لذّتِ تقریر بڑھانے کے لیے لطائف اور قصّے کہانیاں بیان نہ کرے، بلکہ سامعین کی پوری توجّہ کو اپنے اصل حرفِ مدعا پر مرتکز کرائے۔ چنانچہ مولانا مودودی تو اس معاملے میں ایک معیاری مقام رکھتے تھے، دوسرے مقررین نے بھی اس طریقے کو اختیار کیا کہ پیشِ نظر تقریر کے تمام اجزار کو اس طرح ذہن میں پہلے سے مرتب کرلیتے جیسے ایک مضمون نگار کرتا ہے۔ پھر باری باری ایک ایک جزو پر تسلسل سے گفتگو کرتے۔ آہستہ آہستہ قوم اس طرزِ خطاب کی ایسی عادی ہوئی کہ دو دو گھنٹے کی تقاریر ۵۰، ۵۰ ہزار اور ۲، ۲ لاکھ کے مجمعے خاموشی اور سُکون سے سُنتے، جب کہ نہ نعرے بلند ہوتے، نہ لطیفے سنائے جاتے نہ ترنم سے کوئی مقرّر شعر الاپتا۔ پھر تقریروں میں مصنوعی جذباتیّت اور جوشیلے پن سے گریز کیا جاتا اور مخالفین کے لیے بھی غیر

شائستہ زبان استعمال نہ کی جاتی۔ ہمارے کتنے ہی رفیق ایسے ہوں گے جو گھر سے چلنے کے پہلے تقریر کے اہم حصّوں کے لیے مطلوبہ الفاظ تک کا ایک دھندلا تصوّر قائم کر لیتے۔ اس معاملے میں جماعت کا رویّہ یہ تھا کہ دوسروں سے اثر لینے کے بجائے دوسروں پر اپنے انداز کا اثر ڈالا جائے۔

(۱۱) اس جماعت کے قیام سے پہلے بھی دعوتِ اقامتِ دین کے زیرِ اثر بہت سے لوگوں کی زندگیوں میں واضح طور پر انقلاب نمودار ہوا۔ بہت سے لوگوں نے حرام کی آمیزش کی وجہ سے اپنی آمدنیاں چھوڑ دیں، اپنے کاروبار یا ملازمتیں ترک کر دیں، کئی حضرات نے اپنی جائدادیں مستحقین میں تقسیم کر دیں، بعض حضرات نے ناجائز طور پر حاصل کردہ املاک اصل مالکوں کو واپس کر دیں، سود کی آمدنی سے دست برداری اختیار کر لی، دنیوی جھگڑے خود ختم کر دیے، کسی پر زیادتی کی تو معافی مانگ لی، یہاں تک کہ پردے سے ناآشنا خواتین نے بُرقعے اوڑھ لیے، لوگوں نے تصاویر سے اجتناب کر لیا، — موسیقی کے شائقین نے سازوں کے ساتھ گانا سننا ہمیشہ کے لیے ترک کر دیا۔ خود مولانا مودودی اس تبدیلی کے متعلّق لکھتے ہیں کہ :

"سب سے بڑی چیز جو ہمارے نزدیک ہر دوسرے نتیجے سے زیادہ قیمتی ہے وہ یہ ہے کہ اس دعوت کا اثر جہاں جہاں بھی پہنچا ہے، اُس نے مردہ ضمیروں کو زندہ اور سوئے ہوئے ضمیروں کو بیدار کر دیا ہے۔ اُس کی اوّلین تاثیر یہ ہوئی ہے کہ نفس اپنا محاسبہ کرنے لگے ہیں۔ حلال اور حرام، پاک اور ناپاک، حق اور ناحق کی تمیز پہلے کی محدود مذہبیّت کی بہ نسبت اب بہت زیادہ وسیع پیمانے پر زندگی کے تمام مسائل میں شروع ہو گئی ہے ——— پہلے جو دینی حس اتنی کُند ہو چکی تھی کہ بڑی بڑی چیزیں بھی نہ کھٹکتی تھیں، اب وہ اتنی تیز ہو گئی ہے کہ چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی کھٹکنے لگی ہیں ——— خیالات کی پراگندگی دُور ہو رہی ہے — فضول اور دُور از کار دلچسپیوں سے دل خود ہٹ رہے ہیں، زندگی کے

حقیقی اور اہم تر مسائل مرکزِ توجہّ بن رہے ہیں "

حقیقت یہ ہے کہ کسی عقیدہ و دین کے قبول کرنے والوں کے فکر و عمل میں اسی طرح تبدیلی آیا کرتی ہے۔ اگر دینِ اسلام سے تعلق قائم ہونے کے باوجود کسی شخص کی عادات دوستیوں، دشمنیوں اور آمد و خرچ میں کوئی تغیرّ نہ آئے یا ایک دعوتِ حق دینے والے کی دعوت اُسے قبول کرنے والوں میں تبدیلی کا یہ عمل پیدا نہ کر دکھائے تو خوب سمجھ لینا چاہیے کہ یا دین کے شعور میں فرق آگیا ہے، یا اس کے لیے ویسی محبّت و فداکاری نہیں رہی جس کا تقاضا وہ کرتا ہے۔ لوگ اگر دعوتِ اسلامی کو پھیلاتے یا قبول کرتے ہوئے اپنے اموال، احوال اور اعمال میں حالتِ جمود دیکھیں تو ان کو اس خطرے کی طرف متوجہّ ہو جانا چاہیے کہ کہیں نہ کہیں کوئی خرابی ہے۔ شعوری ایمان لانے والا مسلمان غلط کاموں کے لیے جواز کی راہیں نہیں ڈھونڈا کرتا اور متضاد چیزوں میں جوڑ لگانے کے تجربے نہیں کیا کرتا۔ جماعتِ اسلامی زندگی پر چھائے ہوئے تضادات ہی کو تو ختم کرنے کے لیے اٹھی ہے۔

(۱۲) جماعتِ اسلامی میں ابتدا ہی سے اس امر کا اہتمام کیا گیا کہ دینی تعلیم یافتہ علماء اور ان کے متاثرین کے ساتھ جدید تعلیم یافتہ عناصر کو مل کر چلنا ہے۔ اور دونوں ایک دوسرے کی کمی کو پورا کرنے کا ذریعہ ہوں گے، اور دو طرفہ صلاحیتوں کے جمع ہونے ہی سے معاشرے میں وہ نئی قوّت اُبھر سکتی ہے جو کثیر التعداد لوگوں کا اطمینان حاصل کر سکے؛ چنانچہ یہ اللہ کا فضل ہوا کہ ہمارے حلقے میں دونوں اطراف سے آنے والے عناصر بالکل ہم آہنگ ہو کر چلے ہیں اور ایک دوسرے کے محبّ اور معاون رہے ہیں۔ ہمارے حلقوں میں جدید اور قدیم کا کبھی کوئی افتراق پیدا نہیں ہوا۔ یہ حکمتِ عملی آج تک کام کر رہی ہے کہ ہر دو دائروں کے اصحاب کو ان کی صلاحیتوں کے مطابق ذمّے داریاں سونپی جاتی ہیں۔ یہ معمولی بات نہیں بلکہ ملک و قوم میں دین کے مستقبل کے لیے نہایت درجہ اہمیّت رکھتی ہے۔

(۱۳) اس جماعت کو شروع ہی میں ایک اشارہ یہ دے دیا گیا تھا کہ سردست یہی کچھ ہمارا پروگرام ہے، آگے جیسے جیسے حالات ہوں گے کام کی نئی راہیں نکلتی رہیں گی اس اشارے میں جماعت کو ذہنی وفکری تحجّر سے بچایا اور وہ بعد کے بدلتے حالات میں مجتہدانہ حکمت سے نت نئی ذمّہ داریوں کو سمجھنے کے قابل ہوگئی اور طریقِ کار یا میدانِ عمل میں جس تبدیلی کی ضرورت پیش آئی، کتاب و سُنّت کی حدود میں رہتے ہوئے کشادہ دلی سے اختیار کرلی گئی۔ ورنہ اگر کہیں جماعت تدبیروں اور طریقہ ہائے کار اور نو بنو پیش آمدہ احوال سے عہدہ برا ہونے کے نئے نقشوں کے معاملے میں بند ذہن رکھتی تو سارا کام کسی بھی مرحلے میں پراگندہ ہوجاتا۔ مثلاً اگر اصولی انقلاب کی اس راہ پر مولانا مودودی قائم رہتے تو وہ آخر کیوں کانگریس کی متحدہ وطنی قومیّت کے خلاف معرکہ آرا ہوتے، یا پاکستان بننے پر اگر یہاں سیکولر دستور بن رہا ہوتا تو کیوں اس میں مخل ہونے کی فکر کرتے، یا مصائب کے موقعوں پر خدمت خلق کی مہمّات کیوں کی جاتیں۔ لیڈر اور کارکن یہ سوچتے کہ ہمارا کام تو اسلامی انقلاب برپا کرکے حکومتِ الٰہیّہ قائم کرنا ہے، ہم بیچ میں آنے والے حوادث پر کیوں توجّہ دیں؟ مگر خدا کا کرم تھا کہ اُس نے جہاں جماعت کو اصول و مقصد کا شعور اور اس کے لیے والہانہ محبّت دی وہاں نت نئے احوال وظروف سے پیدا ہونے والے تقاضوں کو ملحوظ رکھنے کی بھی بصیرت عطا کی۔

(۱۴) ہر رُکن کو اس امر کا ذمّہ دار ٹھہرایا گیا کہ وہ جماعت کے نصبُ العین، دستور اس کے اخلاقی معیار اور اُس کے طے شدہ طریقِ کار کا محافظ ہوگا اور اگر کبھی کوئی فرد یا گروہ یا لیڈر جماعت کو اس کے مقررہ راستے سے ہٹانے کی کوشش کرے یا عام فضا میں خلل آئے تو وہ ہر بگاڑ کے خلاف جماعت کو بچانے کی پوری کوشس کرے گا۔

(۱۵) جماعتِ اسلامی کی امارت اور نظم کے متعلّق پہلے ہی اجتماع کے موقع پر آگاہ کردیا گیا تھا کہ نہ اس جماعت کی نوعیّت عام سیاسی جماعتوں کی طرح کی ہے اور نہ اس کی امارت وقیادت کا معاملہ معمولی نوعیّت کا ہے۔ جہاں اس جماعت میں شریک ہونے والوں کو اس شعور سے اس میں آنا چاہیے کہ منہاجِ کتاب وسُنّت پر

احیائے دین کا کام کرنے والی ایک جماعت ہے، وہاں اس کے امیر کی اطاعت، اس سے محبّت، اس کی خیر خواہی سچّے دینی جذبے سے کرنی چاہیے۔ امیر سے تعلق میں اگر فرق آئے گا تو یہ دینی نقطۂ نظر سے ایک طرح کی معصیّت ہوگی۔

میں سمجھتا ہوں کہ ان پندرہ نکات کی روشنی میں جماعتِ اسلامی کے امتیازی وجود اور اس کے مزاج کو سمجھا جا سکتا ہے اور اس کے امیر، اس کے ذمّہ داروں، اس کے ارکان اور حامی کارکن اپنے بارے میں اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ ان کو کس روش پر چلنا ہے، اور ان کو ایسے تمام اعتراضات کے جواب بھی مل جائیں گے جن سے مختلف مراحل میں انھیں سامنا کرنا پڑا ہے۔

یہاں جماعتِ اسلامی کی پوری تاریخ بیان کرنا مدّ نظر نہیں بلکہ جماعت کی تشکیل کے پس منظر اور اس کے اعتقادی، مقصدی اور تنظیمی خدوخال کے پسِ منظر میں مولانا مودودیؒ کے طرزِ فکر اور ان کی شخصیّت کی ساخت کو سمجھنا مطلوب ہے۔

موجِ نور و نگہت

مولانا کی خدمت میں ہوں تو وقت کا کوئی بھی لمحہ ہو، ہردم بہ صد مسرّت یہی احساس ہوتا ہے کہ "یہ وقت ہے شگفتنِ گلُ ہائے ناز کا"، کچھ "گلہائے ناز" اور "گلہائے راز"، ہر ناز ایک راز، اور ہر راز ایک ناز!

کیوں نہ ہو، وہ لمحہ بھی شاید قدرت کے چمنستانِ تخلیق یا خیابانِ تکوین میں شگفتنِ گلُ ہائے ناز کا لمحہ ہوگا جب مولانا مودودی (رحمۃ اللہ) نے اس دنیا میں پہلا سانس لیا ہوگا۔ مولانا کی پوری شخصیّت کا اجمالی بیان صرف اتنا ہے کہ وہ کمالِ شعور اور شدّتِ احساس کے باوجود زندگی کی وادئ کرب والم سے گزرنے والی ایک موجِ نور و نکہت تھی جو موتی اور پھول برساتی گزر گئی۔ ان کے افکار اور ان کی دلیلیں موتیوں جیسی تھیں اور اُن کے مزاحیہ جملے پھولوں کی مانند تھے۔

کچھ لوگوں نے ان موتیوں اور پھولوں سے دامن بھر لیے، کچھ نے موتیوں پر پتھّر برسائے اور پھولوں پر انگارے پھینکے۔ اپنی اپنی نگاہ، اپنا اپنا نصیب!

غالباً پہلا آدمی میں تھا جس نے تحریری طور پر مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کی شگفتہ مزاجی کی ایک ہلکی سی جھلک اپنی کتاب "مولانا مودودی، ایک تعارف"، [1] (شائع شدہ: ۱۹۶۳) میں پیش کی تھی۔ پھر ہر لکھنے والے نے اس موضوع پر لکھا، اور لکھنے والے مجھ سے آگے نکل گئے، مگر ابتداء کو تو آگے پیچھے نہیں کیا جا سکتا، انتہا کی سرحد اور بھی آگے بڑھائی جا سکتی ہے، یعنی ابتداء معلوم، انتہا نا معلوم! ع

لکھّی جائیں گی کتابِ دل کی تفسیریں بہت

---

[1] وہی کتاب جس کا تازہ ایڈیشن آپ کے ہاتھ میں ہے۔

مولانا مودودی کا مسلک ہر معاملے میں اعتدالی تھا اور بالعموم انتہا پسندی سے بچ کر ترازو کے پلڑے برابر رکھتے۔ وہ نہ "مقطع" تھے، نہ ہنسوڑ"۔
ایسا نہ تھا کہ مولانا کی محفل میں زور شور سے قہقہے لگ رہے ہوں، لوگ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہے ہوں اور مسلسل ظرافت کا ایک طوفان برپا رہے۔ لیکن دوسری طرف یہ بھی نہ تھا کہ مولانا خشونت کا ایک پیکر بنے تقویٰ جھاڑ رہے ہوں اور حاضرین سر جھکائے منہ بسور رہے ہوں۔ ایک طرف دعوت و تحریک سے پیدا ہونیوالے معاملات و مسائل کی پیچیدگی اگر سنجیدہ تفکّر کا تقاضا کرتی تو دوسری طرف سیّد مودودی سنجیدگی کے بوجھ سے ساتھیوں کو بچانے کے لیے لطافتِ بیان سے کام لیتے۔ ان کا میدان تضحیک و استہزا نہ تھا جس کے پیچھے کہیں ڈھلا ہوا احساس کمتری کام کرتا ہے۔ نفرت و تحقیر کو ان کے دل میں جگہ نہ مل سکی۔ انھوں نے کبھی مہارتِ تکلّم کا نشانہ بنا کر کسی کی دل آزاری نہیں کی، کسی کی کمزوریوں کا خاکہ نہیں اُڑایا۔
وہ مزاح نگار بھی نہ تھے کہ سوچ سوچ کر مزاحیہ مضمون اور عبارتیں تخلیق کرتے ہنسنے ہنسانے کا فن انکے ذہن پر سوار نہیں تھا کہ ڈھونڈ ڈھونڈ کے لطیفہ دار واقعات کو بہم کریں اور پھر ایک کاریگر کی طرح انھیں لفظوں میں جوڑ جاڑ کر اس طرح لائیں کہ جو پڑھے سُنے، اس کا دل خوش ہو جائے۔ مولانا کے یہاں تبسّم انگیز کلام میں بھی آپکو ثقاہت و اخلاق سے گری ہوئی کوئی بات نہ ملے گی۔
بہت سے لوگوں نے "جنسیّت" کے لحاظ سے مزاح گوئی کی ہے اور کئی جگہ تو لکھنے والے بالکل غلاظت کی جھیل میں غوطہ ہی لگا گئے ہیں۔ حسُن کی باتیں ایسی بھونڈی کہ سرے سے حسُن غارت، مولانا نے اس جادۂ پامال پر کبھی قدم نہیں رکھا۔
مولانا مودودی لطیفہ گو بھی نہ تھے کہ مطالعہ اور گفتگوؤں سے لطائف جمع کرتے رہتے اور پھر حسب موقع استعمال فرماتے۔ ہمارے بزرگوں میں سے دو لطیفہ گو بڑے نمایاں تھے۔ ایک ملک نصر اللہ خاں عزیز، دوسرے ماہر القادری۔ (خدا دونوں کی مغفرت فرمائے) ان دونوں کے ساتھ سفر کرتے ہوئے ان کی لطیفہ بیانی سے استفادہ کا

لامتناہی سلسلہ جاری رہتا۔ لطف اندوزی کے لیے سامع ہمہ تن متوجہ ہونے کے ساتھ ساتھ برابر منتظر رہتا کہ اب آیا کوئی لطیفہ۔

۱۹۶۴ء کے جیل میں ملک نصر اللہ خاں عزیز مرحوم نے ایک مدّت تک ایسے تسلسل سے لطیفہ گوئی کی کہ ہمیشہ وہ دور یادرہے گا۔ یعنی ناشتے اور دوپہر اور رات کے کھانے کے دسترخوان کی تو ایک مستقل "ڈش" ہی ان کے لطائف کے رس گلّوں یا سموسوں کی ہوتی یاد رہے کہ ملک صاحب نے برسوں مدینہ (بجنور) کا فکاہی کالم لکھا اور پھر لاہور میں اپنے اخبار میں 'سیر و سفر' کے عنوان سے پھلجھڑیاں چھوڑتے رہے۔

یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ اصل موضوعِ گفتگو یہ تھا کہ مولانا مودودی اس انداز کے لطیفہ گو نہ تھے جو خندہ آفریں یا گفتگوؤں کی روایت ڈرامائی انداز سے بیان کر کے زعفران پاشی کرتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اِکّادُکّا موقعوں پر انھوں نے کسی مروّج لطیفے کی روایت بھی کی ہے۔

وہ گفتگوؤں میں اکثر اور تحریر میں کبھی کبھی بے ساختہ انداز سے لطافت پیدا کر دیتے اور ایسے جملوں کو میں "شگوفے" کہوں گا۔ یہ شگوفے تخلیقی انداز کے ہوتے، جن کی مثالیں غالبؔ کے یہاں ملتی ہیں، مگر مولانا کا رنگ قدرے مختلف ہے۔ مولانا کا مزاح آمیز کلام کسی پُرتکلّف انداز کی سوچ بچار کا نتیجہ نہ ہوتا، بلکہ شگوفہ دار بات وہ فی البدیہہ کہتے۔ مولانا کا اندازِ لطافت و مزاح کلام میں اس طرح ہوتا جس طرح آٹے میں نمک، مزاح برائے مزاح ان کا مسلک نہ تھا۔

مولانا مودودی نے اگرچہ کئی جگہ لفظوں کے اُلٹ پھیر سے بھی لطافتِ کلام پیدا کی ہے، مگر یہ ان کا مستقل اُسلوب نہیں ہے۔ ان کا اسلوب جہانِ معانی سے زیادہ تعلق رکھتا ہے۔ کئی جگہ دوسرے مفہوم کے جملے آپ نے کہے اور ان سے لُطفِ گفتار پیدا کیا۔ مثلاً:

ایک بار بھارت سے آئے ہوئے کچھ سکھ گھومتے گھامتے ۵۔ اے ذیلدار پارک میں بھی آ گئے۔ مولانا مودودی سے بھی ملے۔ مولانا کے یہاں پائیں باغ کے تختۂ گیاہی میں کرسیاں بچھی تھیں۔ وہ بیٹھ گئے۔ مولانا نے ان کی تواضع کے لیے "سیون اپ" کی بوتلیں منگوائیں جن کے ساتھ پلاسٹک کی نلکیاں بھی تھیں۔ وہ لوگ حسبِ قاعدہ نلکیاں بوتلوں میں ڈال کر

پانی پینے لگے۔ مولانا کے سامنے بھی سیون اَپ کی بوتل رکھی گئی، مگر انھوں نے پی نہیں۔ کسی نے توجّہ دلائی کہ مولانا آپ نہیں پی رہے ہیں؟ فرمایا:

"بھئی! یہ ٹھنڈا حقّہ تو مجھ سے نہیں پیا جا سکتا۔" سکھ مہمان بھی ہنس دیے۔ تب کوئی صاحب گلاس لائے اور مولانا نے اس میں پانی پیا۔ اب اس چھوٹے سے جملے میں ایک تو تشبیہ دیکھیے، دوسرے سکھوں کی مناسبت سے حُقّے سے مشابہ چیز سے بھی اجتناب کرنے کا انداز ملاحظہ فرمائیے۔

اس سلسلے میں مولانا کی شگفتہ مزاجی کا ایک نمونہ اور ــــ صدر ایوّب صاحب کے آخری دور میں عیدِ رمضان جمعہ کو پڑتی تھی۔ عوامی اوہام میں سے ایک یہ تھا کہ جس دفعہ عید اور جمعہ کے دو خطبے ایک دن جمع ہو جائیں، اس مرتبہ حاکم بدل جاتا ہے۔ یہ جاہلی تصوّر ایوانِ صدارت میں بھی پہنچ گیا۔ کچھ ڈر یہ بھی ہوگا کہ اس اجتماعِ سعدین کی وجہ سے سیاسی طور پر رائے عام تبدیلیٔ حاکم کے لیے تیّار ہو جائے گی۔ اور خدانخواستہ "نقّارۂ خدا" نہ بج جائے۔ سو، خاص اہتمام سے ایک دن پہلے ہی چاند نکلوایا گیا اور ریڈیو سے سرکاری اعلان ہو گیا کہ عید جمعرات کو ہوگی۔ اُدھر علمار ملک بھر سے شہادتیں تلاش کر رہے تھے۔ مطلع صاف ہونے کے باوجود کہیں سے شہادت نہ مل رہی تھی؛ چنانچہ علمار نے ٹیلیفون پر پوچھنے والوں کو ملک بھر میں اپنا فتویٰ بتا دیا کہ جمعرات کو روزہ ہوگا۔ اور جمعہ کو عید ہوگی۔ اس سلسلے میں بڑے دل چسپ واقعات ہوئے جن کے ذکر کا یہاں موقع نہیں۔ یہ البتّہ ذکر کر دینا ضروری ہے کہ سرکاری عید کے اعلان سے اختلاف کرنے کے جُرم میں مولانا مودودی بنّوں جیل پہنچا دیے گئے تھے۔ چند ہی روز میں رہائی ہو گئی۔

اس عید کے بعد کا قصّہ ہے کہ ولیمہ کی کسی دعوت میں مولانا اور چند رفقار مدعو تھے جس میں راقم بھی شامل تھا۔ اتفاق سے مولانا فارغ ہو کر چلے تو میں بھی ساتھ تھا۔ دوسرے کمرے میں قدم رکھتے ہی شیخ خورشید احمد مرحوم (وزیر) بالکل دروازے کے پاس بیٹھے تھے۔ مولانا سامنے ہوئے تو انھوں نے احتراماً اٹھ کر مصافحہ کیا اور بڑی پھُرتی سے طنزاً کہا "مولانا! گزشتہ عید مبارک!"

مولانا نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے کہا "مبارک باد" اگر جمعرات کی عید کی ہے تو سیدھی ایوّب خاں صاحب کو بھجوا دیجیے اور اگر علمار والی عید مراد ہے تو قبول!"

اس دن میں حیران رہ گیا کہ ایک شخص بالکل بے دھیانی میں چلا آرہا ہے اور اچانک ایک فِقرہ اس کے دماغ میں ٹکراتا ہے، مگر دماغی عمل کی اس سرعت کی کیا مثال کہ نہ صرف فقرے کا جواب دیا بلکہ اس مختصر جواب میں دین وسیاست کے اشارات بھی آگئے۔

مولانا کے اس لطیف مزاح یا شگفتہ مزاجی کا اثر یہ ہوتا کہ دلوں کے بوجھ اُتر جاتے پریشانیوں کے بادل چھٹ جاتے، مایوسیاں کافور ہو جاتیں، غافل آدمی چونک کر متوجہّ ہو جاتا، کارکنوں کے عزم وہمّت میں اضافہ ہو جاتا۔

جب لوگ یہ دیکھتے کہ آلام ومصائب اور اعتراضات والزامات سے گزرتا ہوا یہ شخص کبھی چیں بجبیں نہیں ہوتا، کبھی غصّے میں اس کا ذہن زیر وزبر نہیں ہوتا، اُلٹا وہ ہنستا کھیلتا موجہائے حوادث سے گزر جاتا ہے تو ساتھیوں کے دلوں سے غم اور دباؤ ہٹ جاتا، اور نوجوان قریب ہو جاتے۔

مولانا کی شگفتہ مزاجی کا اثر ایسے ہوتا کہ ان کے لیے دلوں کے کواڑ کھل جاتے اور وہ بڑی آہستگی اور خاموشی سے لوگوں کے عالمِ باطن میں داخل ہو جاتے۔ ٹھیک اس طرح جیسے آپ کی خواب گاہ کے کسی دریچے کی دراز سے صُبح کی پہلی کرن سُبک سُبک انداز میں داخل ہوتی ہے جب کہ اس میں نہ تپش ہوتی ہے نہ چبھن، ــــــــ محض آسودگی بخش روشنی کی ایک لکیر!

مولانا مودودی کی شگفتہ مزاجی بس ایسی ہی روشنی کی لکیریں بناتی رہی اور یہ لکیریں کئی انسانوں کی قسمت کی لکیریں بنتی رہتیں۔

(اخذ واقتباس از تقریظ بر کتاب "سیّد مودودی کی شگفتہ مزاجی")

سُوچ آن کردیا

مسلمانوں کے اندر انقلابی جذبے کی بیداری اور ان کے موجودہ تحریکی توجّہ کو پیدا کرنے میں بہت سی ہستیوں کا حصّہ ہے ۔ ان ہی ہستیوں میں سے ایک وہ شخص تھا جس نے اپنی شعوری زندگی کی ہر گھڑی اور قوّت کی ہر رمق اسی مقصد میں صرف کردی ۔ اِدھر وہ ہم سے جُدا ہوا ، اُدھر تیرہ سو ننانوے سال ہجری ختم ہوا اور چودھویں صدی اپنے اختتامی سال میں داخل ہوگئی ۔

وہ تھا ساداتِ چشت کا چشم و چراغ اور خواجہ مودودؒ چشتی کے سلسلۂ اخلاف کا گہرِ تاباں، مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللّٰہ علیہ !

یہ کوئی گمنام شخص نہ تھا کہ آج اس کا تعارف کرانے کی ضرورت ہو ۔ اس کا مقام ایسا ہے کہ آپ اگر جنوبی کوریا یا کینیا یا ڈنمارک کی کسی بھی جگہ چلے جائیں تو کچھ لوگ ایسے ضرور ملیں گے جو آپ کو پاکستانی دیکھ کر اوّلین سوال یہ کریں گے کہ مولانا مودودی کی کوئی بات کرو ۔ اور ٹوکیو سے کیلیفورنیا تک زمین کے ایک خطِ طول بلد کے دائیں یا بائیں یا خطِ عرضِ بلد کے اوپر یا نیچے کوئی اہم آبادی ایسی نہ ملے گی جہاں مولانا مودودی کا لٹریچر کسی نہ کسی زبان میں موجود نہ ہو ۔

وسیع لٹریچر ، تفسیر، جماعتی تنظیم ، نوجوانوں کی تحریک ، بین الاقوامی دعوت اور شہرت و کردار کے پیچھے جھانک کر جب میں نے غور سے دیکھکر سارے احوال کا تجزیہ کیا تو میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مولانا مودودی نے درحقیقت بالکل ایک چھوٹا سا کام کیا ہے ۔ مگر ایسا چھوٹا سا کام جس کے لیے ہمیشہ کسی مردِ عظیم کی ضرورت ہوتی ہے ۔

وہ چھوٹا سا کام کیا تھا جو مولانا مودودیؒ نے انجام دیا ۔

کتنا چھوٹا سا کام ہے کہ آپ بجلی کے ایک بٹن کو انگلی سے ذرا سی جنبش دیتے ہیں تو سارا کمرہ یا صحن یا راستہ روشن ہوجاتا ہے ۔ کچھ ایسا ہی کام تھا جو مولانا مودودیؒ نے کیا ۔

بجلی گھر موجود تھا، وائرنگ تھی، لائنوں کی فٹنگ تھی، مگر بٹن "آن" نہیں ہوا کرتا تھا۔ بس لوگ چراغ جلا کر کام چلاتے۔ سوچ بورڈ کی حفاظت کے لیے اس پر باکس لگا دیا گیا تھا، تالا ڈالا ہوا تھا اور چابی کسی کے پاس تھی نہیں، وہ گم ہو چکی تھی، پھر اس تک پہنچنے میں بہت سی رکاوٹیں حائل تھیں۔ کیچڑ، کانٹے، گندگی اور کچھ تختے اور کھونٹے راستے میں نصب تھے۔ جب کوئی ادھر کا رخ بھی کرتا تو کیا رند کیا شیخ سب اٹھ کھڑے ہوتے اور شور مچا دیتے۔ "ایں، ایں، دیکھیے صاحب، کچھ خدا کا خوف کیجیے، ادھر نہ جائیے، ادھر بجلی کے سوچ ہیں، انھیں چھیڑا تو کرنٹ سارے کمرے میں پھیل جائے گا۔ بجلی سب کچھ بھسم کر دے گی، یہ ہو جائے گا اور وہ ہو جائے گا۔

مولانا مودودی نے ان تمام محافظوں اور مخالفوں کے شور، ان کی گالیوں، انکے فتووں، ان کے پروپیگنڈوں اور ان کی دھمکیوں کی پروا کیے بغیر کیچڑ اور کانٹوں میں قدم رکھ دیے۔ کفِ پا نے اپنا سینہ کانٹوں کے لیے کھول دیا اور ہاتھ زخمی کر کے رکاوٹوں کو ہٹایا، اور سوچ بکس تک جا پہنچے۔ آواز آئی "صاحب تالا لگا ہے، چابی نہیں ہے" مگر مولانا مودودی نے نئی اصطلاحات کی چابیوں کا ایک گچھّا نکالا اور تالا کھول دیا۔ سوچ پر ہاتھ رکھا اور ہر طرف روشنی ہی روشنی پھیل گئی۔

آئیے، ذرا استعارے کی گرہ کھول کر سادہ طریق سے سمجھیں۔ مولانا مودودی کی بنیادی دعوت مسلمانوں کے لیے بس یہ تھی کہ تضاد ختم کر دو۔ اسلام پر ایمان کا دعویٰ ہے تو اس پر چلو، نہیں چلنا ہے تو پھر نہ خود مغالطے میں رہو، نہ دوسروں کو مغالطے میں ڈالو۔ قول و فعل کا تضاد ہو یا عقیدے اور کردار کا تضاد، یا انفرادی مسلمانی اور اجتماعیّت بلا اسلام کا تضاد، مسجد کی زندگی اور مسجد سے باہر کی زندگی کا تضاد، صحت مند زندگی کے لیے اس مہلک بیماری سے نجات ضروری ہے اور تضادات کو ختم کیے بغیر نہ دنیوی قوّت و ترقی کا حصول ممکن ہے نہ دینی فلاح و سعادت کا!

مولانا مودودی کے کام کا خلاصہ یہ ہے کہ انھوں نے جامد مذہبیّت کی تخ کو پہلے پگھلایا اور پھر اسے سیلِ رواں میں بدل دیا۔ دوسرے لفظوں میں انفرادی مذہب داری

کو انقلابی تحریک کی شکل دے دی۔

انھوں نے جب پہلے پہل واعظانہ تبلیغ کی جگہ سعی و جہد کے الفاظ استعمال کیے دین کو نظامِ حیات، اقامتِ دین کی سعی کو تحریک، ملّتِ اسلامیہ کو انقلابی پارٹی اور سچّی مسلم حکومت کو اسلامی اسٹیٹ قرار دیا تو ان اصطلاحات کی وجہ سے ذہنی زلزلوں کی کئی لہریں تا دیر اُٹھتی رہیں۔

لوگ بھنّائے، سٹپٹائے مگر جامد یخ کے مقابلے میں سیلِ روان کی قوّت کا مشاہدہ کرنے والی بے شمار مخلوق میں سے بہت سے لوگ یہ ماننے پر مجبور تھے کہ پہلی حالت درست نہیں، دوسری حالت ہی برحق ہے۔ خاص طور پر نوجوان عناصر جو حالتِ یخ سے بھاگ کر دنیا کے مختلف نظریات کی حرکی قوّت کی طرف کھنچتے تھے انھوں نے جب اسلامی تصوّرِ حیات کو انقلابی حرکت کے ایک اُمڈتے ہوئے دریا کی صورت میں دیکھا تو وہ اغیار کی طرف بھاگنے کے بجائے اسلام کے انقلابی تصوّرات کی لہروں میں کود کر خود بھی تغیّر کی لہر بن گئے۔ انھوں نے پہلی دفعہ اسلام کے جلال و جمال کو دیکھا جس کے سامنے تضادات نے گرد و غبار کی کئی دیواریں کھڑی کر رکھی تھیں۔ آخر یہ ہوا کہ آج ہر وزیر اسلامی نظام اور ہر واعظ اسلامی تحریکِ انقلاب کی اصطلاحیں استعمال کرتا ہے مگر بہت سے لوگ اب بھی اس بات پر ناراض ہیں کہ کیوں مولانا مودودی نے زمانے کی ضروریات کے مطابق ایک تازہ تعبیرِ دین پیش کی ہے۔ حالانکہ دین کی یہ تعبیر اتنی پرانی تھی کہ لوگ اس سے دور ہوتے ہوتے اسے پہچاننے کے قابل نہ رہے تھے۔

مولانا مودودی تنہا نہ تھے، بلکہ ایک ہی وقت میں دنیائے اسلام میں جا بجا اس طرز کی اسلامی تحریکات اٹھنے لگیں جیسی مولانا مودودی نے برپا کی تھی مصر میں شیخ حسن البنّا اور ترکیہ میں احمد سعید نورسی میدان میں نمودار ہوئے۔ اُدھر ایران میں قم کے علماء نے جبری بادشاہت کے زیرِ تسلّط ایک خفیہ تحریک شروع کی جو آج امام خمینی کی سربراہی میں سطح پر آگئی ہے۔ چار اطراف سے اُٹھنے والی اِن یک رنگ تحریکوں کے اثرات عرب اور افریقی ممالک میں، ملائیشیا اور انڈونیشیا میں، بھارت

لنکا، نیپال اور بنگلہ دیش میں، نیز یورپ، برطانیہ، امریکہ اور جاپان میں اسلامی قوتوں کو متحرک کرنے کا سبب بن گئے۔ جگہ جگہ حسبِ ضرورت فکری اور سیاسی قیادتیں بھی نمودار ہوگئیں اور کیفیّت یہ ہوگئی کہ ع

ہے ایک ہی نغمہ کہیں اونچا، کہیں مدھم

اسلام کے اس وسیع تحریکی عمل کا اصل مظاہرہ پندرھویں صدی میں ہوگا۔ احیائے اسلام کا جذبہ اب بلوغ کو پہنچ چکا ہے۔ کہیں کہیں انقلاب کے تجرباتی اقدام ہو رہے ہیں

وقت گزرتا ہے۔ تارے ٹمٹماتے اور کھو جاتے ہیں۔ موسموں کا اُدل بدل ہوتا ہے۔ شعاعیں آفاق میں دوڑتی پھیلتی ہیں کشش اور حرارت وجود کے سمندر میں مدّو جزر پیدا کرتی ہیں۔ بہار و خزاں کی دوڑ لگی ہے، مگر جمادی، نباتاتی بلکہ حیوانی دنیا میں معمول کے جتنے واقعات اور معمول کے خلاف جتنے حوادث رونما ہوتے ہیں، انکی ترتیبِ زمانی CHRONOLOGY تو ہوتی ہے مگر وہ بھی صرف ذی شعور موجودات کے لیے، ان واقعات و حوادث سے "تاریخ نہیں بنتی۔ موجودات سے کسی کی کوئی سوانح عمری مرتب نہیں ہوتی اور نہ سیرت۔

تاریخ اور سوانح و سیرت کا ظہور انسان کی کشمکشِ خیر و شر سے ہوتا ہے۔ انسان جب سچ اور جھوٹ، اچھّائی اور بُرائی، انصاف اور ظلم، عفت اور بے حیائی، دیانت اور خیانت، پاسِ عہد اور وعدہ شکنی، کے محاذوں سے دوسرے انسانوں کے خلاف لڑتا ہے تو اس کا جنگ نامۂ حیات تاریخ کہلاتا ہے، اور انسان دونوں محاذوں کے جنگ باز ہوتے ہیں۔ کچھ انسانیّت کی خیر و فلاح کے لیے لڑتے ہیں کچھ انسانیت کے لیے شر و فساد کا ہنگامہ اٹھاتے ہیں۔

رزمِ خیر و شر کا آغاز تو روزِ اوّل ہی ہوگیا۔ جب آدمؑ کے خلاف ابلیس چیلنج لے کر میدان میں آگیا۔ پھر ان دونوں قوتوں کو قدرت نے ارضی اکھاڑے میں بھیج دیا۔ جب سے اب تک کچھ انسان خلافتِ آدمؑ کے شعور سے اور کچھ بغاوتِ ابلیس کے اندھے جذبے سے باہم آویزہ رہے ہیں۔

اس معرکۂ خیر و شر کو گرم رکھنے کا سہرا اصلاً انبیاء علیہم السلام کے سر ہے۔ جو آدمؑ کے احساسِ عبدیّت، اس کی ذمّہ داریٔ خلافت، اس کے جذبۂ توبہ و انابت اور اس کی علمبرداریٔ ہدایت کے وارث ہوئے۔ خدا نے شرائع میں تبدیلیاں کیں مگر دین اوّل روز سے ایک ہی تھا اور تمام انبیاء و رسل علیہم السلام اسی دین کا بار بار احیاء کرتے رہے اور بار بار ابلیسیّت کو انھوں نے دعوتِ مبارزت دی۔ پھر انبیاء کے پیروکار صلحاء بھی مرتبۂ ثانی پر وہی کارِ تجدیدِ دین اور سعیٔ اقامتِ حق کرتے رہے۔ یہاں تک کہ دینِ حق کی عالمگیر صبح نمودار ہوئی اور اُفق تا اُفق اجالا پھیل گیا۔ اس صبح کی پہلی چمک غارِ حرا سے ظاہر ہوئی۔ اس کا سُورج کوہِ صفا سے اُبھرا اس کا وقتِ اشراق بدر کے میدان میں سامنے آیا مگر اس کی ساعتِ چاشت فتح مکہ کے وقت چھا گئی۔ ابلیسیّت پر اس سے زیادہ بُرا وقت اتنے بڑے پیمانے پر نہ آیا تھا۔ جاہلیّت کے کشتوں کے پُشتے لگتے چلے گئے۔ یہ تھا حضور خاتم النبیّین صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ۔ پھر خلافتِ راشدہ کے دور میں خدا پرستانہ تہذیب کے علمبردار چاروں طرف بڑھتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ خلافتِ راشدہ کے بعد حقیقی نظام میں دراڑیں پڑ جانے کے باوجود پچھلے دورِ زرّیں کی دی ہوئی قوّت کے بل پر مسلم قوّت نے اتنا فروغ حاصل کیا کہ اس وقت کے متمدّن و معروف انسانی دنیا کے بڑے حصّے میں دینِ ہدایت چھا گیا اور طاغوتی قوّتوں کے لیے سر چھپانا مشکل ہو گیا۔

بلاشبہ شیطانی قوّتوں نے ملّتِ اسلامیہّ میں طرح طرح کے بگاڑ پیدا کیے۔ ان کو داخلی تصادموں کا شکار بنایا۔ ان کی وحدت کو ختم کرنے کے لیے ان کے اندر سے فرقے اٹھا کھڑے کیے۔ خود ان کے آدمیوں کے ذریعے ہی عجمی ثقافت، یونانی فلسفے، ہندی تصوّف، اور آخر میں مغربی تہذیب کو نفوذ و غلبہ دلوایا، مگر یہ بات ہمارے لیے قابلِ فخر ہے کہ خرابی کے دور میں مسلمانوں کے اندر سے بارہا ایسے افراد، ایسی جماعتیں اور ایسے ادارے نمودار ہوئے جنھوں نے وقت کے حملہ آور باطل کا قلع قمع کر کے دینِ حق کا چہرہ از سرِ نو نکھار دیا۔ ہمارے پاس ایسی زرّیں مثالیں ہیں کہ انتہائی شدید جبریّت کی تلواروں کے سائے میں تنِ تنہا ایک شخصیّت اٹھتی ہے اور پوری بے باکی سے تنقید کر کے حق کے تقاضوں کو واضح کرتی ہے۔ ایسی ہستیوں نے

کوڑے کھائے اور قیدیں بھگتیں، مگر بالآخر اُن کے آوازۂ صداقت کے سامنے اقتدار کو جھکنا پڑا۔ ہماری تاریخ کے شدید سے شدید دور میں ایسے لوگ موجود رہے کہ جن کی ایک نگاہ نے تیرگیوں کے قلعوں کو منہدم کر دکھایا اور گم شدہ روشنی از سرِ نو اُبھر آئی۔

یہ ہستیاں اگر نہ ہوتیں تو ہم نہ نظامِ حق کو جان سکتے اور نہ اپنے آپ کو۔ ہم نے ایسے ایسے طوفانوں میں ڈبکیاں کھائی ہیں جن کے گرداوں سے بچ نکلنا ممکن نہ ہوتا اگر یہ ہستیاں دست گیری نہ کرتیں اور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے سفینۂ سلامتی پر ہمیں نہ پہنچا دیتیں۔

ایسی ہستیوں کو اصطلاحًا ہمارے یہاں مجدّد کہا جاتا ہے۔ ہر وہ شخص جس نے وقت کی فتنہ انگیز طاقتوں کی پھیلائی ہوئی دھواں دھاری میں مسلمان کو باہر نکال کر قرآن کی روشنی میں لا کھڑا کرنے کی سعی اخلاص اور للّٰہیّت سے کی، اس کے لیے قربانیاں دیں، تکلیفیں اٹھائیں، وقت کے غلط رو اقتدار سے ٹکرّ لی، زمانے کے باطل فکری دھارے کے خلاف پیرتے ہوئے جان ہلکان کر دی، وہ کسی نہ کسی درجے کا مجدّد تھا۔ کام کی وسعت اور معیار کے لحاظ سے وہ مجدّد کامل ہو سکتا ہے، ورنہ صحیح نہج سے تھوڑا بہت تعلیمی، تبلیغی اور اصلاحی کام کرنے والے بھی جزوی مجدّد ضرور تھے۔

منصب دو ہی ہیں۔ کچھ لوگ وہ ہیں جو متجدّد بنے، یعنی وہ جنھوں نے مسلمانوں کو اصل دین سے ہٹا کر وقت سے سمجھوتا کر کے کوئی آسان راستہ نکالنے کی کوشش کی۔ دوسرا گروہ ان ہستیوں کا ہے جنھوں نے زمانے اور اس کے نظریات و مروّجات کو برطرف رکھ کر اصل دین کو صحیح شکل میں واضح کر کے مسلمانوں کو اس کے مطابق چلنے کی تلقین کی۔ ہماری تاریخ کا سارا بگاڑ متجدّدین کے ہاتھوں ہوا اور خیر و فلاح کی راہ جب بھی نکلی، مجدّدین کے ہاتھوں نکلی۔

تجدید احیائے دین صرف ہم مسلمانوں ہی کی تاریخ کا عمل ہے اور ہمارا تصوّرِ ترقی بھی یہ ہے کہ ہم اپنے ہی دین کے بے آمیز اصولوں اور اپنی تہذیب کی درخشاں اقدار کو نئے حالات میں مسخ کرنے کے بجائے اجتہاد سے ان کا انطباق کریں۔

پس مثبت طور پر ہماری تاریخ مجدّدین کی بنائی ہوئی تاریخ ہے۔ تو پھر کیا میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی، مجدّد تھے؟

ـــــــ جی نہیں! میں یہ نہیں کہوں گا، کیوں کہ اڑتالیس چالیس سال کے زمانے میں میں نے "تجدید واحیائے دین" کے مؤلف کی طرف سے ایسا دعویٰ نہیں سُنا، بلکہ اسے یہ کہتے سُنا کہ میں ایسے دعوے سے پاک صاف خدا کے سامنے حاضر ہو جاؤں گا۔ مجھے سیّد مغفور سے جو محبّت ہے وہ اس خطِ احتیاط سے تجاوز کی اجازت نہیں دیتی جسے سیّد نے خود کھینچا اور آخر دم تک اسے عبور نہیں کیا۔

مودودیؒ مجدّد تھا یا نہیں تھا، اس کا فیصلہ تو خدا کے ہاں ہونا ہے۔ خدا کی باتیں خدا ہی جانے، مگر اتنا ہم کہہ سکتے ہیں کہ جو وسیع اور اتھاہ کام سیّد مودودیؒ نے کیا۔ وہ ویسا ہی تھا جیسا مجدّد کیا کرتے ہیں۔

وہ کام کیا تھا؟

یہ سیّد جیّد جس بڑے مقصد کے لیے اُٹھا وہ یہ تھا کہ دنیا بھر میں سیکولر مزاج کے مادّہ پرست مغربی سامراج کی سیاست و فراست اور اس کے علوم و فنون اور اس کے تمدّن و ثقافت کے بڑھتے ہوئے طوفان کو روک دے، اور اس مقصد کے لیے اس نے قوم اور بالخصوص اس کے نوجوان طبقے کو پُکارا اور اسلامی دعوت کا علم بلند کیا۔ پھر ایمان و شعور کے لحاظ سے جو جو لوگ تیار ہوتے گئے ان کا ایک جوابی طوفان مغربی طوفان کا رُخ بدلنے کے لیے اُٹھا دیا۔ مولانا مودودیؒ کا مرکزی اور بنیادی کارنامہ یہی ہے کہ اُنھوں نے مسلمانوں کو جاگتے ہوئے ایمان اور شعورِ توانا سے آراستہ اور منظّم کر کے، اور ہر طرح کی سطحی اور ہنگامہ خیز جذباتیّت سے پرہیز کرا کے مغربیّت کے محاذ سے سیکولرازم، وطنی و نسلی نیشنلزم، ملحدانہ ریشنلزم، لادین جمہوریّت، کمیونزم اور اسلامی سوشلزم اور اخلاق باختہ ثقافت جیسے یلغار کرتے ہوئے فتنوں کے خلاف نبرد آزما کر دیا۔

کسی بادشاہ کے ظلم پر صدائے احتجاج بلند کرنا، معاشرے کی کسی ایک متعیّن خرابی کو دور کرنے کے لیے اصلاحی کام کرنا، کسی گروہ کے اُٹھائے ہوئے فکری فتنے کا توڑ کرنا مشکل کام ضرور ہے۔ مگر یہاں تو ایک عالم گیر تہذیبِ الحاد اور اس کے اُٹھائے ہوئے سیاسی معاشی اور معاشرتی فساد سے مقابلہ درپیش ہے۔

ہمارے یہاں مغربیّت اور مادّی تہذیب کے خلاف کچھ متفرّق انسدادی اور حفاظتی تدابیر اختیار کی جاتی رہی ہیں۔ مگر مولانا مودودیؒ نے پہلی بار بتایا کہ دورِ حاضر کے اس تباہ کن طوفان کو روکنے کے لیے ایک جوابی طوفان کی ضرورت ہے، اور پھر انھوں نے وہی جوابی طوفان اُٹھانے پر ساری توجّہ صرف کر دی کہ اسلام اور مادّہ پرستی کی اس جنگ میں جو لوگ حصّہ ادا کر سکتے ہوں وہ آگے آئیں۔ لوگ آہستہ آہستہ آئے، مگر دیکھتے دیکھتے وہ وقت آیا کہ جوابی طوفان اُمڈ رہا ہے اور الحادی اور مادّہ پرستانہ طوفانی لہروں کو پیچھے دھکیل رہا ہے۔

دراصل مغرب کی مادّہ پرستانہ تہذیب کے خلاف اکبرؔ الٰہ آبادی نے کچھ نکتے ایسے اٹھا دیے تھے کہ بعد میں وہ تاریکیوں میں چنگاریوں کی طرح چمکنے لگے۔ پھر اقبالؔ نمودار ہوا جس نے نہ صرف جزبہ جز مغربی فکر، الحادی تمدّن و سیاست اور مادّہ پرستانہ معاشرت نیز نوآبادیاتی تاخت و تاراج اور صیّادیٔ اقوام اور غلام سازی کی فرنگی مہم، اور اس سلسلے میں وحشیانہ جبر لٹریچر، تعلیم اور مفادات کے ذریعے جو چرکے ملّت کے اعتقاد اور اخلاق کو لگائے گئے، اور مسلمانوں کی خودی کو تباہ کرنے، ان کے حجازی نظریۂ جمہوریت کو مضحکہ بنا دینے، ان کی تاریخ کو مسخ کرنے، ان کی حقیقی لیڈر شپ کو بیخ و بُن سے اُکھاڑ دینے اور ان کے تصوّرِ قومیّت کو بے وزن بنانے کے لیے جو عمل مسلسل جاری رکھّا گیا، ان سب حملوں کا تفصیلی جائزہ لیا۔ پھر اقبالؒ نے متقابلاً اسلام کے اساسی عقائد، روایات و اقدار، تصوّرِ قومیّت، جذبۂ جہاد، نظریۂ قانون و اجتہاد اور تاریخِ اسلام کی ماہیّت اور تہذیبِ اسلام کی مخصوص نوعیّت پر مثبت خیالات، گہرے فلسفیانہ تجزیے اور دردناک شاعرانہ نغموں میں پیش کیے۔ وہ دراصل مغرب کی ملحدانہ و مادّہ پرستانہ تہذیب کے خلاف جہانِ فکر و فن میں جنگ چھیڑ چکا تھا۔ پھر اس نے ضربِ کلیم لکھتے ہوئے ساری قوم کو تہذیبِ حاضر کے خلاف جنگ کے لیے پکارا۔

اقبال کا یہ نہایت وسیع مجدّدانہ کام مسلمانوں کو ایک جذبۂ عام تو دے گیا اور ایک محدود سے طبقۂ فکر و نظر نے شعوری سطح پر اس کے پیغام کو سمجھ کر ذہن نشیں تو کر لیا مگر ان سچّے اقبالیوں کے سامنے کام کا کوئی پروگرام نہ تھا کہ کب کیا اقدام کدھر سے کریں۔ تحریکِ پاکستان چلی تو بہت سے لوگ اس کے کام میں اس جذبے سے شریک ہو گئے کہ پاکستان تہذیبِ فرنگ کے خلاف

اسلام کا مضبوط قلعہ بننے والا ہے، لیکن پاکستان بن جانے کے بعد بھی مغربیت کے خلاف معرکہ ابھی مسلمانوں کے سر اُدھار تھا۔ اقبالؒ نے اپنے کام کو جہاں تک پہنچا دیا تھا وہاں بجا طور پر اس نے محسوس کیا کہ اس کام کو آگے بڑھ کر مطلوبہ نتیجے تک پہنچانے کے لیے "دگر دانائے راز" کی ضرورت ہے۔ اپنے بعد آنے والے اور کام کو آگے بڑھانے والے کے لیے اقبالؒ کا جذبۂ بیتاب اس کی نگارشوں میں جھلملا رہا ہے۔

مولانا مودودیؒ اقبالؒ کے "دگر دانائے راز" ہیں یا نہیں (کیوں کہ بہت سے حضرات کے نزدیک "دگر دانائے راز" جبھی قابلِ قبول ہو سکتا ہے جب کہ وہ ایک خاص گروہ کے اندر سے اُبھرے، ورنہ کسی کو دگر دانائے راز نہیں مانتا) مگر اُنھوں نے مغرب کی ملحدانہ و مادّہ پرستانہ تہذیب اور اس کے پھیلے ہوئے پُر فریب نعروں اور سلوگنوں اور اصول و تصوّرات کے خلاف ہمہ گیر جنگ نہ صرف پاکستان میں چھیڑ دی بلکہ خدا کی مدد سے بقیّہ عالمِ اسلام میں بھی یہ رَو اُٹھتی چلی گئی۔

مولانا مودودیؒ نے نہ صرف اقبالؒ کے آغاز کردہ فکری معرکے کو مکمل کیا، بلکہ تحریکِ پاکستان جب برِّ صغیر کی تقسیم ہو جانے کے بعد پاکستان کا اصل نصبُ العین نہ پا سکی بلکہ تحریکِ پاکستان کے لیے جمع ہونے والی قوّت دوسرے مشاغل میں کھو کر اپنے ہی وجود کو بکھیرنے میں مصروف ہو گئی تو اس نئے خلا کو مولانا مودودیؒ کی منظّم کردہ طاقت نے پُر کیا۔ اور قافلۂ ملّت، اسلامی نظام کی اقامت کے لیے از سرِ نو گامزن ہو گیا۔ گویا مولانا مودودیؒ نے قائدِ اعظم کی اس مہم کو آگے چلایا جس کا دوسرا اہم تر اور مشکل تر مرحلہ طے کرنے کا موقع مسلم لیگ کے لیے نہ رہا۔

ہم پچھلے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہیں:۔

سیّد مودودیؒ کے کارنامے کے دو پہلو تھے: ایک دورِ جدید کی مرعوب کُن جاہلیّت جس کا چہرہ روشن اور اندرون چنگیز سے تاریک تر تھا، یعنی مغربی فکر و تمدّن اور اس کے ہر شعبۂ زندگی پر محقّقانہ تنقید۔ دوسرا: اسلامی نظام کی اقامت کے لیے ایک منظّم جہادی تحریک کا اجرا۔ کام کا ایک حصّہ اگر "لا" تھا تو دوسرا "اِلا"، "کفر بالطاغوت" اور

"ایمان باللہ"، دونوں منفی اور مثبت تقاضے ساتھ ساتھ تھے۔

یہ جائزہ لینا تو مبصّرین اور مؤرّخین کا کام ہے کہ وہ اندازہ کریں کہ ان دونوں ـــــ ذمّہ داریوں کو ادا کرنے میں مولانا مودودیؒ کا پارٹ کس درجے کا تھا!

اب ذرا ان تفصیلی اجزائے معنیٰ پر ایک سرسری نظر، جن پر سیّد انقلاب انگیز کی دعوت مشتمل تھی۔

(۱) انگریزی سامراج، ہندوؤں کی چانکیائی سیاست اور دنیا بھر میں مختلف نظریات کی پیدا کردہ فتنہ و فساد میں گھرے ہوئے مسلمانوں کو اوّلین نکتہ سمجھایا کہ خدا کی اس منظّم، متوازن سلطنت میں تمام موجودات خدا کے قوانین و حدود کی پابندی کر کے، دوسرے لفظوں میں اس کے سامنے مسلم بن کر کروڑوں برس سے بصد امن و سلامتی برقرار ہیں۔ انسانی دنیا میں تمام خلل اور ظلم اور بگاڑ اس لیے ہے کہ انسان خدا کی عطا کردہ ذرا سی آزادی کو مسلم بن کر نہیں باغی بن کر استعمال کرتا ہے۔ اگر ہم زندگی کے لیے امن و سلامتی چاہتے ہوں تو اس کائنات میں مسلم بن کر رہنا چاہیے۔

(۲) اسلام، مسیحیّت، ہندومت، بُدھ مت اور یہودیّت کی مانند ایک مذہب نہیں ہے۔ وہ دین (مکمّل نظامِ زندگی) ہے، لہٰذا اس پر وہ تعریف اور تحدیدات اور تنگ تصوّرات منطبق نہیں ہوتے جو مروّجہ مذہب سے متعلق ہیں۔ یہ ہماری کوتاہی ہے کہ خود ہم نے بھی عملاً خدا کے وسیع و ہمہ گیر دین کو محدود انفرادی مذہب بنا دیا ہے۔ اب ازسرِ نو اسلام کو ایک دین کی حیثیت سے لے کر ہمیں اٹھنا ہے۔

(۳) دین کا کام کرنے کے لیے وہ غیر شعوری نسبت کافی نہیں جو مسلمانوں کے گھروں میں پیدا ہونے کی وجہ سے موجود رہتی ہے، بلکہ دین کا مطالعہ کر کے اس کے تقاضوں اور ذمّہ داریوں کو سمجھنا اور ایک شعوری ایمان کے ساتھ اقامتِ دین کے لیے آگے بڑھنا لازم ہے۔ اقامتِ دین کا کام کرنے کے لیے ایمانِ خوابیدہ یا نسلی مسلمانی کافی نہیں، یہاں جاگتے ہوئے شعوری ایمان اور اصلی مسلمانی کی ضرورت ہے۔

(۴) ہم مسلمان محض ایک جامد قوم بن کر رہ گئے ہیں حالاں کہ ہمارے لیے قرآن نے

بین الاقوامی انقلابی پارٹی کا مقام متعین کیا تھا جس کا کام یہ تھا کہ وہ انسانوں پر سے انسانوں کی خدائی ختم کرنے اور خدا کی حاکمیّت و شریعت کو اخلاقی، سیاسی اور تمدّنی زندگی کے اس حصّے میں نافذ کرنے کی کوشش کرے جس میں انسانوں کو ایمان وکفر اور طاعت وبغاوت یا خیر وشر یا صلاح وفساد میں انتخاب کرنے کی امتحانی آزادی دی گئی ہے۔ مسلمان بہ حیثیّتِ قوم اور مسلمان بہ حیثیّتِ جماعت (اور اسلام بہ حیثیّتِ تحریک) کا فرق واضح کرتے ہوئے مولانا مودودیؒ نے یہ راز بھی کھولے کہ مسلمانوں کے مدارس اور اسلامی نظامِ تعلیم، مسلمان معاشروں کے مروجات اور اسلامی اصول و اقدار باہم دگر الگ الگ ہیں۔ ان کے التباس کی وجہ سے بہت سی حقیقتیں مسخ ہوجاتی ہیں۔

(۵) عبادت صرف ان اذکار اور اعمال کا نام ہی نہیں جنھیں محدود سے لمحات میں مسجد کی حدود کے اندر انجام دیا جاتا ہے، بلکہ مسجد کی چار دیواری سے نکل کر ہم گھروں، دکانوں، کھیتوں بازاروں، کارخانوں، دفتروں، تھانوں، کچہریوں، پارلیمنٹوں اور مجالس وزارت میں جو کچھ کام کرتے ہیں وہ اگر خدا کے احکام و حدود کے مطابق ہوں تو سب عبادت کی تعریف میں داخل ہیں، اور اگر ان میں ہم خدا سے بے تعلّق ہوکر مصروف ہوتے ہیں تو مسجد سے باہر کی ساری زندگی بغاوت کی زندگی ہوجاتی ہے۔ مسجد میں اطاعت اور اس کے باہر بغاوت، یہ ایک ایسا سنگین تضاد ہے جس نے ہماری قوموں کو تباہ کردیا ہے۔ یہ بڑا بھاری شرک ہے کہ مسجد کا خدا اور مسجد سے باہر کا خدا اور دین الگ الگ ہوں، پس دین اور سیاست یا دین اور معاش یا دین اور دنیا کی تفریق باطل ہے جو بالعموم رائج ہے۔

(۶) ایک شخص کا یہ کہنا کہ وہ مسلمان ہے اور پھر اس کے بعد زندگی کے تمام مسائل و معاملات اور دلچسپیوں میں خدا کی کتاب اور رسولؐ کی سُنت سے کوئی تمسک ہی نہ کرنا، یا کتاب وسنّت کے احکام کو مسترد کرنا، یا ان میں ہیر پھیر کرکے من مانے طریق سے مطلب کو خبط کرنا یا ان کا مذاق اڑانا یا ان کو ناقابلِ عمل قرار دینا یا ان کے بالمقابل دوسرے فلسفوں اور ضابطوں کو ترجیح دینا یہ اس دورِ زوال کا بہت بڑا تناقض ہے۔ اس تناقض کو رفع کرنے کے لیے یا تو ٹھیک ٹھیک طریق سے انقیاد کا رویّہ اختیار کیا جائے۔ یا اگر ایسا رویّہ اختیار کرنے میں تعقل اور مفاد مانع

ہوں تو پھر دھوکے کی منافقانہ رسمی نسبت کو چھوڑ دینا چاہیے۔ قرآنی الفاظ کے مطابق "لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ" کا یہ ایسا سخت تازیانہ تھا کہ بہت سے سلیم الطبع حضرات کی اس سے آنکھیں کھُل گئیں اور ان کی زندگیاں اسلام کے سانچے میں ڈھل گئیں۔ اسلام کے بھاگے ہوئے سپاہی چھاؤنی میں واپس آنے لگے۔

(۷) تحریکِ خلافت سے لیکر تحریکِ پاکستان تک اسلامی حکومت کا ہر طرف چرچا تھا، مگر یہ بات مبہم تھی کہ اسلامی حکومت کیا ہوتی ہے؟ اسے واضح کرنے کے لیے سیّدِ مغفور نے اس کے بنیادی تصوّر کو چند نکات میں مضبوط دلائل کے ساتھ "اسلام کا نظریۂ سیاسی" میں پیش کیا جس میں اپنی بات سمجھانے کے لیے "الٰہی جمہوری حکومت" THEO-DEMOCRACY اور جمہوری خلافت POPULAR-VICEGERENCY جیسی انقلاب انگیز اصطلاحات وضع کیں۔ اس بحث کے پیدا کردہ سوالات کے جواب میں پھر اپنا مشہور رسالہ "اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے" لکھا اور بتایا کہ اس منزل تک پہنچنے کا راستہ اگرچہ دعوت و پیغام سے شروع ہوتا ہے اور تعلیم و تزکیہ کی منزلوں سے گزرتا ہے، مگر ہے وہ سر تا سر انقلابی راستہ ایسا نہیں کہ جونہی کسی جگہ مسلمانوں کی حکومت قائم ہوجائے وہ آپ سے آپ AUTOMATICALLY اسلامی حکومت بن جائے گی۔ اسے اسلامی بنانے کے لیے جدّوجہد کرتے ہوئے بڑی قربانیاں دینا ہوں گی؛ چنانچہ تاحال مکمل شکل میں کوئی اسلامی حکومت موجود نہیں ہے۔

(۸) دیوبند اور علی گڑھ اور ندوہ کے وجود سے اسلامی تعلیم کے متعلّق جو بحثیں چھڑی ہوئی تھیں اور سرکاری کالجوں اور سکولوں میں دینیّات کا پیریڈ شامل ہونے کا جو قصّہ چل رہا تھا اس کے اندر ایک بڑا سوال مخفی تھا۔ وہ یہ کہ اسلامی تعلیم کیا ہوتی ہے اور اسے کیسے جاری کیا جا سکتا ہے۔ سیّد مودودیؒ نے مسئلے کا تاریخی جائزہ لے کر بتلایا کہ مختلف حالات کی وقتی ضرورتوں کے تحت ایک اور دوسری اور تیسری صورت اختیار کی گئی، مگر اسلامی نظامِ تعلیم اس طرح نہیں جاری ہو سکتا کہ عام لادینی نصابات میں کسی ایک پیریڈ اور نصاب کو شامل کر دیا جائے، نہ کام اس طرح چل سکتا ہے کہ دینی تعلیم ایسے طریق سے

دی جائے کہ جدید زمانے کے علوم اور مسائل سے اسے کوئی تعلّق نہ ہو۔ بعد میں اس موضوع پر کئی چیزیں مولانا نے کہیں اور متعدّد بار اہم مجالس میں خطابات کیے۔

(۹) تحریکِ پاکستان کے وقت ایک اہم بحث آزادی کی چھڑی، جس کا تصوّر کانگریسی اور ہندو حلقوں کا یہ تھا کہ پہلے سب کو مل جُل کر انگریز سے آزادی حاصل کر لینی چاہیے۔ بعد میں آپس میں طے کرنا چاہیے کہ آزادی میں سے سب کو حصّہ کس طرح مل سکتا ہے۔ مولانا مودودیؒ نے اس تصوّرِ آزادی کی مخالفت اس نظریے کی بنا پر کی کہ مسلمان کا تصوّرِ آزادی یہ ہے ہی نہیں کہ آدمی ایک غیر اسلامی نظامِ غلامی سے نکل کر پھر کسی دوسرے غیر اسلامی نظام میں جکڑا جائے یا از سرِ نو ایک داخلی جنگِ آزادی لڑے۔ مسلمان کا تصوّرِ آزادی تو ہے ہی یہی کہ ایک غیر قوم کے غیر اسلامی تسلّط سے نکل کر وہ صحیح اسلامی نظام قائم کرکے اس میں زندگی گزار سکے۔ پھر انھوں نے مثال دیکر کہا کہ نقشۂ احوال یہ ہے کہ باہر کا جیلر اندر کے نمبر داروں کو جیلر بنانے کے لیے ان ساری زنجیروں کے سرے اس کے ہاتھ میں دے رہا ہے تاکہ مسلمان جیسے پہلے جیل میں جکڑے ہوئے تھے ویسے ہی بعد میں جکڑے رہیں۔ یہ صورت آزادی ہمیں منظور نہیں ہے۔ ہمیں پہلے سے بتایا جائے کہ ہمیں اپنے دین اور اپنی تہذیب اور اس کے احیاء کے لیے کیا قوّت دی جائے گی۔ اگر ایسا نہیں تو وطنی متّحدہ قومیّت میں لادین اسٹیٹ کے قیام کی اسکیم میں ہم حصّہ دار نہیں بن سکتے ہیں تم اگر متّحدہ ہندوستان میں دینی اختیارات اور تہذیبی آزادی کی ضمانت نہیں دے سکتے تو پھر زمین کا کوئی ٹکڑا کتنے ہی حصّوں میں بٹے، اس پر تڑپے وہ جس کے لیے وہ معبود یا دیوتا ہو، پورے ہندوستان کے بالمقابلِ زمین کا ایک مربّع میل ٹکڑا ہزار درجہ زیادہ قیمتی ہے جس میں خدا کا دین جاری و ساری ہو اور ہم اس میں اپنی زندگیوں کو صحیح شکل دے سکیں۔

مولانا کا یہ تصوّرِ آزادی تاریخ کا ایک سنگِ میل ہے اور اسلام کے مقصد و منشا کو سمجھنے کا وسیلہ!

(۱۰) اسی سلسلے میں ایک بحث متحدہ وطنی قومیّت کی چلی، جو نزاعی رنگ اختیار کر گئی۔ مولانا مودودیؒ نے اسلامی قومیّت کو موضوع بنا کر تفصیل سے بہت مدلّل کتاب لکھی، "مسئلۂ قومیت"

اس میں قرآن وحدیث کی بحثوں کے علاوہ مغربی مثالوں اور حوالوں سے دکھایا کہ قومیں کہیں بھی وطن سے نہیں بنتی ہیں۔ کیوں کہ کہیں تو ایک ہی یورپین ملک یا ریاست میں تین تین قومیں موجود ہیں اور کہیں زبردستی سے باندھی گئی ایک قوم میں داخلی کشمکش برپا ہے، اور کہیں ایک ہی قوم کے ٹکڑے کاٹ کر الگ کیے جا رہے ہیں۔ اور آج تو ہمارے سامنے متحدہ وطنی قومیں ٹوٹ رہی ہیں اور مذاہب کی بنا پر مختلف فریق الگ الگ ہو رہے ہیں یا اس وجہ سے شدید تصادم برپا ہیں۔ الغرض مولانا نے ثابت کر دیا کہ مسلمان ایک الگ قوم ہیں۔ جو الگ دین، الگ معاشرت، الگ ضابطہ حلال وحرام، الگ تاریخ، الگ آداب وشعائر رکھتے ہیں۔ یہ کتاب تحریکِ پاکستان کے دوران مسلم لیگ کے لیے بہترین کام یاب حربہ ثابت ہوئی۔ اس کے ساتھ مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصّہ اوّل ودوم نے بھی کام کیا۔

(۱۱) مگر مولانا مودودیؒ نے اس سے اگلی ایک بات جب وضاحت سے کہی تو انتہائی ممنون مسلم لیگ ناراض ہو گئی۔ انھوں نے مسلمانوں سے کہا کہ جدید اصطلاحات کی رُو سے تم یقیناً ایک وطن پرست قوم نہیں ہو اور نہ کسی متحدہ وطنی قومیت کا کمزور سا جزو بن کے رہ سکتے ہو، لیکن دوسری طرف یہ بھی فراموش نہ کرو کہ تم خود بھی حقیقت میں ایک نسلی قوم نہیں ہو بلکہ اسلام کو برپا کرنے والی ایک پارٹی ہو اور تم محض ایک قوم کا پارٹ ادا کرنے کی بجائے ایک انقلابی پارٹی کا سا پارٹ ادا کرو۔ ظاہر ہے کہ تنقید کیے بغیر اتنی بڑی حقیقت بیان نہیں کی جا سکتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سیّد مودودیؒ کا نام مخالفینِ پاکستان میں لکھ دیا گیا، حالاں کہ انھوں نے خود برِّصغیر کی تقسیم کا ایک خاکہ پیش کیا تھا جب کہ تقسیم کے مبحث پر مختلف آرا ر سامنے آرہی تھیں۔

مولانا مودودی مغفور نے مسلمانوں کے سامنے یہ حقیقت فاش طریقے سے اس لیے وقت پر بیان کر دی کہ پاکستان بننے کے بعد وہ ذمّہ داریاں ان کے سر آنے والی تھیں جو محض ایک قوم بن کر انجام نہیں دی جا سکتیں۔ بلکہ انقلابی پارٹی کے سے طرزِ فکر اور کردار کے ساتھ ہی ادا کی جا سکتی تھیں۔

مشکل یہ ہوئی کہ مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصّہ سوم اس وقت مسلمان

سیاسی قوّت کی بارگاہ میں ناپسندیدہ ٹھہری۔

آزادی سے پہلے شروع دور ہی میں، ایک اور اہم مسئلہ مودودیؒ نے یہ اٹھایا کہ قوموں کی عظمت کی گاڑیوں کو دنیا میں علمی و تحقیقی کاموں کے انجن کھینچتے ہیں۔ پس ہمیں بھی اگر دورِ حاضر میں سر اُٹھانا ہے تو مغربی علوم کے مقابلے میں اسلامی علوم کو ازِ سرِ نو تحقیقی بنیادوں پر کھڑا کرنا ہوگا اور فلسفہ ہو یا سائنس، سیاست ہو یا معیشت یا دیگر مختلف علوم ان کی تشکیلِ نو اسلامی اصولوں کے مطابق کرنا ہوگی۔ اس دعوت کی آواز اُٹھاتے ہوئے مولانا نے ایک طرف ڈیکارٹ، ڈارون، مارکس، لینن وغیرہ کے خیالات پر سخت تنقید کی۔ دوسری طرف اپنے مثبت فکر کو مضبوط استدلال کے ساتھ ثابت کیا۔

(۱۳) پاکستان بن گیا اور تحریک چلانے والی جماعت بطور ایک فاتح جماعت کے عہدہ وجاہ اور مفاد و منفعت کا مالِ غنیمت سمیٹنے میں مشغول ہونے لگی، تو کمیونسٹوں اور سیکولرسٹوں اور "مسلمانی بلا اسلام" سے آراستہ جاگیرداروں اور لیڈروں، اور کرائے کے بے مقصد مصنفوں صحافیوں اور خطیبوں کے لیے ہر طرف راستے کھُل گئے کہ وہ اسلام کے شور میں ایک لادین جمہوری نظام قوم پر مسلط کر دیں۔

مگر ابھی وہ کچھ زیادہ کام نہ کر پائے تھے کہ فروری ۱۹۴۸ء میں (تشکیلِ پاکستان کو ابھی چھ مہینے ہی گزرے تھے) مولانا مودودیؒ کی طرف سے چار نکاتی مطالبہ اس غرض کے لیے اٹھا کہ ریاست کی دستوری تشکیل سے پہلے اس کی ضروری بنیادیں معیّن کر دی جائیں۔ کچھ دیر کے لیے سر چکرا گئے۔ سرکار نے دفتروں سے لے کر مسجدوں تک مورچے کھول دیے مولانا مودودیؒ کو ملتان جیل میں پہنچا دیا گیا، مگر پرنالہ وہیں رہا۔ چار و ناچار ۱۲ مارچ ۱۹۴۸ء کو "قراردادِ مقاصد" پاس کی گئی جو نہ صرف اسلامی ریاست کے قیام کا دوٹوک اعادہ تھی بلکہ اس میں وہ تمام خطوط بھی مذکور تھے جن پر اسلامی ریاست اور معاشرے کی تشکیل کی جائے گی۔ قراردادِ مقاصد کی ایک اور اہمیّت مؤرّخ اور مبصّر نوٹ کریں گے کہ اسلامی نظریۂ سیاست کے تحت جو اصطلاحات اور جو امتیازی زبان مولانا مودودیؒ استعمال کر رہے تھے، اس کا واضح انعکاس اس میں موجود تھا۔

(۱۴) اسلامی نظام کے قیام کے لیے جو تحریک اس شکل میں شروع ہوئی، وہ "قرار دادِ مقاصد" کے بعد اور زیادہ قوّت کے ساتھ آگے بڑھی اور تمام مذہبی حلقے اور عوام آہستہ آہستہ اس کے زیرِ اثر آتے گئے، یہاں تک کہ ۱۹۵۱ء میں ملّت کے تمام مدارسِ فکر کے نمائندہ علماء نے اپنے لاینحل اختلافات کو درکنار رکھ کر اسلامی دستور (یا ریاست) کے ۲۲۔ اصول متفقہ طور پر طے کر دیے اور یہ سلسلۂ مساعی ۱۹۵۶ء کے دستور پر منتج ہوا جسے ساری قوم نے خوشیاں منا کر قبول کیا۔

(۱۵) تحریکِ دستورِ اسلامی کے ساتھ ساتھ سوالات اُبھرتے رہے کہ مختلف شعبوں کا کام اسلامی اصولوں کے تحت کس طرح چلے گا؟ سیّدؒ نے ان سوالوں کے جواب میں اسلامی تعلیم اسلامی قانون، اسلامی معاشرت، اسلامی ریاست، اسلامی پردہ، حقوق الزّوجین مسئلہ سود، ضبطِ ولادت وغیرہ تمام موضوعات پر ایسا ٹھوس کام کر دیا کہ آئندہ ریسرچ کرنیوالے حضرات بڑی سے بڑی عمارت اُٹھا سکتے ہیں۔

(۱۶) قراردادِ مقاصد پاس ہو جانے کے بعد سیّد مودودیؒ نے یہ محسوس کیا کہ اب دستوری ارتقا یا کاروبارِ حکومت کی مزید اصلاح کا کام دور رہ کر نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا انھوں نے اپنے حلقۂ اثر کے سامنے "انقلابِ قیادت" کا ایک اور میدانِ عمل کھول دیا۔ یعنی اب اسلامی ریاست کے خواہاں لوگوں کو انتخابات کے میدان میں جانا چاہیے اور مروّجہ خلافِ اسلام خرابیوں سے بچ کر قیادت کی صفوں میں تبدیلی لانے کے تجربے کا آغاز کر دینا چاہیے۔ انقلابِ قیادت کی دعوت جہاں کچھ لوگوں کو پچھلے کام کی نوعیّت کی وجہ سے بے ربط سی محسوس ہوئی۔ وہاں ذی شعور علماء، جدید طبقوں اور عوام کے لیے امید کا ایک نیا راستہ کھُل گیا کہ سیاسی قوّت میں سے ابتداءً اگر تھوڑا سا حصّہ بھی ملتا ہے تو دو چار انتخابات کے بعد نتائج زیادہ بہتر ہو سکتے ہیں۔

(۱۷) اشتراکیّت کے خدا ناشناس اور مذہب دشمن فلسفے اور نظام پر تقسیم سے پہلے بھی مولانا نے کام شروع کر دیا تھا۔ پھر جب جدید معاشی تصوّرات پر بحث اُٹھائی تو اس لادین خوں ریز نظام کا بھی مزید تجزیہ کیا۔ یہاں کہ ۱۹۷۰ء میں انگلستان سے علاج

کرا کے واپس پہنچتے ہی، یہاں کے حالات کو دیکھ کر اشتراکیّت کے خلاف پہلی ہی تقریر میں اعلانِ جنگ کیا اور پھر اُنہی کی رہنمائی میں دارُالفکر نے عوامی لٹریچر کا ایک سیلاب برپا کر دیا۔ اس دباؤ کے زیرِ اثر اشتراکیّت کے لیے ایک اور مصنوعی چہرہ تیّار ہوا اور وہ تھا "اسلامی سوشلزم" کا پُر تضاد سلوگن۔ اس سلوگن کی بھی دھجّیاں بکھر گئیں۔ نتیجہ یہ کہ بھٹّو صاحب اپنی فسطائیت کے باوجود ۱۹۷۳ء کے دستور پر آ رُکے۔

(۱۸) سیّد مودودیؒ کی ایک گراں بہا خدمت اتحادِ اسلامی کی تحریک ہے ——— اور اس کے لیے برّصغیر ہی زیادہ سازگار خطّہ ہے۔ ملک میں داخلی طور پر تو مولانائے مغفور شروع سے (۱۹۴۹ء سے) اس امر کے لیے کوشاں تھے کہ مسلمان فرقہ وارانہ تقسیموں کی سطح سے بلند ہو کر محض مسلم بن کر کام کریں۔

ملک سے باہر ——— خصوصاً عرب ممالک میں ——— نہ صرف بہ نفسِ نفیس سیّد مودودیؒ نے حاکموں اور علمار کو وحدتِ اسلام کا پیغام دیا بلکہ اس مقصد کے لیے انھیں لٹریچر بھی پھیلایا۔ دوسرے ملکوں کی دینی شخصیّتوں اور تنظیموں سے تعلقات پیدا کیے۔ ان سے خط و کتابت کی، ہم عصر رجال میں سے علمار کی خاصی بڑی تعداد اتحادِ اسلامی کے لیے گامزن ہو گئی۔

(۱۹) دعوتِ اسلامی کو فروغ دینے، اس کے انقلابی شعور کو عام کرنے اور اتحادِ اسلامی کو محکم بنانے کے لیے مولانا مودودیؒ نے دنیا کی اسلامی تحریکوں میں زیادہ سے زیادہ قرب اور اتحاد پیدا کیا۔ اُستاذ حسن البنّا شہید اور حسن الہضیبی مرحوم اور سیّد قطب شہید کے تیار کردہ اخوان ہوں، یا ترکیّہ کے سعید نورسی مرحوم کے تربیّت دیئے ہوئے کارکن، اور اسی طرح وہ مولانا مودودیؒ کے افکار کے پروردہ ذہن ہوں، وہ جہاں کہیں ہوں ایک دوسرے سے جا ملتے ہیں اور مل کر کام کرتے ہیں اور ایک دوسرے سے استفادہ کرتے ہیں۔ ادھر حال ہی میں ایران کے اسلامی انقلاب کے نقیبوں سے بھی مولانا کا رابطہ قائم ہوا تھا اور ان کی مساعی کو بھی دین ہی کے کام کی حیثیّت سے دیکھتے تھے۔ پچھلے چند سال سے مولانا مودودیؒ عالمی تحریکِ اسلامی ہی کے ایک مفکّر و قائد تھے۔

یہ کوئی نظم نہیں اور نہ یہ کوئی اس کا عہدہ ہے، مگر یہ ایک قدرتی تعلق ہے جو از خود پیدا ہو جاتا ہے۔

خصوصًا مولانا مودودیؒ اور سیّد قطب کا لٹریچر تو چاروں طرف نور کے ایک جال کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ سلیم الطبع لوگ اس سے کنارہ کش نہیں رہ سکتے، وہ ضرور شکار ہو جاتے ہیں۔ــــــــ اور جو اللہ کے لیے شکار ہو جاتے ہیں اس سے بہتر مرتبہ کس کا ہے۔

آخر میں مَیں اس کام کا ماحصل بیان کرنا چاہتا ہوں۔ چار بڑی قوّتیں سیّد مودودیؒ مغفور نے اپنے پیچھے چھوڑی ہیں۔ ایک وسیع انقلاب انگیز لٹریچر اور اس کے تراجم۔ دوسری نظامِ اسلامی کے ظہور کے لیے کسی مزدوری کے بغیر سعی و جہد کرنے والے مردانِ کار اور ذاتی مفاد کو قربان کرنے والے سپاہی۔ تیسری مختلف دائروں میں تحریکِ اسلامی کے اثرات۔ خواتین میں، کسانوں میں، مزدوروں میں، طلبہ میں، استادوں میں اور کہاں نہیں۔ چوتھی ــــــــ معاشرے میں نوجوان قوّت کی بیشتر صفوں کا غلبۂ اسلام کے لیے صف بستہ ہو جانا۔ یہ کتنی بڑی میراث ہے۔ اور یہ چہارگانہ میراث ایک ایسی زندہ قوّت ہے کہ مولانا مودودیؒ کے پیغام، فکرِ رسا اور ان کی تحریک کو آگے بڑھاتی رہے گی۔

سیّد مودودیؒ کے اس کام کے نتیجے میں خدا نے اپنے بندے کو ایک عجیب اعزاز سے نوازا۔ اور وہ یہ کہ اس کا وجود اور اس کا نام اسلامی انقلاب کی ایک آیت و علامت SYMBOL بن گیا۔ کتنی قوّت ہے اس نام میں۔ کتنے دل ہیں جسے اس نام نے جوڑ کر خدا اور رسولؐ کے حضورؐ میں لا کھڑا کیا ہے۔ کسے آج سے پہلے یہ اعزاز ملا کہ اس کی بات دنیا کی ساری آبادیوں میں پھیل گئی۔ اس کا لٹریچر ہر گوشۂ زمین میں پہنچ گیا۔ اس سے محبّت کرنے والے چار دانگِ عالم میں موجود ہیں۔

آج یہ شخصیّت اس بات کی کسوٹی ہے کہ کون اسلام کے غلبے کی خاطر مولانا مودودیؒ سے محبّت کرتا ہے اور کون ہے جو اسلام کا راستہ روکنے کے لیے مولانا مودودیؒ سے مخالفت رکھتا ہے۔

یہ تھا سیّد مودودیؒ جسے کتنوں نے جاننے کا موقع ملنے پر بھی نہ جانا۔ اور ایسے بھی بہت سے تھے جنھوں نے جانا ضرور مگر مانا نہیں۔

ایک عرصہ سے سیّد مودودیؒ کے وجود کو کالعدم سمجھنے کی کوشش کا تجربہ بھی کیا گیا ہے شتر مرغوں کا خیال تھا کہ ریت میں منہ چھپانے سے شاید بلا ٹل جائے۔ وہ بھی تھے جنھوں نے مولانا مودودیؒ کو "مسٹر" لکھ کر یہ اُمید باندھی کہ اب اس شخص کے علمِ دین کو کون تسلیم کرے گا جب کہ ہم نے اس کے عالم ہونے پر قلمِ نسخ کھینچ دیا ہے۔

صد حیف کہ اتنا رجُلِ عظیم اس قوم میں اُبھرا، اس کے درمیان رہا، اس کے اجتماعی معاملات کو درست راستے پر ڈلوانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتا رہا، لیکن عوام کو چھوڑیے اس کے بعض خواص کا یہ حال تھا کہ وہ گویا ایک سمندر کا پانی چھلنیوں سے چھان کر برسوں تنکے تلاش کرتے رہے اور ہر تنکا ہاتھ میں لے کر ہجوم کی طرف دوڑے کہ آؤ لوگو، تمھیں مولانا مودودیؒ کی ایک غلطی بتائیں۔ افسوس کہ ان لوگوں کے ذہن میں یہ بات نہ آئی کہ چند تنکے ایک طرف رکھ کر دیکھو کہ دوسری جانب سمندر کتنا عظیم ہے، اِس کی موجوں کی اُفت وخیز کو دیکھو، اس پر تیرنے والے سفینوں کو دیکھو، اس میں رقص کرتی مچھلیوں پر نظر ڈالو، اور اگر توفیق ہو تو اس کی تہ میں ٹِکے ہوئے ایک ایک صدف میں پرورش پانے والے موتیوں کو دیکھو؟ کیا تمھاری آنکھیں صرف تنکوں کو دیکھ سکتی ہیں یا تمھیں صرف تنکوں سے دلچسپی ہے؟

غرضیکہ قسم قسم کے لوگ یہاں ایسے موجود تھے جن کی ساری مساعی کا ماحصل یہ تھا کہ کسی طرح خواص وعوام براہِ راست سیّد مودودیؒ کو جاننے نہ پائیں۔

مگر کب تک! ـــــ سال، دو سال، دس سال! آخر کب تک!!

ایک وقت تھا کہ وہ شخص راز تھا، مگر اب تو کسی خوشبو کے راز کی طرح یہ راز چار دانگِ عالم میں فاش ہو چکا۔ آپ بھی قوّتِ شامّہ کو کام کرنے دیجیے۔ آنکھیں کھولیے، کانوں سے وقت کی آواز کو سنیے اور یہ بھی دیکھیے کہ آپ کی تحریروں اور آپ کی گفتگوؤں میں مولانا مودودیؒ کی فکر کے علامتی الفاظ شامل ہیں اور آپ اگر اس کی مخالفت بھی

کرتے ہیں تب بھی آپ کے ذہن میں اس کے نقوش ثبت ہیں۔

پھر ؟؟؟

آخر میں یہ بھی خوب سمجھ لیجیے کہ یہ دور مولانا مودودیؒ کا دور ہے۔ آپ نہ اس سے نکل کے باہر جا سکتے ہیں، نہ اس کے اثرات سے بالکل خالی رہ سکتے ہیں۔

آپ مولانا مودودیؒ کو نہ پہچانیں گے تو اپنے آپ کو بھی کبھی صحیح طور پر نہ پہچان سکیں گے۔ بسا اوقات کچھ خود پیدا کردہ آسیبی قوتیں آدمی کے دل و دماغ پر حاوی ہو جاتی ہیں۔ اپنی ان آسیبی قوتوں سے نجات پا لیجیے۔

دارالاسلام

سے

منصورہ تک

گزری ہوی تاریخی گھڑیاں جو کسی شخص یا جماعت کی ذہنی و عملی زندگی کی بنیادی اینٹیں بن جاتی ہیں، اتنی بڑی قدر و قیمت کی حامل ہوتی ہیں کہ نہ صرف متعلّقہ اشخاص اور جماعتیں ہی ساری عمر انکو سینوں سے لگائے رکھتی ہیں، بلکہ بسا اوقات مستقبل کے مؤرخ بھی ان کی کھوج کرید میں بڑی کاوشیں کرتے ہیں۔ سرزمینِ واقعات و حوادث کے ذرّے ذرّے کو اُلٹ کر فکر و تحقیق کی انگلیاں ایسے تاریخی لمحات کی جستجو کرتی ہیں جو انفرادی اور اجتماعی کاموں کے ایک ایک پودے کے لیے نرم و نازک جڑیں بن کر اسے تناور بناتے ہیں، دنیا جاننا چاہتی ہے کہ کسی فرد یا کسی جماعت کی زندگی کی جڑوں کی رسائی کہاں تک ہے اور وہ کہاں کہاں سے غذا اور سرمایۂ قوّت فراہم کر کے پتّے پتّے، کلی کلی اور کونپل کونپل کو زندہ رکھتی ہیں۔

خصوصًا اصولی و مقصدی جماعتوں کا دورِ آغاز، یا زمانۂ تربیت بڑا اہم دور ہوتا ہے۔ اسی زمانے میں ان کی زندگی میں وہ شگوفے پھوٹتے ہیں جو آگے چل کر ان کی مستقل روایات بن جاتے ہیں۔ اسی دور میں وہ ایسے تجربوں سے گزرتی ہیں کہ جن کے زیرِ اثر ان کو ایک مستقل مزاج ہاتھ آتا ہے۔ اس دور میں ذہنیت بنتی ہے۔ اسی میں کردار کا حدودِ اربعہ متعیّن ہوتا ہے اور اسی میں اصول و مقاصد، رگ و پے میں رس بس جاتے ہیں۔ اسی دَور کی یادگاروں کے قیمتی خزانوں کو کوئی ہیئت اجتماعی مرتے دم تک اپنے سینے سے الگ نہیں کرتی۔ یہی وہ بنیادی سرمایہ ہوتا ہے جس کے بل پر تحریکیں اپنا تمام کام چلاتی ہیں۔

ہم لوگوں کے لیے ممکن نہیں ہے کہ دارالاسلام پٹھان کوٹ کے مختصر سے دورِ اخذ و اکتساب کو زندگی کے کسی بھی مرحلے میں بھلا سکیں۔ وہاں کا ایک ایک دن ہمارے ذہنوں میں جگمگا رہا ہے۔ وہاں کی ایک ایک رات اپنے چاند تاروں کے ساتھ نگاہوں میں رچی بسی ہوئی ہے۔ وہاں کے گھڑیال کی بجائی ہوئی ایک ایک نوبت کی آواز کانوں میں گونج رہی ہے۔ وہاں کی تعمیراتِ سنگ و خشت عالمِ تصوّر میں اُسی طرح سر اُبھارے کھڑی

ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابھی ابھی چل پڑیں گی اور لپک کر اپنے پُرانے مکینوں کے گلے لگ جائیں گی۔ وہاں کی صاف ستھری مسجد کے مینار جیسے ٹھٹک ٹھٹک کے دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے زیرِ سایہ کھڑے ہو کر اذانیں پکارنے والے، درس کے حلقے میں بیٹھنے والے اور رب العالمین کے حضور سجدہ ریز ہونے والے لوگ کہاں گئے۔ اس مسجد کا کشادہ صحن جیسے دامن پھیلائے ہوئے آسمان والے خدا سے بھیک مانگ رہا ہو کہ میری کھوئی ہوئی ذکر و تسبیح کی آوازوں کی وہی گونج ایک بار پھر مجھے لوٹا دے۔ وہاں کے درختوں میں سے ایک ایک جیسے عہدِ رفتہ کی یادیں کھڑا کھڑا بُت بن گیا ہو، وہاں کا سبز پوش ماحول ذہن میں اتنی گہری تصویر چھوڑے ہوئے ہے کہ جیسے اگر ہم چاہیں تو ایک ایک بوٹی اور گھاس کی ایک ایک پتّی کو گن سکتے ہیں۔ وہاں کی فضا میں ساٹھ ستّر فٹ چوڑی نہر جس میں دریائے راوی کا پورا پانی ڈال دیا گیا ہے، اس کے قریبی "فال"، کا نغمۂ پُر شور ابھی تک کانوں میں گونج رہا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اس بستی کا ایک منظر اصل کہانی سنانے سے قبل الفاظ میں محفوظ کر دیا جائے۔

سُنیے، صبح کی اذان ہو رہی ہے، زندگی کروٹ لے کر اٹھنے لگی۔ یہ بستی ایسی بستی ہے کہ جس کے تمام کے تمام بالغ افراد ایک بلاوے پر مسجد کی طرف سمٹ رہے ہیں۔ نماز بڑے سکون کی نماز ہے۔ معتدل بھی ہے۔ نہ زیادہ بھاری، نہ زیادہ ہلکی۔ تحریکِ اسلامی کا داعئ اوّل خود امام ہے، قرارت ایسی کہ ایک ایک آیت ٹھہر ٹھہر کر پڑھی جا رہی ہے، قرآن کے ہر ہر لفظ کے دامن سے ذہن معانی کے موتی چُن رہے ہیں، رُوحیں اونگھنے کے بجائے تحریک اور تبدیلی کا پیغام سُن رہی ہیں اور عملی زندگی کے مسائل کو سامنے رکھے سوچ میں ڈوب جاتی ہیں!

یہ وہ مقام ہے کہ فکر تمام وقتی جھمیلوں سے بلند، تمام سیاسی جتھابندیوں سے بالا، تمام قیادتوں اور فلسفوں سے برتر ہو کر پوری کی پوری انسانی زندگی کو دیکھنے لگتی ہے کہ اس کی صلاح و فلاح کی راہ کدھر جاتی ہے اور اس کے فساد و تباہی کا راستہ کدھر مڑتا ہے۔ نماز ختم ہوئی، مختصر سی دعا مانگی گئی، اب درسِ قرآن شروع ہو جاتا ہے۔ یہی وہ اصل درسِ حیات ہے جس نے ہمیں وہ کچھ بنایا جو کچھ ہم ہیں۔ ایک ایک آیت سامنے آتی ہے۔

اس پر سوالات ہوتے ہیں اور ہر سطح اور ہر نوعیّت کے سوالات ہوتے ہیں۔ صاحبِ درس ہر نوعیت اور ہر سطح کے سوالوں کا جواب دیتا ہے اور ہر جواب حقیقتوں کے نئے دروازے کھول دیتا ہے۔ اس کا انداز ایسا ہے جیسے وہ ایک ایک لفظ بول کر ایک نئے عالمِ افکار کی تعمیر کے لیے اینٹیں چُن رہا ہے۔ ایک گھنٹہ کی روزانہ کی اس محدود مصروفیّت کے ذریعے آئندہ کئی صدیوں کی تاریخ بنائی جارہی ہے۔ لیجیے درس ختم ہوا۔ لوگ کبھی سنجیدگی سے سوچتے، کبھی ہنستے مسکراتے، کبھی درس میں چھڑنے والے مسائل پر بحث وتمحیص کرتے بغلوں میں مصحف لیے منتشر ہوتے ہیں۔ اب کوئی نہر کے کنارے سیر کو چلا گیا، کوئی سرنا کی بستی میں دودھ وغیرہ لینے روانہ ہوگیا، کوئی گھر کے کام کاج میں لگ گیا، تھوڑی دیر میں سب ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہوئے اور اپنے اپنے شعبوں کے کاموں میں مصروف ہوگئے۔ ملک غلام علی صاحب نے مکتبے کا کام شروع کردیا، سیّد عبدالعزیز شرقی صاحب نے ترجمان القرآن کا دفتر کھول لیا، سیّد نقی علی اور حامد صاحب بستی کے بچّوں کو پڑھانے میں لگ گئے۔ راقم الحروف اپنی بیٹھک میں واقع اپنے دفتر میں ترجمان القرآن کے لیے کچھ کاوش کرنے یا استفسارات کے جواب لکھنے بیٹھ گیا۔ وہ دیکھیے، حافظ عطاءالرحمٰن (مرحوم) ہمارے سامنے کوارٹر سے نکلے انھوں نے کھڑے ہوکر ایک انگڑائی لی۔ اور زور سے "آ۔۔۔ا۔۔۔ اللہ!" کہا۔ پھر مجھے پکارا۔ "کیوں بھئی نعیم صاحب! کیا حال چال ہے؟" ان کا واحد سہارا عبدالرحیم' ایک بوسیدہ سی کرسی نکال کے رکھتا ہے۔ پھر حافظ صاحب کا حقّہ باہر لاتا ہے، "اَبجی" کہتا ہے اور حافظ صاحب بیٹھ جاتے ہیں۔ اب عبدالرحیم گائے کو چرانے باہر لیے جارہا ہے۔

اُدھر دور کوارٹروں کی لائن کے آخری سرے پر نگاہ ڈالیے۔ وہ ایک ترک مہاجر، مجاہدانہ تن وتوش کے ساتھ باہر نکلا ہے۔ یہ ہے اعظم ہاشمی۔ ایک اُونچے خاندان کا پالا پوسا ذہین ادیب نوجوان جسے اشتراکی تسلّط نے وطن چھوڑنے پر مجبور کردیا۔ گود میں اپنی صاحبزادی باطورہ کو لیے ہوئے ہیں۔ اپنی مرغیوں کو دانہ روٹی ڈال رہے ہیں۔ یہ ابھی کمرے میں جا بیٹھیں گے اور اپنے مہاجر تُرک بھائیوں میں اسلامی دعوت کو زندہ رکھنے کے لیے ترجمہ اور خط وکتابت کا کام شروع کردیں گے۔

یہ مسٹر فقیریا ہے۔ پیچھے پیچھے مسز فقیریا بھی آرہی ہیں۔ اس کے پیچھے انہی کا ایک بچہّ ہے۔ اس کے پیچھے ایک اور بچیّ ہے اور اس کے پیچھے کیا ہے دکھائی نہیں دیتا۔ یہ بستی کے حلال خور ہیں اور پکےّ عیسائی ہیں۔ میری کھڑکی کے سامنے سے گزرا تو جھاڑو رکھ دی اور کبھی "ملک صاحب! سلام" اور کبھی "میاں جی! سلام" کہہ کر باتوں میں لگ گیا۔

حافظ عطاءالرحمٰن صاحب کے گھر سے دودھ بلونے کی آواز آرہی ہے۔

یہ جارہے ہیں حافظ عظمت اللہ پانی پتی، ننھّے ساجد کو اُنگلی پکڑائے ہوئے۔ یہ اپنے محلّ کتابت میں جائیں گے اور ایک اونچے اسٹول پر مسطر رکھ کر کھڑے کتابت کریں گے۔ یہ اس فن کا ایک نیا میتھڈ ایجاد کر رہے ہیں۔

پھر مغرب کی طرف اور بڑھیں تو مولانا صدرالدّین اصلاحی کا "صدر خانہ" ہے، یعنی اقامتی کمرہ جو دفتر اور اطاقِ مطالعہ بھی ہے۔ برادرم صدرالدّین اصلاحی صاحب کو اللہ نے جسم ہلکا پھلکا دیا مگر عالمانہ دماغ زیادہ وزنی (اَلْوَزْنُ یَوْمَئِذِنِ الْحَقُّ) اور رُوح بھاری بھر کم، مگر مزاج لطیف جس کی ایک خوبی نظافت پسندی تھی اور دوسری متبسّمانہ تکلّم۔ کبھی جملوں میں ہلکا مزاح۔ عمر کے لحاظ سے بالکل عنفوانِ شباب اور علم و کردار کے لحاظ سے پیری نہ سہی، بزرگانہ نوجوانی تھی۔ کبھی شدید سنجیدگی اختیار کرتے تو معلوم ہوتا کہ ایکٹنگ کر رہے ہیں۔ یہ الگ بات کہ حقیقت میں وہ بے حد سنجیدہ ذہن کے رفیق تھے۔ جبھی تو حقیقتِ نفاق جیسی کتاب سے اُنھوں نے تصنیفی دَور کا آغاز کیا۔ مجھے ان سے قلبی ربط تھا جو یک جائی کے مختصر سے دَور میں بڑھتا گیا۔ اور جب تقسیم کے وقت بہت سی مفارقتیں ہوئیں تو میں نے یوں سمجھا کہ ایک بھائی تھا جو جُدا ہوگیا۔ پھر ایسی دیواریں حائل ہوئیں کہ خط تک لکھنے کا سلسلہ نہ چل سکا۔ بس یوں معلوم ہوتا رہا کہ ٹوٹے ہوئے خاندانوں کے کچھ افراد کو جبریّت کے اُس طرف ہیں، کچھ اس طرف دونوں بس ایک دوسرے کے لیے دعا کر سکتے ہیں۔

اب ذرا دیکھیے تو اپنے مکان کی بیٹھک کے سامنے آم کے درخت کے نیچے ایک شخص سفید لباس ——— لٹھےّ کا پاجامہ، ململ کا کُرتہ، وائل کی سفید ٹوپی پہنے بیٹھا

نظر آئے گا۔ لباس کی سفیدی اتنی غیر معمولی قسم کی ہے کہ سرسبز ماحول میں وہ شخص ایک نقشِ نمایاں بن کر دکھائی دے رہا ہے۔ یہی ہے جسے لوگ "مولانا مودودی" کہتے ہیں۔ کبھی لکھنے میں مصروف۔ کبھی ملاقاتیوں سے محوِ گفتگو اور کبھی اصحابِ دفاتر سے معاملاتی امور میں محوِ کلام!

مسجد، کنواں، آم کا درخت۔ وہ کینوس بناتے تھے جس میں مولانا کی شخصیت نمایاں ہوتی تھی۔

لیجیے دوسرے ایک ترک طوختہ اخوند نمودار ہوئے۔ یہ بستی کی متفرّق خدمات سرانجام دیتے ہیں۔ اس وقت گھوڑے کو ایال سے پکڑے چرنے چُگنے کو چھوڑنے لے جا رہے ہیں۔ فارغ ہو کر مولانا کے پاس پہنچے۔ گھوڑے کی داستان وہ روزانہ ایک مرتبہ سُناتے ہیں۔ وہ کہہ رہے ہیں۔ "یہ گولا صاحب، بہت خراب آدم ہے۔ لات کو ہیچ نِشتہ کھایا۔ ماگریں اس کی خصلت خوب سمجھتا ہے۔" مولانا فرماتے ہیں "اچھّا طوختہ اخوند، بچوّں کو ڈاکٹر کے ہاں لے جانا ہے۔ تانگہ جوڑ دو!" اب طوختہ چلے۔ گھوڑے کو پکڑ لائے اور تانگہ میں گھوڑا جوڑنے کی کُشتی شروع ہوئی۔ اس موقع پر بستی بھر کے لیے مختصر سا سرکس ہو جاتا ہے۔ پہلا مرحلہ طے ہوا، دوسرا مرحلہ شروع ہو جاتا ہے، یعنی اب گھوڑے کو چلنا ہے کبھی طوختہ اخوند کوچوان بنتے ہیں اور کبھی مولانا ڈرائیونگ سنبھالتے ہیں، ہنٹر ہوا میں گھومتا ہے۔ طوختہ پہیے کو پکڑ پکڑ کے گھُماتے ہیں، مگر "یہ گولا صاحب!" نہیں مانتا۔ وہ آخری ہتھیاروں پر اُتر آتا ہے۔ ہوا میں اُچھلتا ہے۔ مولانا کے بچّے چیختے ہیں۔ "ہائے ابّا! ہائے ابّا!!" ـــــ مگر مولانا استقلال کا مجسمّہ بنے مُسکراتے ہوئے تانگے کے عالمِ متزلزل کی باگ ڈور تھامے بیٹھے ہیں۔ آدمی کی سیرت ہر جگہ اپنے کچھ خاص پہلو دکھاجاتی ہے۔ بستی کے لوگ چاروں طرف سے طوختہ اخوند کا یہ سرکس دیکھ رہے ہیں۔ آخر تانگہ روانہ ہو جاتا ہے۔

لیجیے، لاہور امرتسر سے گاڑی آ گئی۔ سرنا اسٹیشن سے چھُوٹنے کا وِسل سنائی دے رہا ہے۔ اب گاڑی ہمارے مکانوں کے پاس سے گزر رہی ہے۔ تھوڑے

وقفہ کے بعد گاڑی سے اترنے والے مسافر ریلوے لائن پر آتے دکھائی دینے لگے۔ نگاہیں اُدھر ضرور اٹھ جاتی ہیں ــــــ شاید ہمارے کوئی مہمان بھی ہوں۔ وہ ــــــ بستی کے قریب کی پُلی سے اُترنے والے راستہ پر آکر دو اصحاب نے ریلوے لائن چھوڑ دی ہے۔ یقیناً یہ ہمارے مہمان ہیں ــــــ جماعتِ اسلامی کے مہمان!

دوپہر کو کام چھوڑ کر لوگ گھروں کو چلے گئے۔ ظہر کو مراد علی شاہ صاحب کی اذان گونجی اور عین مقرّرہ وقت پر جماعت کھڑی ہوگئی۔ چھوٹے چھوٹے بچّے بھی پیچھے صف باندھے کھڑے ہیں۔ نماز کے بعد پھر لوگ دفتری فرائض میں محو ہوں گے۔

عصر کو پھر نماز کا اجتماع ہوا۔ نماز کے بعد درسِ حدیث ہو رہا ہے۔ اسی طرح ترجمہ و تشریح۔ اسی طرح سوالات، پست سوالات، اُونچے سوالات، سطحی سوالات، مفکرانہ سوالات، دماغی سوالات، عملی سوالات، سیدھے سیدھے سوالات، ٹیڑھے ٹیڑھے سوالات۔ صاحبِ درس اس جھاڑ جھنکاڑ کے اندر سے سامعین کو تلاشِ حقیقت کے راستے بنائے دے رہا ہے۔

درس کے بعد پھر تمام لوگ بکھر گئے اور گھریلو کاموں کی طرف متوجّہ ہو گئے۔ وہ دیکھیے ملک غلام علی صاحب لکڑیاں پھاڑ رہے ہیں۔ ادھر ملاحظہ فرمایئے۔ قیّمِ جماعتِ اسلامی (کلُ ہند) رسّی اور بوری لیے آرہ مشین کے کارخانے پر لکڑیاں اور بُرادہ لینے جارہے ہیں۔ جہاں خود انھیں اپنے ہاتھوں سے بُرادے کی بوریاں بھرنی ہیں۔ اور پھر ریڑھی پر لاد کر تہائی میل دُوری پر خود ہی لانی ہیں۔ عبدالرحیم ــــــ جو ابھی ایک نوعُمر بچّہ ہے ــــــ درانتی لیے چارے کا گٹھّا لانے نکل گیا ہے۔ راقم الحروف غلّہ کا بوجھ کندھے پر لادے پن چکّی پر پسوانے لے جارہا ہے۔ باقی لوگ مولانا مودودی کے جلو میں تفریح کے لیے نہر کے کنارے چلے جارہے ہیں۔ ایک گھاٹ کے ساتھ مستقل جائے نشست ہے۔ سب لوگ مولانا کے معمول کے مطابق کنارے کے بڑے پتھّروں پر بیٹھیں گے اور یخ جیسے پانی میں ٹانگیں ڈال دیں گے اور متفرّق باتیں ہونے لگیں گی۔ نمازِ مغرب بھی اکثر وہیں پڑھی جاتی ہے۔ واپس آئے تو کھانے کا وقت ہو جائے گا شام کا کھانا

وقتاً فوقتاً اجتماعی ہوتا ہے۔ بستی کے کھلے میدان میں ایک دسترخوان بچھ جاتا ہے اور ہر شخص اپنے اپنے گھر سے اپنے اپنے ذوق کا پکا ہوا کھانا پیش کر کے بیٹھ جاتا ہے۔ اس طرح مہمانوں کی خدمت بھی ہو جاتی ہے اور باہم دگر کھانوں کا ادل بدل بھی دلچسپی کا موجب ہوتا ہے اور پھر باتیں چھڑ جاتی ہیں ـــــ عام لطیفوں سے لے کر تحریک کے اونچے مسائل تک دارالاسلام کی بستی کے معاملات سے لے کر بین الاقوامی سیاست کے مباحث تک۔ کوئی مستثنیٰ نہیں رہتی۔

یہ بستی ایسے لوگوں کی بستی ہے جو دنیا کی ساری دلچسپیاں چھوڑ کر یہاں ایک نئی برادری کی شکل میں جمع ہوئے ہیں۔ یہاں ان کا جینا مرنا ایک ہے۔ یہاں ان کے دکھ سُکھ باہم دگر وابستہ ہوگئے ہیں۔ یہاں نئی محبّتیں اور دوستیاں اور دلچسپیاں کونپلیں نکال رہی ہیں۔ یہاں کچّے اَن گھڑ خیالات ایک دوسرے سے ٹکرا ٹکرا کر اور ٹوٹ پھوٹ کر ایک مستقل شکل اختیار کر رہے ہیں۔ یہ مرکز ہے۔ اس ننھّی سی طاقت کا جسے پہاڑ جیسے مضبوطی سے جمے ہوئے نظریوں کو ایک دن چیلنج کرنا ہے۔

اس بستی میں اچھّے اور بُرے واقعات و حوادث کی بڑی بڑی لہریں اٹھتی رہی ہیں اور اپنے گہرے نقوش چھوڑ کر گم ہوگئی ہیں۔ یہاں ہم باہم دگر کئی کئی دن ایک ایک بحث میں الجھتے رہے ہیں۔ یہاں ہم بارہا ایک دوسرے سے روٹھے اور منے ہیں۔ یہاں کئی آنے والے گئے ہیں، اور ان کی جگہ نئے لوگ آئے ہیں۔ یہاں کئی بچھڑے ہوئے آملے ہیں، اور کئی مل کر بچھڑ گئے ہیں۔ کون بھلا سکتا ہے اُن شادیوں کو جو اس بستی کے ماحول میں ہوئی ہیں۔ کون فراموش کر سکتا ہے ان موتوں کو جو اس فضا میں واقع ہوئی ہیں۔ کیسے بھول سکتے ہیں بیماریوں کے وہ حملے جو اس کے مکینوں پر کبھی ہوئے ہیں۔

بھوت

"نیشنلزم" وہ تیز زہریلی شراب ہے کہ جسے پینے والے آہستہ آہستہ اپنا دماغی توازن بالکل کھو بیٹھتے ہیں۔ اس کا نشہ جب پوری طرح سوار ہو جاتا ہے تو عقل ماری جاتی ہے مذہبی تعلیمات اور روحانی قدروں کا اثر طبائع سے بالکل کافور ہو جاتا ہے اور موٹے

مو ٹے مسلمہ اخلاقی تقاضوں تک کا احترام باقی نہیں رہتا۔ نشہ جب نقطۂ عروج کو پہنچتا ہے
تو آدمی ہر لباس تہذیب سے عاری ہو کر بھوت بن جاتا ہے۔ یہی شراب تھی جس سے برّ ِعظیم
ہند کی ہندو آبادی نے اپنے مے کدے آباد کیے اور اس کے بالمقابل مسلمان بھی
بجائے اس کے کہ ایک اصولی و مقصدی سیاست کی مئے طہور لے کے اٹھتے، اُسی صہبائے
ہوش رُبا کے متوالے بنے۔ دونوں طرف کے لیڈر، دونوں طرف کے اخبار نویس،
دونوں طرف کے ادیب، دونوں طرف کے ذہین اور با اثر لوگ اپنی اپنی قوم کو ایک
دوسرے کے مقابلے کی اسپرٹ کے ساتھ مغربی نیشنلزم کے ڈوز پے دَر پے پلا رہے
تھے اور متواتر چند سال سے پلا رہے تھے۔ آخر عوام "دُھت" ہونا شروع ہوئے۔
انھوں نے ساقی نامۂ فساد پڑھ پڑھ کر ناچنا شروع کیا۔ اُنھوں نے خنجر اور برچھیاں لے کے
بچّوں کے پیٹ پھاڑ ڈالے، اور بوڑھوں کی ٹانگیں کاٹ دیں۔ اُنھوں نے ماؤں،
بہنوں کے ناموس کو لہولہان کر دیا انھوں نے مذہب کے چہرے پر زخم لگائے،
انھوں نے اخلاق کو سولی دی، انھوں نے شرافت کا جنازہ نکالا، انھوں نے انسانیّت
کو تڑپا دیا، اُنھوں نے تہذیب کے گھر کو آگ لگا دی، انھوں نے جمہوریت کی متاعِ
حیات لوُٹ لی اور امن کو دیس نکالا دے دیا۔ شہری زندگی بھوتوں کے ہتھّے چڑھ گئی۔

کلکتہّ، نواکھلی، بہار اور شمالی ہند کے فسادات اپنا خونی پرچم اُڑاتے پیش آہنگ
بن کر آزادی کی نیلم پری کے آگے آگے چلے جو سرزمینِ ہند پر قدم رکھنے والی تھی، جلد ہی
آزادی کے نزولِ اجلال کی ساعتِ سعید آ پہنچی۔

کھچاؤ

سنہ ۱۹۴۷ء نمودار ہوا تو اس کے چہرے اور سینے پر گھاؤ تھے ___ مگر خون میں
لتھڑے ہونے کے باوجود آہستہ آہستہ آزادی کا جھنڈا بلند کر رہا تھا۔ لوگ
حالات کی تیز تیز کروٹوں کو سانس روکے دیکھ رہے تھے۔ مختلف مشن، مختلف منصوبے
یکے بعد دیگرے جلد جلد سامنے آ ہی چکے تھے۔ ان میں سے اگرچہ کوئی بھی

فریقین کے لیے پوری طرح وجہ اطمینان نہیں بن سکا تھا، لیکن ان چیزوں نے امیدوں کو مضبوط کر دیا، امیدوں کو انھوں نے مضبوط کر دیا، مگر دونوں قوموں کے درمیان کھچاؤ بہت بڑھ گیا۔ ۱۹۴۷ء کے آتے آتے یہ حقیقت نمایاں ہوگئی کہ ان دونوں قوموں کا اب ایک نظام میں مل کر رہنا غیر ممکن ہے۔ تقسیمِ ہند کا امکان آہستہ آہستہ نمایاں ہو رہا تھا، لیکن ایک طرف پچھلے فسادات کے چرکے تھے جو دونوں قوموں کے لیے موجبِ کرب و اضطراب تھے اور دوسری طرف آنے والی تشویشناک صورتِ حال "تفکر" انگیز تھی جو تقسیم کے واقع ہونے پر اُمڈنے والی تھی۔ اس سے کھچاؤ بڑھ رہا تھا۔

۱۹۴۷ء کے اوائل کے "ترجمان القرآن" کا فائل دیکھیں تو فسادات اور دو قومی کھچاؤ کا مسئلہ کئی شماروں میں وقت کے اہم مسئلے کی حیثیت سے سامنے آتا ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ جماعتِ اسلامی کا پورا حلقۂ اثر اس مسئلے میں مرکز سے رہنمائی حاصل کرنے کے لیے بے چین ہے۔ یہ رہنمائی دے کر جو پالیسی ان کے سامنے رکھی گئی "ترجمان القرآن" کے ذریعے معلوم کی جا سکتی ہے۔ اپریل، مئی میں جماعت کے حلقہ وار اجتماعات ہوتے ہیں تو اُن میں بھی یہ مسئلہ پوری پوری "توجہ" کا مستحق بنا نظر آتا ہے۔

چنانچہ ۱۹۴۷ء کی دوسری سہ ماہی میں وہ کھچاؤ ہمیں اپنی آس پاس کی فضا میں بھی محسوس ہونے لگا جو اب تک اخبارات اور جماعت کی رپورٹوں کے ذریعے ہمارے سامنے آ رہا تھا۔ امرتسر میں فساد ہو جانے کی وجہ سے قدرتی طور پر اس کے ملحقہ علاقوں پر اثر پڑنا چاہیے تھا۔ اور وہ پڑا۔ مئی ۱۹۴۷ء میں جب شمالی ہند کا حلقہ واری اجتماع دارالاسلام میں منعقد ہوا، تو اس وقت ضلع گورداس پور کی فضا خراب ہو چکی تھی۔ دو رپار قتل اور بلوے ہونے کے واقعات رونما ہونے لگ گئے تھے، ضلع بھر میں دفعہ ۱۴۴ نافذ تھی۔ اس اجتماع میں ہم نے علاقے کے ہندوؤں کو بھی دعوت دی تھی اور وہ لوگ خاصی تعداد میں آکر شریک ہوئے، مگر چہروں سے تشویش برس رہی تھی!!

۳ر جون ۱۹۴۷ء کے اعلان کے بعد تو جگہ جگہ اس طرح فسادات شروع ہو گئے گویا بارُود کے ذخیرے بھک سے اُڑ رہے ہوں۔ اس زمانے میں اپنے حلقے سے متعلق،

سلطان پور (کپورتھلہ) کے ایک مردِ بزرگ مستری محمد صدیق پر حملے کی اطلاع ملی۔ یہ بہت ہی فقیرانہ مزاج کے متحمّل بزرگ تھے اور بلاامتیاز سب لوگ ان کا احترام کرتے تھے۔ مگر ہندو نیشنلزم کی تیز شراب کے بدمستوں نے ان کو بھی نشانہ بنایا۔ اطلاع ملنے پر میاں طفیل محمّد سلطان پور روانہ ہو گئے اور وہاں ہندوؤں مسلمانوں سب سے ملاقاتیں کیں۔ اور فضا کے تکدّر میں کچھ کمی پیدا کی، مگر اس واقعہ سے اندازہ ہو گیا کہ اور چیزیں تو رہیں الگ، اب انسانی اقدار کی سرزمینِ ہند پر خیر نہیں!

اپنے علاقے میں کام

اس صورتِ حالات کے تحت بستی کے ہفتہ وار اجتماع میں طے پایا کہ معمولاً آس پاس کی آبادیوں میں جو کام ہوتا تھا، اب اس کے بجائے خاص طور پر علاقے کے امن کو بچانے ہندو مسلم کھچاؤ کو کم کرنے اور مسلمانوں کو سہارا دینے کے لیے مہم جاری کر دی جائے، بلکہ نسبتاً زیادہ لوگ نکلیں اور زیادہ وقت صرف کریں؛ چنانچہ حسبِ قرارداد یہ کام شروع ہو گیا اور ہر روز اس کی رپورٹ براہِ راست امیرِ جماعت کو دی جانے لگی۔ دو دو تین تین آدمیوں کے وفود چاروں طرف نکل جاتے۔ دو ایک بستیوں میں پہنچتے۔ حالات کا عام جائزہ لیتے۔ رابطہ پیدا کرتے اور چلے آتے۔

پہلے مرحلے میں کارکنوں کے وہ گروپ بنائے گئے جن کے ذمّے یہ کام لگا کہ وہ علاقے کے حالات کا جائزہ لیں۔ ایک گروپ میں میاں طفیل محمّد اور مراد علی شاہ صاحب کے ساتھ راقم کا بھی نام شامل تھا، دوسرا گروپ ملک غلام علی صاحب، سیّد محمد ہاشم صاحب اور محمّد یحیٰی صاحب پر مشتمل تھا۔

بعد میں خرابیٔ احوال کی روک تھام کے لیے حسبِ ذیل پانچ گروپ ترتیب دیے گئے۔

(۱) اعظم ہاشمی (مرحوم)، عرفان غازی صاحب، محمّد ہاشم اور نعیم صدّیقی۔

(۲) میاں طفیل محمد صاحب، عبدالغفّار خاں صاحب (خوشنویس) محمد حامد صاحب اور

مراد علی شاہ صاحب۔

(۳) ملک غلام علی صاحب، محمدؐ یحییٰ صاحب، راجہ احسان الحق صاحب اور ابو صالح اصلاحی صاحب (مرحوم)

(۴) سیّد نقی علی (مرحوم) عبدالوحید خاں صاحب، عبدالرحیم صاحب۔

(۵) چراغ دین صاحب، حافظ عطاءالرحمٰن صاحب۔

ان وفود کے گشت کے لیے امیرِ جماعت نے لاہور سے سائیکلیں منگوالیں۔ وفود کی ترسیل کے وقت ان کو مولانا خود ہدایت دیتے اور ان کی رپورٹوں پر اجتماعی طور پر غور و خوض کیا جاتا۔

جماعت کی ایک مجلسِ شوریٰ میں مولانا نے یہ فرمایا تھا کہ غیر مسلم اکثریت کے علاقوں میں مسلم قیادت ختم ہوجانے کی صورت میں وہاں کے مسلمانوں میں بدنظمی، مایوسی اور بددلی پیدا ہوجائے گی۔ ان کو سہارا دینے کے لیے جماعت کے کارکنوں کو ابھی سے تیار ہوجانا چاہیے۔

اس دوران میں یہ راز کھلا کہ علاقے میں سیوک سنگھی کارکن بہت ہی محتاط اور خفیہ طریق سے آتے ہیں اور اپنا کام کررہے ہیں۔ کبھی وہ ہم سے پہلے جاتے، کبھی بعد میں! ان کے بارے میں کچھ معلومات ملنے لگیں۔ سرنا گاؤں میں یہ معلوم ہوا کہ ایک سیوک سنگھی ہر روز علی الصّباح میں آتا ہے اور ہندوؤں کو جمع کرکے انھیں کچھ تلقین بھی کرتا ہے اور کچھ مشقیں بھی کراتا ہے۔ اس معاملے کی تحقیق کے لیے میں اپنے کسی دوسرے رفیق (غالباً یحییٰ صاحب) کے ساتھ علی الصّباح وہاں پہنچا۔ اِدھر اُدھر سے معلوم کیا۔ پھر "موقع" کا کھوج لگایا اور دونوں وہاں جا پہنچے۔ سیوک سنگھی انسٹرکٹر واقعی موجود تھا اور لوگ اس کے گرد حلقہ زن بیٹھے کچھ درس لے رہے تھے۔ ہم نے آداب سلام کیا۔ وہ ٹھٹک گئے۔ ان سے بے تکلف ہونے کی کوشش کی۔ پوچھا کہ یہاں آپ جو کچھ مفید باتیں سناتے ہیں اُن سے ہم بھی فائدہ اُٹھانا چاہتے ہیں، لیکن وہ رام نہ ہوئے۔ انھوں نے بتایا کہ یہ مذہبی باتیں ہیں اور سنسکرت میں کی جاتی ہیں۔ پھر ہم نے ان سے یہ بھی کہا کہ ہم علاقے میں

ہندو مسلمانوں کے درمیان بہتر فضا پیدا کرنے کے لیے تگ و دو کر رہے ہیں۔ آپ بھی ہم سے تعاون کریں، لیکن بات کچھ بنی نہیں۔ بس اتنا ہی ہوا کہ اس "درس" کی حقیقت معلوم ہوگئی۔

اسی گشت میں دو بڑے شبہات ہمارے سامنے آئے جو علاقے میں پھیلے ہوئے تھے، ایک یہ کہ ہمیں مسلم لیگ کا جاسوس قرار دیا جاتا تھا۔ دوسرے یہ کہ دارالاسلام میں ہم نے سرحدی پٹھانوں کی ایک خاصی تعداد منگا رکھی ہے۔[1]

دارالاسلام میں ہنگامی حالات

کھچاؤ بڑھتا گیا۔ بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ ۳؍ جون کے اعلان کے بعد علاقے کی فضا میں گھٹیا جذبات کی سڑاند محسوس ہونے لگی۔ امیرِ جماعت نے حکم دیا کہ اب دفتری کام بند کرکے لوگ زیادہ سے وقت باہر بستیوں میں صرف کریں۔ گویا بستی میں ہنگامی حالات کا دور دورہ شروع ہوگیا۔

---

[1] بستیوں کی گردش اور رابطۂ عام کے متذکرہ تجربے کی روشنی میں میری پختہ رائے یہ ہے کہ کسی بھی تحریک، خصوصاً اس تحریک کے کارکنوں کے لیے رابطۂ عام لازمی پروگرام ہونا چاہیے۔ اس طریق کار سے نہ صرف عام آدمیوں تک دعوت پہنچانے کا کام تیزی سے بڑھتا ہے بلکہ آدمی کے اپنے ذہن و کردار کی بھی بہتر تعمیر ہوتی ہے۔ کہیں اہلِ علم سے گفتگو، کہیں اَن پڑھ افراد سے بات چیت، کہیں موافقت کی فضا، کہیں مخالفت کا ماحول، کہیں مقامِ احترام اور کہیں موقعِ شفقت، کہیں مترفین کی حق فراموشی اور مفلسین کی غفلت کوشی، اس طرح کے مختلف مقامات سے گزرتے ہوئے مختلف جذبات کی آبیاری ہوتی ہے۔ کارکن معاشرے کو بالمشافہ جانتا ہے اور ہر اس رَوا اور رسم کو سمجھتا ہے جو فروغ پاتی ہو۔ دعوت کے لیے سفر کرتے ہوئے یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ ہم اللہ کی راہ میں نکلے ہیں، نیز اس طرح مل کر نکلنے والوں میں رابطۂ محبّت زیادہ گہرا ہوجاتا ہے۔ اس طریقِ کار کے ترک کی تلافی محض جلسوں اور تقریروں اور نعروں سے نہیں ہوسکتی۔ اجتماعی وسائلِ دعوت کو استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ انفرادی سطح پر دعوت دینے کا کام ہر قسم کے حالات میں جاری رہنا چاہیے۔

ہم وفود کی صورت میں اپنی اپنی مقرّرہ بستیوں میں جاتے، ہندوؤں سکھّوں اور ــــ مسلمانوں کے سرکردہ آدمیوں کا پتا چلاتے۔ ان سے گھروں یا کھیتوں پر جا کر ملتے، وقت لیتے اور تفصیل سے گفتگو کرتے۔ ان کو توجہّ دلاتے کہ مذاہب میں کوئی بھی اس انسانی پستی کی طرف رہنمائی نہیں کرتا جس کا مظاہرہ فساد زدہ علاقوں میں کیا گیا ہے۔ یہ ہمارے لیڈروں اور اخبار نویسوں کے ذہن کا بگاڑ ہے جو ملک اور اس کی قوموں کو تباہی کی طرف لیجا رہا ہے ان کے اندر کی مذہبی حسّ کو چونکاتے، ان کے ضمیر کو بیدار کرتے، ان کے شریفانہ جذبات کو اپیل کرتے۔ پہلے کچھ تکلّف رہتا، پھر وہ لوگ کھُلنے لگتے تو اپنے شکوک وشبہات پیش کرتے مثلاً ہندو عناصر یہ کہتے کہ ہم آج تک یہ محسوس کرتے ہیں کہ دارالاسلام ایک مسلم لیگی اُڈّہ ہے۔ اس کے جواب میں ہم ان کو بتاتے کہ ہم پارٹیوں کی کشمکش سے الگ رہ کر اسلام کے ان پاکیزہ اصولوں کو مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کے سامنے یکساں طور پر پیش کر رہے ہیں جو انسانی زندگی کی فلاح کے لیے روشنی اور پانی اور ہوا کی طرح ضروری ہیں۔ ہم جن اصولوں کی طرف دعوت دیتے ہیں ان کے خلاف اگر ہمارے عمل کا کوئی بھی پہلو آپ کے سامنے آئے تو آپ لوگ ہم پر گرفت کر سکتے ہیں ہم نیکی اور سچّائی میں مسلمانوں کے بھی ساتھ ہیں اور غیر مسلم بھی اگر نیکی اور سچّائی پر کاربند ہوں تو ہم اُن سے تعاون کر سکتے ہیں۔ ہم ظلم میں نہ غیر مسلموں کے ساتھی ہیں۔ نہ ظلم کے کاموں میں مسلمانوں کا ساتھ دے سکتے ہیں۔ آپ لوگ اپنی قوم کے اندر یہی دعوت لے کے کام کریں تو علاقے کو فساد کی آگ سے بچایا جا سکتا ہے۔ پھر وہ کہتے کہ ہم نے سُنا ہے کہ آپ لوگ علاقے پر حملہ کی اندر ہی اندر تیاریاں کر رہے ہیں ہم اُن کو صاف صاف کہتے کہ اس حد تک تو بات ٹھیک ہے کہ ہم اپنی بستی کے بچاؤ کے لیے اپنے آپ کو تیّار رکھیں گے، اور آپ کو بھی یہ حق دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ ہر ہر بستی کے لوگ اپنے آپ کو تیار رکھیں ــــــ مگر یہ تیّاری کسی پر حملہ کرنے کے لیے نہ ہو۔ نیز ایک قوم کے لوگوں کا دوسری قوم کے لوگوں سے الگ انتظام نہ ہو بلکہ دونوں طرف کے سرکردہ لوگ ہر اس طاقت کے دفاع کے لیے مشترکہ تیّاری کریں جو حملہ آور ہو کے آئے۔

مسلمانوں سے ملتے تو محسوس کرتے کہ مالی اور معاشی اعتبار سے کمزور اور تعلیمی لحاظ سے

پست ہونے اور زیادہ ترمزارع اور کمیں ہونے کی وجہ سے ہمارے یہ بھائی بالکل خوف زدہ، بجھے ہوئے، غافل اور جمود میں مبتلا ہیں۔ غیر مسلموں سے ان کا تعلق خوشامدانہ اور مطیعانہ قسم کا ہے۔ ان کے لیے یہ بھی مشکل ہے کہ وہ ہمارے ساتھ ان سے بالا بالا کوئی گفتگو کرنے کی پوزیشن بھی اختیار کریں۔ وہ ہماری باتیں پتھّر کے مجسّموں کی طرح سنتے اور اپنے چہروں کی کیفیت سے یہ کہتے معلوم ہوتے کہ کیا ایسی باتیں بھی کی جا سکتی ہیں۔ ہم ان کو اطمینان دلاتے کہ ہم چند پردیسی اور مسافر قسم کے لوگ ہیں یہاں تمھارے سامنے جنگل میں پڑے ہیں۔ خدا پر ایمان خودداری کے احساس، معاملات کو سمجھنے کی بصیرت اور اسلامی جذبات و اخلاق کے سوا ہمارا کوئی سامانِ دفاع نہیں ہے۔ تم بھی کمزوری کا احساس دلوں سے نکالو۔ خدا پر ایمان مضبوط رکھو اور اسلامی اصولوں پر قائم ہو کر اپنے دین اور جان و مال اور عزّت و ناموس کے تحفّظ کے لیے مر مٹنے کا جذبہ پیدا کرو۔ جب کوئی خطرہ ہو ہمیں اطلاع کرو، ہم ان شاء اللہ مدد کو پہنچیں گے۔ جب کوئی شکوک و شبہات ہوں تو ہم تمھاری طرف سے غیر مسلم قوم کے ذمّہ دار لوگوں سے بات چیت کریں گے۔ ہم ساری بستیوں کو منظم کر کے امن کے لیے ایک مضبوط طاقت پیدا کریں گے، تم کمزور نہ پڑو!

وفود واپس آتے تو رپورٹیں پیش ہوتیں۔ ان پر بحث و تبصرہ ہوتا۔ نئی ہدایات دی جاتیں اور اگلے دن کا پروگرام بن جاتا۔ دوسری طرف ہمارے دو سابق فوجی ساتھی پریڈ اور دفاعی تربیّت کا کام سنبھالے ہوئے تھے۔ ایک ہوائی بندوق لے کر نشانہ کی مشق کی جاتی، رات کو پہرے کا وسیع انتظام رہتا۔ پہرے کا انتظام پہلے سے تھا، دو دو آدمیوں کی تین چار پارٹیاں رات کے اوقات کو تقسیم کر کے پہرہ دیتیں، ایک پارٹی کا ٹائم جب پورا ہو چکتا تو دوسری پارٹی کو جگا کر فارغ ہو جاتی۔ ایک آدمی مسجد کے بغلی برآمدے میں لٹکے ہوئے گھنٹے کے قریب رہتا۔ دوسرا گشت کرتا اور دونوں وِسل بجا بجا کر ایک دوسرے کو اپنے بارے میں آگاہ رکھتے۔ وِسل کی علاماتی آوازیں متعیّن تھیں کہ بوقتِ ضرورت ان سے کام لیا جا سکے۔ اب یہ انتظام زیادہ وسیع اور مضبوط کر دیا گیا۔ چھ چھ آٹھ آٹھ آدمیوں کی پارٹیاں بیک وقت گشت کرتیں۔ یہاں تک کہ خود مولانا مودودی بھی پہرے کے اس

نظام میں ڈیوٹی دیتے۔ خوب یاد ہے کہ مولانا شب بیداری کے لیے پان اور برف کا خاصا انتظام رکھتے۔ کبھی کام زیادہ ہوتا پہرے کے مرکزی مقام پر لیمپ جلا کر اپنا کام بھی کرتے رہتے اور جاگنے والوں کے ساتھ حصّہ دار بھی رہتے۔ اس پہرے کے کڑے پن کا حال یہ تھا کہ ریلوے لائن پر سے بھی رات کو اگر کوئی شخص گزرتا (اور رات کی گاڑی سے اُترنے والے مسافر بڑی دیر دیر میں جاتے رہتے تھے) تو پہرے دار کی کڑکتی ہوئی آواز کسی جھاڑی میں سے گونجتی۔"کون ہے؟ ٹھہرو!!" اور پھر نفسیاتِ انسانی کے بہت سے گوشے بے نقاب ہو جاتے۔ بعد میں ان لوگوں کو معذرتی انداز میں آگاہ کر دیا جاتا کہ خطرے کے ماحول میں انتظام ناگزیر ہے۔

۱۵۔ اگست کے بعد

۱۵/ اگست کو آخری طور پر خطِ تقسیم کھنچ گیا۔ آزادی کے جھنڈے دہلی اور کراچی میں لہرا دیے گئے۔ دونوں طرف جشن کے شادیانے بجنے لگے۔ اور "آزادی" کی نیلم پری خون میں نہائی ہوئی لاشوں پر قدم رکھتی ہوئی بڑے بڑے جلوسوں کے ساتھ مارچ کرنے لگی۔ ان جلوسوں کے نعروں کی گونج ان لوگوں کے کانوں تک پہنچ رہی تھی جن کی جانوں پر بنی ہوئی تھی اور جن کے لیڈر بچاؤ کا نہ انتظام کر سکے تھے نہ بروقت اُنھیں آگاہ کر سکے تھے کہ پسِ پردہ سیاست کیا تیاریاں ہیں۔ ان لوگوں نے آنسوؤں کے ساتھ آزادی کا خیر مقدم کیا۔

ایک قیاس یہ تھا کہ ضلع گورداسپور کا زیادہ تر حصّہ پاکستان میں جائے گا۔ دوسرا اندیشہ یہ تھا کہ ہندوستان میں شامل ہوگا۔ اسی معلق حالت کی وجہ سے دو قومی کش مکش کے جذبات کا لاوہ ابھی بہہ نہیں رہا تھا۔ یہ اعلان جس دن ہونے والا تھا وہ جمعۃ الوداع سے ٹھیک قبل کا دن تھا۔ اس روز میری اہلیہ اچانک ایک ایسی تکلیف میں مبتلا ہوگئی کہ لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے جا کر ایک چھوٹا سا آپریشن کرانا ناگزیر ہو گیا۔ میں نے تانگہ لیا اور تقریباً عصر کے وقت پٹھان کوٹ جا پہنچا۔ وہاں پہنچا تو دیکھا کہ بازار بند ہو رہا ہے اور ہندوؤں سکھوں کی ٹولیاں اِدھر اُدھر حرکت کر رہی ہیں۔ مسلمانوں کے چہرے اُداس اُداس دکھائی دیے، پوچھا کیا بات ہے؟

معلوم ہوا کہ ہونے والا اعلان ہوگیا ہے اور گورداسپور کا ضلع بھارت میں شامل کردیا گیا ہے خبر سُن کر شاق ہوا۔ ساتھ ہی یہ تشویش کہ ہندو اکثریت کے اس شہر میں اس حالت میں میں اپنی بیوی کو ساتھ لیے گھوم رہا ہوں، اور جانا بھی ایک سکھ لیڈی ڈاکٹر کے پاس ہے، لیکن چارہ کوئی نہ تھا، اس لیے خدا پر بھروسہ کرکے آگے بڑھا۔ لیڈی ڈاکٹر کو بلوایا۔ وہ آئیں اور کہنے لگیں کہ فوری طور پر ایک میٹنگ میں جانا ہے، ابھی آتی ہوں۔ اس کے دروازے کے سامنے میں سر راہ اور میری بیوی دونوں انتظار کی گھڑیاں کاٹنے لگے۔ بازار اور تیزی سے بند ہونے لگا۔ غیر مسلموں کی ٹولیوں کی رو ارو اور بڑھ گئی، مگر یوں ابھی ہر کوئی چپ چپ تھا!

خدا خدا کرکے لیڈی ڈاکٹر آئیں۔ وہ ہمیں بازار میں اپنی دکان پر لائیں۔ دکان کھولی، آپریشن کیا۔ دوا دی اور ہم سر مغرب فارغ ہوئے۔ تانگہ والا انتظار کررہا تھا، تانگہ پر بیٹھے اور اُسے کہا کہ "شہر کی فضا خراب ہوگئی ہے اور وقت بھی تشویشناک سا ہے، ذرا جلدی نکل چلو" ——— اور ساتھ ہی خیال اُدھر گیا کہ اس وقت ہمارا اِکّہ بان بھی ہندو ہے۔ خدا ہی اپنے سایۂ حفاظت میں رکھے؛ خیر وہ چلا۔ پٹھان کوٹ کی حدود سے نکلے تو یہ تشویش کہ اس تاریکی میں جانے راستے کا کیا حال ہے۔ راستے میں جگہ جگہ ہندو آبادیاں ہیں۔ اتنا تو دیکھا کہ ہر اہم موڑ پر کچھ لٹھ بند لوگ موجود ہیں، مگر ابھی کوئی "پروگرام" نہیں تھا۔ خیریت سے بستی پہنچنے پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔

وہ خوفناک کوٹھڑی

میں اور طفیل صاحب جس علاقے کے انچارج تھے اس میں ایک اہم آبادی ——— ——— کے نام سے موسوم تھی۔ یہ ہندو راجپوتوں کا خاص گاؤں تھا اور یہاں ان کا پرانا زور چلتا تھا۔ مسلمان بالکل اس کے انگوٹھے کے نیچے تھے۔ بعض کا حال تو یہ تھا کہ وہ "نیم مسلم"، "نیم غیر مسلم"، کی پوزیشن اختیار کیے ہوئے تھے۔ یہ بات نہ بھولے گی کہ وہاں ایک مسلمان حکیم صاحب رہتے تھے جن کے گھر میں ہم اپنی مہم کے سلسلے میں چند بار گئے ان کا حال یہ تھا کہ دیواروں پر ہندوانہ بتوں کی تصاویر موجود تھیں۔ اُن سے بات ہوئی تو

کہنے لگے کہ ہمارے آبا و اجداد ہندو تھے اور اب بھی ہم ان سے کٹ نہیں سکتے۔ ہندو راجپوتوں نے ان سے کہہ بھی دیا تھا کہ تمھیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں، تم ہمارے اپنے ہو۔ اور مجھے حکیم صاحب کی اس نوجوان لڑکی پر رحم آیا جس کی عزّت اُس ماحول میں خطرے کی زد پر تھی۔ نہیں بھولتا۔ وہاں کا ایک دھوبی جو ہمارا کام کرتا تھا اور اس واقفیّت کی بنا پر ہم اس سے ملتے تھے۔ اس کی کم زوری کا عالم بھی بڑا رحم طلب تھا۔

ایک دن میں اور طفیل صاحب گئے تو بستی کے باہر وہی دھوبی ہمیں ملا۔ اس سے ہم نے دریافت کیا کہ کون کون لوگ آج ہمیں مل سکیں گے۔ اس نے راجپوت سردار کا نام لیا۔ پھر ہم نے پوچھا کہ مسلمانوں میں سے کون لوگ ملیں گے؟ اس نے کچھ بتایا۔ اور ہم بستی کے اندر چلے گئے۔ ملتے ملاتے جب بازار سے گزرے تو دیکھا کہ ہندو حضرات ایک جگہ جمع ہیں اور لاٹھیاں وغیرہ پڑی ہیں۔ ہم نے آداب سلام کیا اور بیٹھ گئے۔ بات شروع ہوئی ہی تھی کہ فوراً ہم سے سوال کیا گیا کہ ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟ ہم نے تفصیل سے اپنا پروگرام بیان کیا اور ان لوگوں سے ملاقاتوں کا حوالہ دیا جو موقع پر موجود تھے۔ انھوں نے شکایت کی کہ ہمیں اطلاع ملی ہے کہ آپ مسلمانوں سے مل کر ان کو کچھ سکھاتے پڑھاتے ہیں۔ ہم نے کہا کہ ہم دونوں فریقوں کے نمایاں افراد سے ایک ہی پروگرام کے تحت یکساں ملتے ہیں۔ اگر کوئی خاص اطلاع ہمارے کسی اقدام کو مشتبہ کرنے والی ہو تو راوی کو سامنے لائیے، چنانچہ اُنھوں نے آدمی بھیج کر رپورٹر کو بلوایا۔ تھوڑی دیر میں وہی دھوبی ہمارے سامنے تھا اور اس نے رپورٹ یہ کی تھی کہ یہ لوگ مجھ سے پوچھتے تھے کہ مسلمانوں کے گھروں کا پتا بتاؤ۔ ہم اُن کو کچھ باتیں سمجھانا چاہتے ہیں۔ ہم نے جرح کی اپنے کیے ہوئے سوالات کو ان کے سامنے رکھ دیا تو وہ چُپ سادھ گیا۔ اس پر محفل کا رنگ بدل گیا اور فوراً ہمارے لیے شربت کے گلاس منگوائے گئے۔ موقع پا کر ان سے کھُل کر باتیں کی گئیں اور ان کے شریفانہ جذبات کو بیدار کرنے کی کوشش کی گئی۔ ہم نے صاف صاف کہہ دیا کہ جس طرح ہم آپ سے ملتے ہیں، مسلمانوں سے بھی ملیں گے اور اپنا پیغام ہر فریق کو سنائیں گے۔ جس کے دل میں کھوٹ نہیں ہوتی اس کی جُرأت اور صداقت اثر ڈالے

بغیر نہیں رہتی۔

اب یہ لوگ کہنے لگے کہ آپ اپنی بات کرنے کے لیے ہمارے سردار کے پاس چلیں۔ ہم نے کہا کہ ہم تو ان کے گھر پر گئے تھے۔ ایک عورت ملی اور اس نے کہا کہ وہ ــــ اطلاع کرتی ہے۔ لیکن جواب ملا تو یہ ملا کہ وہ گھر پر نہیں ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ وہ دوسری جگہ ہیں چنانچہ ایک سرکردہ آدمی رہبر بن کے چلا، محلّے میں سے گزرے تو گلیاں سُنسان دیکھیں۔ ایک گلی میں داخل ہوئے تو وہاں پہرے کا انتظام تھا۔ ہمارے وہاں پہنچتے ہی ایک بچّے نے اپنے ہاتھ میں لیا ہوا موٹر کا ہارن بجایا۔ ہم سمجھ گئے کہ یہ علامتی اشارہ ہے۔ ہمیں آگے لے جایا گیا۔ ایک ڈیوڑھی پر ہم رُکے۔ اندر سے آدمی آیا اور ہمیں لے گیا۔ ڈیوڑھی، پھر ایک کمرہ، پھر ایک صحن، پھر اندر ایک کوٹھری! ــــ یہاں کیا دیکھتے ہیں کہ کوٹھری میں کئی آدمی بیٹھے ہیں۔ ہندو بھی، سکھ بھی! بعد میں معلوم ہوا کہ ایک سیوک سنگھی لیڈر بھی تشریف رکھتے ہیں۔ ایک سرکاری عہدیدار بھی ہیں۔ کونوں میں برچھیاں پڑی تھیں۔ کرپانیں دیوار سے لٹک رہی تھیں۔ پستول بھی دو ایک اصحاب کی کمر سے آویزاں تھے۔ ماحول ڈراؤنا ہونے کے لحاظ سے کافی سنگین تھا۔ مجھے محسوس بھی ہوا کہ ہم ایک خطرے کے مقام پر لے آئے گئے ہیں،

لیکن طفیل صاحب نے تلواروں اور برچھیوں کے سائے میں جب تقریر شروع کی تو خود وہ لوگ دنگ رہ گئے اور چُپ چاپ سُنتے رہے۔ آخر میں انھوں نے شکوک و شبہات پیش کرنے شروع کیے۔ ایک تو وہی کہ تم لوگ درحقیقت مسلم لیگی ہو۔ ہم نے پوزیشن بتائی۔ اُنھوں نے اس کی تردید میں دلیل یہ دی کہ چودھری نیاز علی خاں صاحب نے جب آپ کو لا کے اپنی عمارتوں میں رکھا ہے اور وہی آپ کی کفالت کرتے ہیں تو کیسے ممکن ہے کہ آپ کچھ اور ہوں۔ ہم نے بتایا کہ ہم نہ کانگریسی ہیں نہ مسلم لیگی، ہم تو خدا کے دین کے اصولوں پر کام کرنے کے لیے منظم ہوئے ہیں۔ ہمارے نزدیک ملک ایک رہے تو بھی ہمارا کام وہی ہے اور ملک تقسیم ہو جائے تو بھی ہمارا فرض ویسا ہی ہے۔ چودھری نیاز علی خاں صاحب کی عمارات، خالی پڑی تھیں وہ انھوں نے کچھ شرائط کے تحت ہمیں اسی طرح دی ہیں جیسے کرایہ دار

کو کوئی عمارت دی جاتی ہے ۔ وہ ہمیں وظائف نہیں دیتے ۔ ہم اپنے طور پر خود انتظام چلاتے ہیں ۔ یہ معلومات سن کر وہ ہکّا بکّا رہ گئے ۔ پھر طفیل صاحب نے اپیل کی کہ کانگریس اور مسلم لیگ کے سیاسی اختلافات کو کیوں نہ ٹھنڈے دل سے سوچا جائے ۔ ان معاملات میں نفرت ـــــــ اور دشمنی اور فساد کی کیا وجہِ جواز ہے ۔ اس کے بعد انھوں نے دوسرا شبہ بیان کیا کہ سُنا ہے کہ پچھلے دنوں آپ نے سرحد سے پٹھان بلوائے تھے اور وہ خفیہ رکھے ہوئے ہیں ۔ تاکہ علاقے پر حملہ کریں ۔ اس پر طفیل صاحب ہنس پڑے اور انھوں نے حقیقت واضح کر دی کہ وہ تو ہمارا ایک اجتماع ہوا تھا جس میں شمالی ہند کے ارکان اور کارکن جمع ہوئے تھے ۔ اس میں علاقے کے جو غیر مسلم اصحاب بھی شریک ہوتے رہے ہیں ان سے پوچھیے کہ یہ کیسا اجتماع تھا اور اس میں کیا باتیں پیش کی گئیں ۔ پھر اپنے اجتماعات اور ان کی نوعیّت کو تفصیل سے بیان کیا ۔ وہ کہنے لگے کہ یہ تو ہم نے بھی سُنا ہے کہ اجتماع میں نہایت اچھّی باتیں پیش کی گئی تھیں ، اور اسلام واقعی اچھّی چیز ہے ۔ لیکن کروڑوں مسلمان اسی اسلام کو ماننے والے ہمارے سامنے موجود ہیں ، ان کا عمل تو ویسا نہیں ہے ۔ آخر پنڈی اور نواکھلی میں اسلام کے ماننے والوں نے کیا کچھ کیا ۔ طفیل صاحب نے ان کو بتایا کہ ہم اسی لحاظ سے مختلف ہیں کہ ہم اسلام کو باتوں کا دین نہیں ، عمل کا دین بنانے کی دعوت لے کر آئے ہیں ۔ پھر یہ بھی بتایا کہ جو فسادات ہو رہے ہیں وہ اسلام کی تعلیم کا نتیجہ نہیں ، ” نیشنلزم “ کے جنون کا نتیجہ ہیں ، اور نیشنلزم کے اس جنون سے ہم مسلمانوں کو بھی اور آپ کو بھی بچنا چاہیے ۔ پھر جب ان کو یہ بتایا گیا کہ ہم لوگ بستی بستی میں گھومتے پھرتے ہیں اور قلم تراشنے کا ایک چاقو اور ہاتھ میں رکھنے کا ایک سرکنڈا بھی ہمارے پاس نہیں ہوتا ـــــــ ، اور خود آپ کی اس تاریک کوٹھری میں ہم اسی حال میں آپہنچے ہیں ـــــــ تو سوچیے کہ جس کے دل میں چور ہوتا ہے اس کا انداز کیا یہی ہوتا ہے ؟ اس پر وہ لوگ کچھ مبہوت اور نادم سے ہو کر رہ گئے !

اور ہم ان سے یہ کہہ کر رخصت ہوئے کہ ہم اب جا کر مسلمان بھائیوں سے ملیں گے اگر آپ کو کوئی شبہ ہو تو اپنا کوئی آدمی ہمارے ساتھ کر دیجیے ۔ چنانچہ ہم بے کھٹکے آکر مسلمان افراد سے ملے ۔ ان کی ہمّت بندھائی اور واپس چلے آئے ۔

اگر اطلاع ملتی کہ کسی مسلمان سے کسی نے کوئی بات زیادتی کی، کی ہے یا کسی کو اندیشہ لاحق ہوا ہے تو ہم فوراً دوسرے فریق کے سرکردہ لوگوں کو مل کر آگاہ کرتے اور ان سے مطالبہ کرتے کہ اس زیادتی کا ازالہ کرائیے اور اندیشہ دور کرلیئے ؛ چنانچہ ایک مقام کے بارے میں اطلاع ملی کہ وہاں مسجد جلادی گئی ہے، تو ہم نے اُسی راجپوت بستی کے سرکردہ افراد کو وہاں بھیجا کہ حالات کو جا کر درست کریں۔ ورنہ ایک چنگاری سارے علاقے میں آگ پھیلادے گی اور اس کوشش سے بہت فائدہ ہوا۔

باؤنڈری کمیشن کا اعلان

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ضلع گورداسپور کی قسمت بالکل معلّق تھی۔ رات کو مجلسِ عام میں نئی صورتِ حالات کے متعلق گفتگو ہوئی۔ گورداس پور کے بارے میں جو فیصلہ ہوا وہ بالکل غیر متوقّع تھا۔ چودھری ظفراللہ خاں کے وکیلانہ کمالات "کی داد دی گئی۔ آج سے بالکل نئی صورتِ حالات کا آغاز ہوا۔

اُداس عید

جمعۃ الوداع کی نماز کا ماحول بھی بوجھل تھا، پھر انتیسویں کی عید[1] بھی بڑی اُداس تھی۔ ہم نے عید منائی اور اللہ کا حکم پورا کرنے کے لیے اسی انداز سے منائی جیسے ہمیشہ منائی جاتی تھی۔ اس مرتبہ باہر کی بستیوں سے نمازی بڑی کم تعداد میں آئے۔ بعض کے لباس بالکل میلے تھے۔ معلوم ہوا کہ سارے علاقے میں عید نہیں منائی گئی بلکہ اداسیوں میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

خطبۂ عید میں موقع کے لحاظ سے لوگوں کی ڈھارس بندھانے کا اہتمام کیا گیا۔ نماز کے بعد باہر کے لوگوں سے باتیں کی گئیں اور نئے حالات کے مطابق ان کو مشورے دیے گئے۔ ان کو تاکید کی گئی کہ وہ کسی خطرے پر یا تو ڈھول وغیرہ سے الارم کردیں یا آدمی بھیجدیں۔ ہم اگرچہ تعداد میں تھوڑے ہیں مگر خود امداد کو آئیں گے اور دوسری

---

[1] یعنی ۲۹ کا چاند ہوا اور یکم شوال بروز سوموار عید ہوئی۔

بستیوں سے مدد طلب کریں گے۔

تبادلۂ آبادی ہونے لگا

کئی روز قبل سے ہم دیکھ رہے تھے کہ امرتسر کی طرف سے دھڑا دھڑ لاریاں اور ٹرک غیر مسلم آبادی کو سازو سامان سمیت لا رہے تھے۔ یہ مغربی پنجاب سے آنے والے پناہ گزین تھے۔ یہ چیز بھی اپنا اثر حالات پر ڈال رہی تھی۔ ادھر سے موٹی موٹی مسلمان اسامیاں بھی نکلنا شروع ہوگئیں۔ کانگڑہ کی طرف سے کھاتے پیتے مسلمان چلے آرہے تھے لیکن مغربی پنجاب سے آنے والے غیر مسلموں کی تعداد بہت زیادہ اور رفتار بہت تیز تھی

دفاعی انتظامات

بستی کے ڈیفنس کے انتظامات اوائل اگست میں کر لیے گئے تھے۔ مورچے کھُد گئے تھے۔ مختلف افراد کو بتادیا گیا کہ خطرے کے وقت اس کی ڈیوٹی کہاں ہو گی۔ اور حملہ ہونے کی صورت میں کیا پوزیشن اختیار کرنی ہے[1]۔

ابھی حالات کی خرابی اوجِ کمال تک نہیں پہنچی تھی کہ ایک دن یکایک دارالاسلام کی بستی میں خطرے کا الارم بجا اور فضا میں ارتعاش پیدا ہوگیا۔ ہوا یہ کہ ایک آدمی ریلوے لائن (جو بستی سے ذرا بلند تھی) کے کنارے دوڑتا ہوا پکار رہا تھا کہ حملہ آور جتھا آرہا ہے۔

---

[1] نہایت ہی غیر معمولی قسم کی سنگین صورتِ حالات اور قانون اور معاشرے کی طرف سے تحفّظ کے کُلّی خاتمے کے پیشِ نظر یہ انتظام کیا گیا تھا۔ پھر خیال کسی حملے کا نہیں تھا، فقط دفاعی ضرورت سامنے تھی ورنہ اپنے کارِ دعوت کے لیے ہم قوّت کے استعمال کے قائل نہ تھے۔ دہشت انگیزی (TERRORISM) کو ہمارے تحریکی کام سے دور کا بھی تعلّق نہیں ہوسکتا۔ بلکہ یہ وہ بلا ہے جو کسی بھی دعوتی، تبلیغی اور اخلاقی کام کو تباہ کر کے رکھ دیتی ہے۔ ہم لوگوں کو ڈرانے دھمکانے والے نہ تھے، انھیں محبّت سے ہدایت کا راستہ دکھانے والے اور بشارت سنانے والے تھے۔

اپنے بچاؤ کا انتظام کرلو۔ اس پکار کے ساتھ سرنا اسٹیشن کی جانب سے نعروں کی آوازیں بھی سُنائی دیں ۔ اس پر جو اصحاب ڈیوٹی پر تھے انھوں نے کسی مجاز شخصیّت سے اجازت لیکر الارم بجا دیا۔

پروگرام پہلے سے طے تھا کہ خطرے کی صورت میں کیا کرنا ہے ؛ چنانچہ ایک دومنٹ میں مختلف رفقار کے گروہ مقرّرہ ناکوں پر اُس طریق سے جاکر کھڑے ہو گئے جو پہلے سے طے کر دیا گیا تھا۔ ہمارے پاس صرف برچھیاں تھیں۔ ہر شخص ڈھاٹا باندھے برچھی لیے، دم سادھے کسی مؤقف پر کھڑا تھا۔ یہ برچھیاں جو ہمارے پاس تھیں، اُن کے پھل امرتسر میں تیار ہوئے تھے اور دلچسپ تاریخی واقعہ ہے کہ ان کو امرتسر سے پٹھانکوٹ تک لانے والا بھی میں ہی تھا۔ یہ سب کپڑے میں اس طرح پیک کی گئی تھیں کہ ٹکرا کر بجیں نہیں۔ پھر ان کو ایک تھیلے میں ڈالا گیا تھا۔ عجیب بات ہے کہ آج جب میں اس موقع کا تصوّر کرتا ہوں تو ہزار اندیشے ذہن میں آتے ہیں کہ " جو یوں ہوتا تو کیا ہوتا"، مگر اس وقت کوئی اندیشہ نہ ہوا تھا کیوں کہ ایک جذبۂ بے تاب کام کر رہا تھا۔ آیئے اس جملۂ معترضہ سے آگے نکلیں۔ جب الارم ہوا تو مولانائے محترم مع بعض رفقار کے بستی سے باہر تھے وہ حسبِ عادت سیر کے لیے نہر کے کنارے چلے گئے تھے۔ اب جو الارم ہوا تو دیکھا کہ مولانا رفقار کے ساتھ لپکے چلے آرہے ہیں، ادھر حافظ عطار الرحمٰن (مرحوم) نابینا ہونے کی وجہ سے ایک نوجوان کے سہارے جلد جلد بستی کی طرف بڑھتے دکھائی دیے۔ سب حضرات کے آتے آتے دوسری اطلاع یہ آگئی کہ حملہ وملہ کچھ نہیں، جتھا کسی اور طرف چلا گیا ہے۔ اب امن وسلامتی کا الارم ہوا۔

بعد میں غالباً اگلی صبح کو جب فضا بہت پُرسکون تھی، اپنے یہاں سے دو ایک افراد معلوم کرنے گئے کہ قصّہ کیا تھا۔ سرنا اسٹیشن اور گاؤں کی آبادی میں لوگوں سے پوچھا۔ یہی معلوم ہوا کہ ہندوؤں کا کوئی جلسہ وغیرہ تھا اور اُنھوں نے نعرے ضرور لگائے، مگر حملہ کا کوئی پروگرام نہ تھا۔

آہستہ آہستہ ہماری بستی بیرونی دنیا سے کٹتی چلی گئی۔ ٹرینیں بند ہوگئیں، بسوں

کی دوڑ ختم ہوگئی، کوئی مہمان نہیں آتا تھا، پٹھان کوٹ کے قصبے سے رشتہ منقطع تھا، کسی دوسری بستی سے رابطہ نہ رہا تھا، ڈاک آنا بند ہوگئی، اخبارات عنقا ہو گئے۔ لے دے کے ایک ریڈیو تھا جس کے ذریعے کچھ اندازہ ہوتا کہ آزادی کس شان سے آرہی ہے، انگریز کی پالیسی کیا ہے، ہندو کیا چالیں چل رہے ہیں، خوں ریزی کا سلسلہ کیسے بڑھ رہا ہے لوگ اُجڑ رہے ہیں، کیمپ قائم ہو رہے ہیں اور قافلے چل رہے ہیں۔ تفصیل اگرچہ نہیں ہوتی تھی مگر جو کچھ نشر ہوتا اس سے نتیجے نکالے جاتے اور ایک بات کی کڑیاں دوسری خبر سے جوڑی جاتیں۔ کبھی ایسا ہوتا کہ چودھری نیاز علی خاں صاحب کے قلعے میں (ان کی کوٹھی اور باغ کا مشہور نام) کوئی افسر یا ملازم کسی مقام سے جان بچا کر آیا ہوتا تو اس کے سُنائے ہوئے حالات پہنچتے یا ہمارے ہاں کسی بستی کے لوگ یا کسی دور کی جگہ کا کوئی شخص پہنچ جاتا تو کچھ نئی خبریں سامنے آتیں۔ ہوتے ہوتے خبروں کا دائرہ آس پاس کی بستیوں کے متعلق محدود ہو گیا۔ جہاں سے نکل کے آنے والے لوگ اپنے اپنے احوال سناتے۔

اب بستی کا پورا دروبست فوجی نوعیّت اختیار کر گیا تھا۔ مقررہ ناکوں پر چوبیس گھنٹے پہرہ رہتا خصوصًا رات کو شدید اہتمام ہوتا، راجہ احسان الحق بستی کے باہمّت اصحاب اور آس پاس سے آنے والے پناہ گزینوں میں سے بعض لوگوں کو چھانٹ کر پریڈ کراتے۔ ہمارے پناہ گزین دراصل ہندو، سکھ زمینداروں کے تشدّد کے نیچے مُدتوں سے ایسے دبے چلے آرہے تھے کہ ان کے دلوں سے اُن کا خوف دور نہیں ہوتا تھا اور یوں لگتا تھا کہ اگر خدانخواستہ کوئی حملہ ہو جائے تو یہ خود آگے بڑھ کے اپنے آپ کو پیش کر دیں گے کہ شوق سے مار ڈالو ہمیں۔ ایسی بے جان مخلوق کے اندر جان پیدا کرنے کے لیے احسانُ الحق صاحب ان کے سامنے جوشیلی تقریریں کرتے اور ان کو احساس دلاتے کہ ہمیں دیکھو، ہم کتنی تھوڑی سی تعداد میں یہاں مخالف علاقے میں گھرے ہوئے ہیں، مگر کسی کے دل میں پستی نہیں۔ جو اِدھر کا رُخ کرے گا، ہم سب کا جذبہ یہی ہے کہ اس کا منھ پھیر دیں گے۔ تم بھی اسی طرح سوچو، ورنہ ڈر ڈر میں خواہ مخواہ مارے جاؤ گے۔ بلکہ ہمیں بھی ساتھ لے ڈوبو گے۔

پہرے کا ایک دل چسپ واقعہ بھی سنیے۔ دارالاسلام کی طرف پختہ سڑک سے

جو بڑا راستہ آتا تھا وہ ریلوے لائن کے ایک چھوٹے سے پُل کے نیچے سے گزرتا تھا۔ اس پُل کے عین سامنے جہاں سے راستہ دارالاسلام کی جانب موڑ لیتا تھا، وہاں ایک پہرہ دار برچھی تھامے کھڑا تھا[1] اچانک تھانیدار کی سواری (غالباً کار تھی) پُل کے نیچے نمودار ہوئی جب وہ پہرہ دار کے سامنے پہنچی تو اس نے برچھی آگے کر کے بڑے زور سے کہا "ہالٹ" (یا کوئی دوسرا لفظ) تھانیدار صاحب گاڑی سے اُترے، اسے شاباش دی، اور پوچھا کہ ہم مولانا مودودی سے ملنا چاہتے ہیں۔ اس نے کہا کہ اجازت لینی ہوگی، بغیر اجازت آپ آگے نہیں جا سکتے، چنانچہ پہرہ دار کا نائب قاصد وہاں سے پیغام لے کر مولانا کے پاس آیا اور مولانا نے اجازت دے دی۔ تب تھانیدار صاحب کے سامنے سے پہرہ دار نے اپنی برچھی ہٹائی۔

غالباً تھانیدار صاحب یہاں کے حالات کا جائزہ لینے اور فضا کو سونگھنے کے لیے آئے تھے۔ جب وہ شخص مولانا کی طرف چلا تو اس سے قبل مولانا کے مکان کے سامنے کھڑے ہونے والے دستے نے اپنی برچھیاں بالکل متّصلہ کھیت کی تیار فصل میں ڈال دیں تاکہ خواہ مخواہ سامنے نہ آئیں۔ خیر تھانیدار مولانا سے ملا اور رسمی سی باتیں کر کے چلا گیا۔

اب لوگ دارالاسلام کی چھوٹی سی بستی میں اِرد گِرد کے علاقے سے اس تیزی سے آنے لگے کہ چند روز میں وہاں جگہ نہ رہی۔ یہ سلسلہ یوں تو اوائل اگست ہی سے شروع ہوا مگر وسط اگست کے بعد لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔ پناہ گزینوں کا باقاعدہ ایک کیمپ بن گیا۔ اس کیمپ کی کثیر آبادی کی خدمت کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے نئی صلاحیتیں عطا کیں جن کی وجہ سے آج خدمتِ خلق جماعتِ اسلامی کا بڑا شعبۂ کار ہے۔ مرد، عورتیں، بچّے اور ان کے بے حساب مسائل تھے۔ ہمارے ہاں سال بھر کے غلّے کا جو ذخیرہ تھا وہ سارا مشترک قرار دیا گیا۔ پناہ گزینوں میں سے جو لوگ راشن ساتھ لائے، مثلاً بعض لوگ بیل گاڑیوں پر گندم کی بوریاں بھی ساتھ لائے۔ وہ بھی آنے والوں کی رضامندی سے سارا کچھ اس ذخیرے

---

[1] یہ پہرہ دار ایک نوجوان مستری تھا جس کا نام غالباً رشید تھا۔ اس شخص نے اپنے بچوّں سمیت بڑا کام کیا اور بڑی دلیری دکھائی۔

میں جمع کر دیا جاتا۔ ہر شخص اور کنبے کے لیے باقاعدہ راشن مقرّر ہو گیا اور ہر روز وہ راشن ملتا۔ پانی کنویں کا بھی تھا، نہر کا بھی۔ لکڑی سے جنگل بھرا تھا۔ لہٰذا روٹی کی حد تک خاصی دیر تک کے لیے مسئلہ حل تھا۔ ہمارے کچھ رفیق کیمپ کی دیکھ بھال، راشن کا انتظام، صفائی کا انتظام جگہوں کی الاٹ منٹ، علاج معالجے کی ڈیوٹیاں سنبھالے ہوئے تھے۔ یعنی ایک طرف شعبۂ دفاع اور دوسری طرف شعبۂ بحالی و انتظام پناہ گزیناں، دوہرا کام تھا اور کڑی محنت تھی۔ تھوڑے سے آدمیوں پر کام کا بوجھ زیادہ تھا۔ دو دو گھنٹے بمشکل سونے کو ملتے تھے، وہ بھی کسی "مورچے" پر۔ خدا کا کرم یہ ہوا کہ کارکنوں کی خوراک کا انتظام بہت اچھّا رہا ورنہ پس جاتے۔ آزمائش کے دنوں میں تمام گھروں سے گھی، چینی، مرغیوں، دالوں وغیرہ کا اسٹاک یکجا کر لیا گیا۔ مسلسل مرغیاں پکتی رہیں، بہترین مصالحے اور گھی کے ساتھ۔ چائے چار بار موروچوں پر ملتی رہی۔ غالباً ایک مدراسی باورچی تھا جس نے ایسی بے جگری سے کام کیا کہ ہر چیز وقت پر تیّار ملتی۔

کیمپ میں ایک ایسا شخص داخل ہوا جس کے پاس کچھ کھانے پینے کی اشیاء تھیں اور وہ ان کو پناہ گزینوں میں مہنگے داموں بیچ کر چور بازاری کرتا تھا۔ (افسوس کہ اس کا نام اب مجھے یاد نہیں) اس کے متعلّق معلومات حاصل کی گئیں تو رپورٹیں یہی ملیں کہ اچھّا آدمی نہیں ہے۔ پہلے تو تقریروں میں بات کہی گئی کہ کوئی شخص غذائی اشیاء دوسروں سے الگ کر کے نہ رکھے اور نہ دوسروں میں فروخت کرے بلکہ سب کچھ خدمت کے طور پر پیش کر دے۔ مگر اس شخص پر کوئی اثر نہ ہوا اور اس کے متعلّق شکایات بڑھتی گئیں۔ آخر اُسے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا اور اس سے دو ٹوک بات کی گئی کہ میاں! اگر اس جگہ رہنا ہے تو جو قاعدے مقرّر ہو چکے ہیں ان کے مطابق سب کے ساتھ مل کر رہو اور مصیبت کی گھڑی میں نفع اندوزی نہ کرو۔ اس نے جواب دیا کہ جو چیزیں میری اپنی ہیں ان کو میں جس طرح چاہوں رکھوں یا بیچوں، کسی کو کیا مطلب۔ تب راجہ احسان الحق کے سپاہی اٹن شن ہو گئے اور راجہ صاحب نے کہا کہ میاں اُٹھاؤ اپنا بستر اور سامان اور اسی وقت یہاں سے نکل جاؤ، ہمارے پاس تمھارے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ بات جب یہاں پہنچی تو بیچارے

نے ڈگیں ڈال دیں اور اس کا آٹا دانا بھی اجتماعی راشن اسٹور میں جمع کر دیا گیا۔

بابا رحمت اور اُس کا حُقّہ

ہماری بڑی گہری دوستی ایک بابا سے ہوئی۔ غالباً اسے بابا رحمت کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ وہ یوں کہ پہلے تو اپنے حقّے نے خوب ساتھ دیا۔ پھر ایک دن ایسا آیا کہ تمبا کو ختم ہو گیا۔ بابا رحمت حقّہ گڑگڑاتا پاس آیا اور ہمیں دعوت دی۔ اس کے دیہاتی حقّے سے لطف اندوز ہوئے۔ پھر تو یہ معمول ہو گیا کہ بابا حُقّہ تین چار بار تازہ کرتا، تیار کرتا اور پیش کرتا یہاں تک کہ اگر کسی مورچے پر ڈیوٹی ہوتی تو وہاں جا پہنچتا۔ مگر پھر ایک دن آیا کہ بابا کے پاس بھی تمبا کو ختم ہو گیا۔ اب کیا ہو۔؟ کچھ نہیں۔ کوئی آزمائش سی آزمائش تھی۔

دارالاسلام کا واحد شہید

ماحول کی خوفناکی کا تصوّر کرنا کچھ مشکل نہیں، کیوں کہ اوپر جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس میں سارے پہلو آ گئے ہیں۔ لیکن مسلمانوں کی مصیبت اور تباہی کا مسئلہ چین نہیں لینے دیتا۔ اور ان کی امداد کے لیے اس آتشیں ماحول میں بھی خدا کے بندوں نے بعض مہمّاتی کام کیے اصل میں بہت سے کمزور مسلمان ایسے تھے جن کو غیر مسلم نکلنے نہیں دے رہے تھے، اور بعض جگہ طے تھا کہ ان کو ہندو بنا لیا جائے گا۔ بعض جگہ سے مسلمان اپنا غلّہ، مویشی، پارچہ جات سب کچھ چھوڑ کے آ گئے تھے۔ سو اس سلسلے میں مولانا کی اسکیم کے مطابق کچھ کام ہوا۔

۲۲؍ اگست ۱۹۴۷ء کو جنوبی دیہات کے مسلمانوں کے متعلق ایسی اطلاعات ملیں، چنانچہ راجہ احسانُ الحق اور ان کے بھائی محمد اسلم کو ان کی طرف بھیجا گیا کہ ان کا حوصلہ بندھائیں اور اپنے ساتھ لے آئیں یا کسی مدد کی ضرورت ہو تو بتائیں۔ یہ حضرات دیر تک نہ آئے تو سب کو پریشانی ہوئی مگر قبل اس کے کہ کوئی دوسری پارٹی بھیجی جاتی دونوں مع اپنی رپورٹ کے واپس آ گئے۔

۲۴؍ اگست ۱۹۴۷ء کا دن سخت ترین دن تھا اور اس کے بعد کی رات خوفناک ترین

رات۔ شروع سے بستی کے لیے ایک رفیق عبدالرحمٰن بہاولپوری مامور تھے۔ مضبوط تن وتوش کے ساتھ جرأت وشجاعت بھی رکھتے تھے۔ صبح صبح ایک عورت ان کے سامنے آکر روئی کہ ساتھ چل کر میرا سامان نکلوادیں وہاں سکھّوں کا غلبہ ہے۔ مقرّرہ طریقِ کار پر عمل ہوتا تو یہ معاملہ مولانا کے سامنے جاتا، پھر ضرورت ہوتی تو مجلس میں پیش ہوتا، دو یا تین افراد کی پارٹی ترتیب دی جاتی اور باقاعدہ کارروائی کی جاتی۔ مگر اللہ کو یہی منظور تھا عبدالرحمٰن مرحوم اس عورت کی فریاد سے متأثر ہوکر اس کے ساتھ گاؤں چلے گئے۔ دوپہر کو اُنکی شہادت کی خبر آگئی۔ اس خبر کو اشاعتِ عام سے روکا گیا، تاکہ کم زور دل پناہ گزینوں میں زیادہ گھبراہٹ نہ پھیلے۔ پھر مولانا نے ایک پارٹی ترتیب دی، جس کے ذمّے یہ لگایا کہ وہ ہر حال میں ان کی میّت کو حاصل کرے اور کچھ اور دوستوں کو مامور کیا کہ وہ دارالاسلام کی بستی سے ذرا ہٹ کر بستی ہی کی زمینوں میں قبر کھود کر جنازہ وتدفین کا اہتمام باہر ہی باہر کریں۔

میّت لانے والوں نے بتایا کہ میّت جس جگہ پڑی تھی وہاں زمین پر کش مکش کرنے کے بہت نشانات موجود تھے۔ نشانات سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ عبدالرحمٰن پر حملہ کرنے والے متعدّد افراد تھے جن کے ساتھ عبدالرحمٰن نے شہادت سے پہلے خاصی کشمکش کی۔ عبدالرحمٰن کو جتنے زخم آئے تھے، ان کے متعلق پارٹی نے بتایا کہ سب سر وسینہ پر تھے اور پشت صاف صاف تھی۔ بعد میں ایسی اشتباہ انگیز باتیں سننے میں آئیں جن کا مدّعا یہ تھا کہ خود وہ عورت غلط کردار کی مالک تھی۔ لوگوں کے اندازے یہ تھے کہ ادھر اس نے عبدالرّحمٰن صاحب کو پھانسا اور ساتھ لے گئی اور اُدھر ان کو بستی سے باہر (جائے واردات پر) کھڑا کر کے سکھّوں کو بتانے گئی کہ دارالاسلام کا ایک آدمی مجھے اور میرے سامان کو ساتھ لیجانا چاہتا ہے۔ چنانچہ عورت کے بجائے سکھّ عبدالرحمٰن مرحوم کو مارنے کے لیے باہر آگئے۔ اشتباہ اس لحاظ سے بھی بڑھا کہ وہ عورت پھر اسی گاؤں میں رہ گئی۔ اس عورت کا دھندلا سا نقشہ مجھے بھی یاد آتا ہے اس کے چہرے پر آنسو تھے مگر زیور پہنے ہوئے تھی۔ بعد کے حادثہ نے یہی تصوّر دلایا کہ وہ اچھّی خاصی ایکٹنگ کر رہی تھی۔ اگر میری یہ یادداشتیں غلط ہیں تو خدا مجھے معاف کرے اور ان یادداشتوں کو میرے ذہن سے محو کردے۔ قرائن کے علاوہ

کوئی قطعی شہادتیں تو میرے سامنے نہیں ہیں۔

وہ بھاری رات

اس دردناک واقعہ والے دن کے بعد کی رات بڑی بھاری اور بہت مہیب تھی اندیشۂ غالب یہ تھا کہ جن سکھوں نے شرارت کا آغاز کامیابی سے کیا ہے وہ کوئی اور بڑا قدم بھی اُٹھا سکتے ہیں۔ اس شام کو دفاعی پروگرام کی پوری تفاصیل از سرِ نو طے کی گئیں تمام خواتین اور بچّوں کو مولانا مودودی کے مکان میں جمع کیا گیا جو وسطی مقام پر تھا۔ مولانا نے خواتین سے خطاب کیا اور ان میں جذبۂ جہاد اُبھارتے ہوئے کہا کہ جب تک ہم زندہ ہیں اس وقت تک ان شاء اللہ آپ تک کسی دشمن کی رسائی نہ ہو سکے گی، لیکن اگر ہم کام آجائیں اور ذمّہ داری آپ کے سر آن پڑے تو مٹّی کے تیل کے کنستر جمع کر دیے گئے ہیں ان میں کپڑے کے گولے بھگو بھگو کر آگ لگائیں اور دشمن پر پھینکیں۔ اینٹوں اور... پتھّروں کا ایک ڈھیر چھت پر لگا دیا گیا کہ پہلے اُن سے کام لیں اور ایسی سنگباری کریں کہ کوئی آگے نہ بڑھ سکے۔

ہم نے یہ رات جاگتے ہوئے گزاری، ہر آدمی اپنے مورچے کے ناکے پر چوکس تھا اور آس پاس کی ہر حرکت، گولوں کے دھماکوں اور ہر قسم کی آوازوں پر متوجّہ تھا۔ اللہ کا کرم ہوا کہ خیر و عافیت سے یہ رات گزر گئی اور اُجالا پھیل گیا۔

پرچہ رسانی کا نظام

ضمناً مجھے یاد آیا کہ دفاعی مورچوں اور ناکوں پر ایک کمانڈر کے ساتھ دو چار رفیق ہوتے اور ایک آدمی پرچہ رساں ہوتا، یعنی اگر کوئی قابلِ توجّہ بات سامنے آتی تو کمانڈر پرچہ لکھ کر ہیڈ کوارٹر کو روانہ کرتا۔ پرچہ رساں تیزی سے پرچہ پہنچا کر جواب لاتے۔ ہیڈ کوارٹر کی کمان خود مولانا کے ہاتھ میں تھی اور اُن کے ساتھ بھی معاونین اور پرچہ رساں تھے[1]

[1] مثلاً ۲۳؍اگست کو مغرب کے قریب ایک ناکے سے پرچہ مرکز کو ملا کہ ایک آدمی (صفحۂ آئندہ پر)

اس دور کی دو باتیں بڑی قابلِ توجہ ہیں۔ ایک یہ کہ مولانا نہ خود مغموم اور بددل اور ناامید ہوئے اور نہ یہ کیفیت کسی دوسرے میں پیدا ہونے دی۔ دوسری یہ کہ نئے اور نادیدہ حالات کے لیے فوری طور پر ایک قابلِ عمل سسٹم بنا کر اسے چلا دکھانا بھی ایک ایسی صلاحیت تھی جو مولانا کے کردار کا ایک رُخ تھی۔ ان چیزوں نے رفقا میں یہ اعتماد پیدا کر دیا کہ یہ شخص ہر قسم کے حالات اور مراحل میں اپنے منصبِ قیادت کا حق ادا کر سکتا ہے۔

بال بال بچے

سرنا اسٹیشن پر ایک مسلمان اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر صاحب سرکاری کوارٹر میں رہتے تھے۔ اکثر آتے اور ملتے رہتے۔ پہلے سے ان کو مشورہ دیا جاتا رہا کہ آپ یہاں آجائیں، مگر وہ بعض مُلازمانہ مصالح کے تحت ہچکچاتے رہے۔ آخر وہ وقت آیا کہ خود انھوں نے مولانا سے درخواست کی کہ ان کے گھر کو منتقل کرنے کا انتظام کیا جائے۔ مولانا کے حکم سے ۲۵ر اگست کو سیّد نقی علی صاحب کے ساتھ مجھے اور عبدالرحیم کو اس کام کے لیے بھیجا گیا۔

اسٹیشن پر پہنچے تو ساری جگہ سنسان پڑی تھی۔ پھر یکایک ایک طرف سے ایک شخص نمودار ہوا، دوسری طرف سے دوسرا، حتیٰ کہ اچھّی خاصی تعداد جمع ہوگئی۔ میں برابر ان کے چہروں اور نفسیاتی کیفیّات کا مطالعہ کرتا رہا۔ مجھے یکایک محسوس ہوا کہ ان کی نیّتیں درست نہیں ہیں۔ ان کی باتیں بڑی بناوٹی تھیں؛ وہ ہنستے تھے تو ایکٹنگ کے انداز میں۔ پھر

(باقی حاشیہ صفحۂ گزشتہ کا) بندوق لیے آرہا ہے اور آس پاس کچھ لوگ جھاڑیوں میں دُبکے ہوئے ہیں، اس پر کیا کارروائی کی جائے؟ مولانا کو پہلے سے شاید اطلاع تھی کہ ایک سرکاری ملازم بندوق لیے ہندوؤں کے نرغے سے بچتا بچاتا آنے والا ہے۔ مولانا نے فوراً چند افراد کی پارٹی کو بھجوایا کہ وہ جھاڑیوں میں چھپے ہوئے شرپسندوں پر نگاہ رکھیں اور آنے والے کو بحفاظت لے آئیں۔ خدا نے کامیابی دی۔ اس رات کے لیے ایک بندوق کا اضافہ ہوگیا۔ بعد میں وہ صاحب چودھری نیاز علی خاں صاحب کے قلعہ جمال پور چلے گئے۔

آہستہ آہستہ نقشہ یہ بنا کہ سیّد نقی (مرحوم) کے گرد ہندوؤں اور سکھّوں کا ایک حلقہ سا بننے لگا۔ انداز ایسا تھا جیسے گھیرے میں لیا جارہا ہے۔ سیّد نقی علی (مرحوم) بڑے صاف دل ہونے کے ساتھ ساتھ خاصے "متکلّم"، بھی تھے اور ان کا تحریکی جنون ہم سے زیادہ زور دار تھا۔ وہ ان سے رواں دواں باتیں کررہے تھے۔ پھر جب مجھے خطرے کی بُو صاف محسوس ہونے لگی تو میں نے تھوڑے سے فاصلے سے نقی علی صاحب کو پکار کر کہا کہ جلدی کیجیے ہمیں واپس چل کر وہاں سے ریڑیاں لانی چاہئیں جن کے بغیر سامان نہیں لے جایا جا سکتا۔ پھر میں نے اور عبدالرحیم نے دو قدم چل کر ایک بار اور زور سے آواز دی۔ خدا خدا کر کے وہ وہاں سے ہلے۔ اور لپک کر ہم سے آن ملے۔ اصل میں ہم نے حریف کو یہ امید دلا دی تھی کہ ہم ابھی پھر آنیوالے ہیں۔ وہ لوگ بحث یہ کر رہے تھے کہ اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر صاحب ادھر ہی رہیں گے اور ہماری طرف سے ان کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ یہ بات یکسر جھوٹ تھی۔ وہ ان کو شکار بنانا چاہتے تھے لیکن بعد میں زیادہ بڑی پارٹی بھیجکر ان کے گھر کو منتقل کیا گیا۔ انھیں دنوں ایک سکھ پولیس افسر نے مولانا کے سامنے پیش کش کی کہ اگر آپ چاہیں تو اس جگہ کو کیمپ قرار دیکر سرکاری تحویل میں لے لیا جائے اور آپ کی حفاظت کے لیے پولیس متعیّن کردی جائے۔ مولانا نے اس پیش کش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

میرے ذہن میں یہ الجھن ہے کہ جس پولیس آفیسر کی آمد کا پہلے ذکر کیا گیا تھا، یہ وہی تھا، یا وہ الگ قصہّ تھا۔ (یہ پیش کش شاید اسی سکھ افسر نے کی تھی جس کا ذکر گزشتہ سطور میں کیا گیا ہے۔

ایک نیا منصوبہ

پھر یوں ہوا کہ ایک دن مولانائے محترم نے ایک تجویز پیش کی۔ مولانا برابر معاملات کو سوچتے رہتے اور سوچ کر کسی بات کا فیصلہ کرتے۔ مثلاً تھانیدار کی آمد والے دن، بعد کی کسی گفتگو میں فرمایا کہ ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اب ہم سے اگر کوئی ہتھیار طلب کرتا ہے تو گویا وہ ہمیں نہتّا کر کے بلوائیوں سے مروانا چاہتا ہے، لہٰذا یہ طے ہے کہ ہم ہتھیار نہیں دیں گے۔

اگر کوئی زبردستی حاصل کرنا چاہے گا تو پہلے اسی کو نشانہ بنائیں گے۔ اسی طرح ایک دن انھوں نے یہ تجویز بڑے عزم کے ساتھ پیش کی کہ اب جبکہ چاروں طرف کی آبادیاں بلکہ اضلاع تک مسلمانوں سے خالی ہو رہے ہیں، ہم ایک جزیرہ بن کر یہاں نہیں رہ سکتے۔ لہٰذا میرا پروگرام اب یہ ہے کہ تمام پناہ گزینوں سمیت ایک قافلہ بنا کر یہاں سے مارچ کرایا جائے اور پھر جو جو اور قافلے ساتھ ملتے چلے جائیں ان کو بھی شریک کیا جائے اور اگر کوئی قوت مزاحم ہو تو اس سے جذبۂ جہاد سے لڑا جائے۔ اس تجویز کو بیان کرتے وقت مولانا کے اندر سے وہ جرنیل بول رہا تھا جس کی نشو و نما الجہاد فی الاسلام کی تالیف و تدوین کے دوران میں ہوئی تھی۔

پاکستانی نوائے

۲۵ اگست کو پچھلے پہر اچانک ریلوے پھاٹک کے نیچے سے پاکستان کی فوجی گاڑیاں دارالاسلام کی طرف بڑھیں۔ سب لوگ دیکھنے لگے کہ یہ کیا سلسلہ ہے۔ انکے ساتھ دو بسیں تھیں، یا ٹرک! ایک کو انھوں نے دارالاسلام میں چھوڑا اور تاکید کی کہ جن لوگوں کو بھیجنا ہو ان کو جلد سے جلد تیار کرا دیں، کیوں کہ ہمیں فوراً واپس جانا ہے۔ ہماری "کونسل" میں فیصلہ ہوا کہ فی الحال صرف عورتوں اور بچّوں کا قافلہ جائے گا اور ان کے ساتھ اشد ضروری قسم کی اشیاء۔ چنانچہ قافلۂ نسواں کو جلد جلد تیّار کرایا گیا اور یہ لوگ مغرب سے پہلے روانہ ہو گئے۔ اور رات کو پہلے لاہور جا پہنچے۔ اس طرح چودھری نیاز علی خاں صاحب کی اقامت گاہ سے بھی جن لوگوں کو بھیجا جانا تھا وہ بھی چلے گئے۔ اب دارالاسلام کی دفاعی فورس پہلے سے مضبوط ہو گئی تھی۔ کیوں کہ گھروں کی کوئی ذمّہ داری باقی نہ تھی، ہر ایک کا معاملہ جان ہی جان تک محدود تھا۔ ۲۹ اگست کو جمعہ تھا۔ صلوٰۃ الخوف ادا کی گئی اور اس نماز کی نوعیّت اور معنویت سمجھ میں آئی۔

کہانی کا آخری باب

اُدھر دارالاسلام سے عبدالجبّار غازی مرحوم نئی صورتِ حال سے پہلے پٹنہ کی تربیّت گاہ کو چلانے کے لیے بہار جا چکے

تھے۔ حالات بگڑے تو وہ کسی نہ کسی طرح لاہور پہنچ گئے۔ وہاں سرکاری اور فوجی حلقوں میں نفوذ کر کے انھوں نے دارالاسلام کے لیے بسوں کا اور لوائے کا انتظام کرایا اس کوشش میں بڑا حصّہ چودھری محمد علی مرحوم کا تھا۔ ۳۰ اگست کو[1] مولانا مودودیؒ خود اور ان کے ساتھ بعض رفقار لاہور[2] کے لیے روانہ ہوئے۔ انھوں نے اپنے پیچھے راجہ احسان الحق کے ساتھ تین چار رفقار کا ایک گروپ اس لیے چھوڑا کہ مناسب انتظام ہونے تک وہ موجود رہیں۔ پھر عملاً یہ ہوا کہ دارالاسلام کو سرکاری کیمپ بنا دیا گیا اور ادھر کوششیں کر کے اسپیشل ٹرین بھجوائی گئی جو کیمپ کی پوری آبادی کو مع ہمارے رفقار کے پاکستان لائی۔ جہاں تک اس وقت کی اطلاعات کی یادداشت کا تعلّق ہے، میرا خیال ہے کہ تمام لوگ صحیح سلامت پاکستان آگئے اور شاید گاڑی پر سوار یہ قافلہ خال خال مستثنیٰ قافلوں میں سے تھا جو ہر قسم کے حملۂ دشمناں سے بچ کر آگیا۔

تمام لوگوں کا بیشتر سامان وہیں رہا، دینی کتابوں کی ضروری تعداد بچائی جا سکی، مگر پھر بھی خاصی کتابیں اور کاغذات اور فائل پیچھے رہ گئے۔ ان چیزوں کو راجہ احسان الحق صاحب نے روانگی سے قبل دارالاسلام کے کنویں میں ڈلوا دیا تاکہ دشمن کے ہتّھے نہ چڑھیں اور کسی دینی نوشتے کی توہین نہ ہو۔

تجربۂ مہاجرت

اپنا حال دلچسپ ہے۔ میں شروع سے غریبانہ زندگی رکھتا تھا۔ ہجرت سے مہینہ سوا مہینہ قبل بچّوں کے لیے کوئی ایک سو گز چھپا ہوا کھدّر (جس کا رواج تھا) لے گیا تھا اور سب کے کپڑے بنے تھے۔ یہ وہیں رہے۔ کچھ کپڑے جو دُھلنے کو دھوبی لے گیا تھا وہ پھر واپس نہ آسکے۔ چارپائیاں، بستر سب چھوڑے۔ دارالاسلام میں قمرالدین خاں صاحب کا جہیز کے ساتھ آیا ہوا فرنیچر برائے فروخت پڑا تھا۔ اس کا نصف حصّہ تقریباً اڑھائی صد روپیہ میں (اور ذرا اس وقت کے اڑھائی صد کی مالیت کا اندازہ کیجیے) خریدا۔ اس طرح گھر باقاعدہ گھر بنا۔ وہ بھی کچھ مقامی بھارتیوں کے لیے اور کچھ شرنارتھیوں کے لیے چھوڑا۔ بعد میں معلوم

---

[1] صبح ۸ بجے۔ [2] کیمپ کی ذمّہ داری سنبھالنے کے لیے راجہ احسان الحق صاحب، اعظم ہاشمی اور محمد حامد صاحب وہاں رہے۔

ہوا کہ ایک ہاتھ لوگوں کے اچھے اچھے فرنیچر پر تھانیدار صاحب نے مارا۔ پھر آگے جس کے ہاتھ جو آیا ہوگا، تقسیم ہوتی رہی ہوگی۔

یہ میں نے اس لیے لکھا ہے کہ نہ جاننے والوں کو اندازہ رہے کہ ہم لوگ بھی پوری طرح مہاجر بن کے آئے اور بے سروسامانی سے زندگی کے نئے دور کا آغاز کیا، جبکہ نہ الاٹ منٹوں کا سلسلہ تھا، نہ لوٹ مار کے اموال کا، لیکن خدا نے اپنی نوازشوں سے مسلسل بہرہ مند کیا۔

فانی دنیوی زندگی کے متعلّق یہ بہترین تجربہ ہے کہ وہ چیزیں جس میں سے ایک ایک کے لیے انسان لڑتا جھگڑتا ہے اور اکثر لوگ تو ناجائز طور پر مال ہتھیانے میں لگے رہتے ہیں، موت کے وقت صحیح پیمانے پر تجربہ پیش آئے گا کہ سب کچھ چھوٹ جائے گا اور صرف ایمان و کردار باقی رہے گا۔

سفر بسوئے پاکستان

پٹھان کوٹ سے جس بس یا ٹرک میں آنا ہوا، اس میں مولانائے محترم کے علاوہ مشہور جرمن نومسلم علاّمہ اسد بھی ہمارے ہم سفر تھے۔ صرف اسد صاحب ہی ایک ایسے شخص تھے جن کے پاس سگریٹ تھے۔ حافظ عطاء الرحمٰن سے دیرینہ بے تکلّفی کی بنا پر انھوں نے حافظ صاحب کو شریکِ "تدخین" رکھا۔ مگر اپنا یہ حال کہ روانگی سے پہلے ہی تمباکو کا فاقہ چل رہا تھا

"اُڑنے سے پیشتر ہی مرا رنگ زرد تھا" ——— اور اب اعصاب شکن سفر جس کا ماحول بہر حال خوف کا ماحول تھا، تمباکو کی پیاس کو بڑھا رہا تھا، مگر اپنی روش یہ رہی کہ نہ کبھی حُقّے کے لیے منّت کشی کی، نہ سگریٹ کا کسی سے سوال کیا۔ وقت تھا کہ گزر گیا۔

راستے بھر میں فوجی محافظین گاڑیوں پر سوار کبھی آگے سے پیچھے کو آتے اور کبھی پیچھے سے چکّر لگا کر آگے ہو جاتے، دائیں جانب کی بھی نگرانی کرتے اور بائیں جانب کی بھی اس موقع پر پورے مسلمان مہاجرین کے لیے جس بے جگری اور جاں فشانی سے ہمارے فوجی جوانوں نے خدمات انجام دی ہیں، اس کا اعتراف دلوں سے کبھی نہیں مٹ سکتا۔

سڑک کے اردگرد جگہ جگہ لاشیں پڑی دکھائی دیتیں، کہیں سکھ گھوڑیوں پر سوار برچھیاں کاندھوں پر لیے ہوئے کوئی صندوق یا گٹھڑی لے جاتے دکھائی دیتے، یہ گویا ہم ہی لُٹ رہے تھے ——— اور کئی دنوں سے قتل وغارت اور لوٹ مار کا سلسلہ جاری تھا بلکہ بعد میں بھی جاری رہا۔

امرتسر شہر میں سے جب ہماری گاڑی گزر رہی تھی تو مراد علی شاہ صاحب کی توجہ دلانے پر یہ منظر دیکھا کہ ایک بالاخانے کی کھڑکی سے ایک سکھ نوجوان رائفل آگے بڑھائے ہماری گاڑی پر فائر کرنا چاہتا ہے اور پیچھے اس کا کوئی بھائی یا باپ اس کی رائفل کو کھینچنے اور اُسے بار بار نشانے سے ہٹانے کی کوشش کر رہا ہے۔ ظاہر تھا کہ اگر خدا نخواستہ کوئی فائر ہو جاتا تو پاکستان کے فوجی جوان بھی سٹین گنوں یا مشین گنوں کے دہانے کھول دیتے، لیکن بہرحال یہ اللہ کا کرم ہوا کہ کوئی ناخوشگوار بات نہیں ہوئی۔

آخر جب ہملوگ پاکستان کی سرحد میں داخل ہوئے تو واقعی یہی احساس تھا کہ ایک جہنّم سے نکل کر چمن زارِ حیات میں داخل ہو رہے ہیں۔

ہماری عارضی فرودگاہ گوالمنڈی کی ایک متروکہ عمارت تھی، جہاں خواتین اور بچّے پہلے سے جمع تھے۔ ہندو جائنٹ فیملی سسٹم کے مطابق یہ ایک بڑا دو منزلہ گھر تھا۔ اس میں بڑا سامان ہوگا۔ مگر لُٹ چکا تھا۔ بڑی بڑی پیٹیاں تھیں جو خالی پڑی تھیں، سیف ٹوٹا پڑا تھا۔ اس میں دو ایک دن ہم نے گزارے۔

سوہن لال کالج

اس دوران میں کچھ اصحاب نے تگ و دو کی اور دارالاسلام کے ادارے کے جواب میں سوہن لال کالج کی عمارت الاٹ کرائی۔ یہ واحد الاٹ منٹ تھی جس کے تلخ تجربے کے بعد مولانا مودودیؒ نے اصولاً یہ طے کر دیا کہ کوئی الاٹ منٹ نہ کرائی جائے اور یہ فیصلہ ہمارے لیے ہزار جھمیلوں سے بچنے کا ذریعہ بنا۔

سوہن لال کالج میں ہم اور ہمارے اہل وعیال صرف چند روز رہ سکے۔ مجھے اور

نقی علی صاحب کو وہ دومنزلہ کوارٹر الاٹ ہوا جو لیک روڈ پر کھلنے والے شمالی گیٹ سے متصل تھا۔ نچلی منزل ان کو ملی اور اوپر کی مجھے۔ اس وقت کے معیار کے لحاظ سے عمارت بہت نفیس تھی۔ اگرچہ ہم معمولی درجے کے کوارٹر میں تھے، مگر سب کچھ پختہ اور صاف ستھرا اور خوبی سے ڈیزائن کیا ہوا تھا۔

انہی دنوں مدرسۃ البنات جالندھر کے مولانا عبدالحق مرحوم اور ان کے کچھ افراد آئے اور مشکل حالات میں تھوڑا سا تعاون چاہا، یعنی جب تک مدرسہ کے لیے کوئی جگہ الاٹ ہوتی ہے ان کو وہاں ٹھہرنے کی گنجائش دی جائے۔ مولانا نے بڑی خوشی سے دروازے کھول دیے، مگر کچھ ہی دنوں میں یہی کالج مدرسۃ البنات کو الاٹ کر دیا گیا اور ہمیں آرڈر دیا گیا کہ ۴۸ گھنٹے میں عمارت خالی کر دی جائے۔ اس پر مولانا نے احتجاجاً یہ فیصلہ کیا کہ ۴۸ کے بجائے ۲۴ گھنٹوں میں اسے خالی کر دیا جائے اور آئندہ کبھی کوئی الاٹ منٹ نہ کرائی جائے کیوں کہ اس طرح رگ جاں تو وزارتوں اور بیوروکریسی کے پنجے ہی میں رہے گی۔

ایک یادگار واقعہ

اس زمانے کا ایک یادگار واقعہ یہ ہے کہ سوہن لال کالج کے سامنے واقع یونیورسٹی گراؤنڈ میں قائد اعظم کی تقریر ہوئی۔ حاضری بہت زور کی تھی۔ پورا گراؤنڈ بھرا ہوا تھا، سڑک پر گاڑیوں کی قطاریں تھیں۔ اس جلسے کے لیے میرے والا کوارٹر تو گویا خاص طور پر وزیٹرس گیلری ثابت ہوا۔ پورا جلسہ آنکھوں کے سامنے تھا اور قائد اعظم اسٹیج سے تقریر کر رہے تھے۔ لاؤڈ اسپیکر آواز پہنچا رہے تھے۔ یہ اوائل ستمبر کا زمانہ تھا۔

جماعت کا نیا میدانِ کار

آگے کی بات بیان کرنے سے قبل ایک واقعہ اور قصہ!

سوہن لال کالج کے زمانے میں ایک طرف تو مولانا نے نواب ممدوٹ صاحب سے مل کر کہا کہ اب وقت ہے کہ آپ حضرات فوجی قوت سے کٹھوعہ روڈ کاٹ دیں، ورنہ کشمیر

ہاتھ سے جاتا رہے گا، لیکن ایسا نہ ہو سکا۔

دوسری طرف مولانا نے جماعتِ لاہور کا اجتماع طلب کیا اور اس میں خطاب کرتے ہوئے کہا کہ یہاں ہم آرام کرنے نہیں آئے ہیں، اور نہ اس وقت دعوتی کام اس نہج اور رفتار سے ہو سکتا ہے جس سے اب تک ہوتا رہا ہے۔ اس وقت مصیبت زدہ مہاجرین سب سے زیادہ قابلِ توجہ" مسئلہ ہیں۔ اس کام کا نقشہ طے ہوا۔ دو پارٹیاں والٹن کیمپ اور باولی کیمپ کے حالات کا جائزہ لینے کے لیے مقرر کی گئیں۔ پھر دونوں جگہوں کے لیے ٹیمیں بنا کر خدمتِ مہاجرین کا کام ان کے سپرد کیا گیا۔ کھانا اور کمبل تقسیم کرنے سے لے کر علاج معالجے تک بلکہ مرنے والوں کی تجہیز و تکفین تک کے سارے کام کارکنانِ جماعت کی مختصر پارٹیاں انجام دیتیں۔ ان کی ڈیوٹیاں بدلتی رہتیں۔ اس گروہ کے کام کے پہلو واضح تھے: ایک یہ کہ اس میں اپنے لیے فائدے اٹھانے والا کوئی نہ تھا بلکہ اپنے خرچ پر آتے اور اپنا کھاتے اور کام کرتے۔ دوسرے یہ لوگ تقسیم ہونے والی اشیاء کو کسی بھیڑ میں شور ہنگامے کے ساتھ تقسیم کرنے کے بجائے، پہلے مہاجرین میں گھوم پھر کر ہر ایک کی ضرورت کو نوٹ کرتے، اس کے نام کی پرچی جاری کرتے اور ایک مرکز سے غذائی یا استعمالی سامان تقسیم کرتے، بصورتِ دیگر خود مہاجر ڈیرے یا فرد تک جا کر اسے اس کا حق پہنچا دیتے۔ افراتفری کے بجائے یہ منظّم کام تھا۔

خدمت۔ پارٹیوں کا ایک حصّہ وہ تھا جو سیدھا واہگہ بارڈر پر پہنچتا۔ وہاں پاکستان آنے والے مسلمانوں کو پانی پلانے، ان کے کھانے کے انتظامات میں مدد دینے اور ان میں سے جو بیمار ہو کر پہنچتے ان کا علاج کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی جاتی۔ مجھے یاد ہے کہ حکیم شیر محمّد مرحوم نے بحیثیتِ معالج اس محاذ پر فرض انجام دیا تھا۔[1]

---

[1] حکیم شیر محمد صاحب (مرحوم) کی ایک بات مجھے یاد ہے جسے میں یہاں نوٹ کر دینا چاہتا ہوں۔ وہ فرماتے تھے کہ ہیضے کے مریضوں کا بہت ہی کامیاب علاج یہ زیرِ تجربہ آیا کہ سالم سرخ مرچ کڑوے تیل میں بھگو کر نگلوا دی جاتی۔ عموماً ایک ہی خوراک میں آرام ہو جاتا۔ تفصیل مجھے یاد نہیں۔ اگر جدید ڈاکٹر صاحبان اس پر تحقیق کریں تو اچھّا ہو۔

بعض لوگ ساتھیوں کی لاشیں ساتھ لاتے اور بعض مہاجر بارڈر پار کرنے کے بعد جاں بحق ہو جاتے۔ ان کی تجہیز و تکفین کا انتظام بھی کیا جاتا۔

ہر گروپ کی رپورٹیں مسلسل مولانا کو موصول ہوتیں اور ان پر غور و خوض کر کے راہِ عمل طے کی جاتی۔ ان رپورٹوں میں ایسی شکایات کا بھی ذکر ہوتا کہ دودھ یا دوسری غذائی اشیا، وہاں کام کرنے والے سرکاری کارکن خود اپنے لیے بہ حصّۂ وافر حاصل کرتے ہیں۔ نیز کارکنوں نے ایسے مناظر بھی دیکھے کہ شہر کے لوگ مہاجر لڑکیوں کو جا جا کر گھورتے۔

بعد میں لاہور سے باہر کے کارکنان کو بھی بلا کر اس خدمت میں لگایا گیا۔ اس کام کے کرنے سے نہ صرف کارکنانِ جماعت میں وقت کے تقاضوں کے مطابق کام کرنے کا شعور پیدا ہوا، بلکہ ان کے کردار کی نشو و نما ہوئی۔

آپ خیال کریں کہ ہیضے سے مرنے والوں کی لاشوں کے قریب تک لوگ نہیں جاتے تھے، ایسے میں ان کو اٹھوانا، سنبھالنا اور تجہیز و تکفین کرنا کوئی معمولی کام نہ تھا۔ سچّی خدا پرستی اور اسلامی اُخوّت اور انسان دوستی کے بغیر اسے انجام نہیں دیا جا سکتا تھا۔

متوازی طور پر خدمت کا ایک دوسرا کام بھی شروع کر دیا گیا۔ اس زمانے میں لاہور شہر میں غلاظت کے جا بجا انبار لگے تھے۔ خاک روب غائب ہو گئے تھے۔ کارپوریشن کا نظام معطّل تھا۔ عوام میں شہریّت کا پختہ شعور موجود نہیں تھا (اور نہ اب ہے) اس لیے طے پایا کہ دو ایک پارٹیاں شہر کے مختلف حصّوں سے گندگی ہٹانے کا کام کریں۔ کدالیں آہنی تسلے اور ٹوکریاں حاصل کی گئیں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک گروپ وہ تھا جس کی ڈیوٹی غالباً عبدالجبّار غازی صاحب کی سرکردگی میں اندرون موچی دروازہ کے کسی علاقے میں لگی تھی۔ اس گروپ میں شمولیّت کی تھوڑی سی سعادت مجھے بھی ملی۔ کچھ لوگ کدالیں لیے گندگی اور کوڑے سے تسلے یا بالٹیاں بھرتے، کچھ اٹھا کر آگے لے جاتے، کچھ انھیں مناسب گڑھے میں پھینک کر خالی تسلے واپس کر دیتے۔

لوگ جو گزرتے وہ تماشا دیکھ کر حیران ہوتے کہ صاف ستھرے لباسوں میں (اور غالباً غازی صاحب شیروانی بھی پہنے ہوئے تھے) پڑھے لکھے لوگ عجیب کام میں لگے ہیں۔ کچھ

لوگ ریمارک پاس کرتے کہ انھوں نے کارپوریشن کے ساتھ کوئی ٹھیکہ وغیرہ کیا ہوگا؟ کچھ کہتے کہ کوئی بڑا پُراسرار کھیل ہے، کچھ تحسین کے کلمات کہتے اور اِکّا دُکّا افراد ایسے بھی نکلے جو کام میں شریک ہوگئے۔

اس تجربے کی روشنی میں میں یہ کہتا ہوں کہ دعوتی لحاظ سے نہ صرف اس طرح کے کام رابطۂ عوام کا نہایت موزوں ذریعہ ہوسکتے ہیں، بلکہ دعوتِ حق اس قسم کی محسوس مگر بے لوث خدمات کے ساتھ سامنے آتی ہے تو اس کا اثر بڑھ جاتا ہے۔

خیمہ بستی

سوہن لال کالج کو چھوڑ کر ہم لوگ اسلامیہ پارک جا پہنچے، اس زمانے میں ڈاکٹر ریاض قدیر صاحب کے مکان کے قریب ایک خالی میدانی قطعۂ زمین تھا۔ اس میں خیمے لگوائے گئے درمیان میں ایک بڑے خیمے میں مولانا اور قیّم جماعت کے دفاتر وغیرہ تھے۔ زمانہ برسات کا تھا۔ ایک مرتبہ زور کی بارش ہوئی، خیموں کے اندر بھی پانی بھر گیا۔ خواتین اور بچّوں کو ساتھ ہی ایک مستری صاحب کے مکان میں منتقل کیا گیا۔ بعد میں جو راتیں بھی وہاں گزاریں، کم سے کم مجھے یہ محسوس ہوا کہ فرش پر لیٹے ہوئے ہڈیوں کے دُکھنے کے ساتھ ٹھنڈی سیلن بدن پر حملہ آور ہے۔ مجھے شدید سردی لگتی۔ میری اہلیہ بچّوں کو کپڑوں میں لپیٹنے کے علاوہ مجھے بھی بطورِ خاص کھیس وغیرہ فراہم کرتیں[۱]

اس بستی کے دورانِ قیام کا یہ منظر نہیں بھولتا کہ ہمارے سامنے ہی آدھے فرلانگ یا کم فاصلے پر مہاجرین کی لاشوں کے بھرے ہوئے ٹرک آتے، ان لاشوں کو زمین پر ڈالا جاتا اور اُوپر سے مزدور ٹیلے کھود کھود کر کافی مٹی گرا دیتے۔ اس منظر کو دیکھ کر طبیعت بہت

---

[۱] واضح رہے کہ لاہور آنے کے کچھ ہی بعد اس طرف کے رفقا نے اپنی طرف سے ہماری ضروریات پوری کرنے کے لیے بہت کچھ کیا۔ جلد ہی ہمیں ایک ایک دو دو بستر اور کھیس وغیرہ مل گئے۔ مگر ٹھنڈی سیلن توشک کو بھی عبور کر آتی تھی۔

خراب ہوتی۔ تحریکِ پاکستان کے لیے کام کرنے والوں کی قربانیوں کی یہ ایک چھوٹی سی جھلک کپکپی طاری کر دیتی تھی۔ ان قربانیوں ہی نے پاکستان کی قدر و قیمت بڑھائی اور ہر کسی سے منوائی۔ ظاہر ہے کہ اتنی بڑی قیمت دے کر جو کچھ حاصل کیا گیا ہے اس کا نقصان بقائمیِ ہوش و حواس گوارا نہیں کر سکتا۔[1]

خیمہ بستی کے زمانے میں مہاجرین کی خدمت کا کام جاری رہا۔ فی سبیل اللہ کام کرنے کے اس جذبے نے کسی کو یہ مہلت ہی نہ دی کہ وہ ذاتی مشکلات کی طرف توجّہ کر سکے اور مفاد حاصل کرنے کی کشمکش کے میدان میں اُترنے کا خیال بھی دل میں لائے۔ یہ کام اس وقت تک جاری رہا جب تک مہاجرین کے قافلے آتے رہے اور کیمپوں میں ہجوم رہا۔ بعد میں جب کام قدرے سمٹ گیا تو سرکاری عملے نے پوری طرح اسے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ یوں بھی کچھ اچّھا نہ لگتا تھا کہ ایسے لوگ ان کے ساتھ کام کریں جن کا احساس وجود ان کے "حسبِ منشا" کام چلانے میں حائل ہو جاتا ہو۔

خیمہ بستی میں اگرچہ ڈاکٹر ریاض قدیر ان کے برادرِ بزرگ اور پڑوس کے مستری صاحب کے علاوہ محلے کے تمام شریف گھرانوں کا تعاون حاصل تھا۔ مگر ستمبر کی بارشیں جن کے ساتھ ٹھنڈی ہواؤں کے جھکڑّ ہوتے، ان کی وجہ سے خیموں میں راتیں گزارنا آسان نہ تھا۔

---

[1] مدّعا یہ کہ پاکستان کا نقصان جہاں یہ ہے کہ اس کی ایک اِنچ زمین بھی خدانخواستہ ہمارے ہاتھوں سے جائے یا اس کی وحدت و سالمیّت پر آنچ آئے، وہاں پاکستان کے مقصدِ وجود کے لحاظ سے یہ بھی بڑی تباہی ہے کہ اسے اس کی نظریاتی بنیادوں سے اُکھیڑ دیا جائے اور اس پر کوئی غیر اسلامی نظام مسلّط کر دیا جائے۔ اسی طرح پاکستان کے اندر اس کے کسی باشندے کا ظلم کا شکار ہونا یا خوف میں گرفتار ہونا بھی پاکستان کا نقصان ہے۔ اسی لیے ہم لوگوں نے اپنی بنیادِ فکر یہ اختیار کی کہ یہ خطّۂ زمین ایک وقف مسجد کی طرح ہے اور اس کے وجود اور حرُمت کا تحفّظ ہم پر فرض ہے۔ اس کے اندر اگر اقامتِ صلوٰۃ کے بجائے لہو و لعب کے ہنگامے ہونے لگیں تو انھیں روکنا اور معاملات کو صحیح راستے پر ڈالنا بھی ہر محبّ پاکستان کا فرض ہے۔ اس کے ساتھ یہ تصوّر بھی اُبھرتا ہے کہ پاکستان کے باشندوں کا اسلامی اور اور انسانی حقوق سے محروم ہو کر جبریّت کا شکار ہو جانا مقصدِ پاکستان اور منشائے آزادی کے خلاف ہے۔

آخر تگ و دو کر کے کرائے کی ایک کوٹھی اچھرہ میں حاصل کی گئی جو ۵۔ اے ذیلدار پارک کے نام سے تاریخ کا ایک باب بن گئی۔

شروع میں سارے گھروں کے لیے کرایوں کے مکانوں کا انتظام مشکل تھا، لہٰذا ایک گروپ کو راولپنڈی میں ذیلی مرکز قائم کرنے کے لیے بھیجا گیا۔ جس میں مولانا امین احسن اصلاحی مولانا مسعود عالم ندوی (مرحوم) اور عبدالجبار غازی صاحب کے علاوہ بھی دو تین ساتھی تھے۔ مجھے ذاتی طور پر مشکل پیش آئی، کیوں کہ ایک تو میرے پاس کوئی کام نہ تھا۔ نہ جماعت کا اور نہ جریدہ نگاری کا۔ تمام نظام درہم برہم تھا اس لیے میں نے اپنا بار یوں ہلکا کیا کہ اہل و عیال کو غالباً پنڈی جانے والے گروپ کے ساتھ ہی اپنے قریبی عزیزوں کے ہاں بھجوا دیا۔ انھوں نے کئی دن مختلف گھروں میں اور مختلف مقامات پر گھومتے گھماتے اور ملتے ملاتے گزارے۔ اقربا میں قرابت داری کا جذبہ بھی موجود تھا اور پھر یہ تو لٹا پٹا مہاجر قافلہ تھا۔ بہت اچھا سلوک کیا گیا۔ ادھر میں اس تگ و دو میں لگ گیا کہ کام کی سبیل بنے۔ آخر ملک نصراللہ خاں (مرحوم) کا اخبار جس سے میرا قلمی رابطہ مسلسل چلا آرہا تھا، بحال ہوا تو انھوں نے مجھے ساتھ لے لیا۔ اب مکان کی تلاش شروع ہوئی۔ کرایہ ادا کرنے کے لیے آمدنی کافی نہ تھی۔ سوچا کہ کچھ عرصے کے لیے الاٹ منٹ کی کوئی جائز صورت نکالی جائے، کیونکہ میری تعبیر کے مطابق بہ ظاہر الاٹ منٹ کرانے پر جماعتی پابندی افراد کے لیے نہیں تھی۔ پوچھتے پاچھتے معلوم ہوا کہ ایک پکّے مسلم لیگی الاٹ منٹ افسر کنور شفیق اللہ صاحب کا دفتر پاس ہی ہے جو جماعت کے لوگوں کے لیے مسلم لیگیوں والا تلخ نقطۂ نظر نہیں رکھتے بلکہ اچھّی رائے رکھتے ہیں۔ ان کے پاس پہنچا۔ میں نے کہا کہ کوئی خالی مکان ہو تو الاٹ کر دیجیے۔ انھوں نے فرمایا کہ دفتر کے قابو سے تمام معاملہ باہر ہے۔ ہم کسی خالی مکان کا پتا نہیں بتا سکتے، آپ کوئی خالی مکان تلاش کر کے اس پر قبضہ کریں اور چِٹ حاصل کریں۔ میں اس کشمکش کا آدمی تھا نہیں۔ میں نے خیال چھوڑ دیا۔ آج میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس چکّر سے بچ نکلا، ورنہ بعد میں مشکلات پیش آتیں۔ اس طرح کی ہر آزمائش (جس کی جائز صورتیں بھی تھیں) سے اپنے دامن کو اب پاک دیکھ کر بڑا اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ اس زمانے میں میں جماعت کے

مہمان خانے میں رہا۔

کچھ ہفتوں بعد ذیلدار پارک ہی میں بڑے مہنگے کرائے پر سر چھپانے کی ایک جگہ ملی تو میں نے اہل وعیال کو بلوا لیا۔ پھر آہستہ آہستہ دوسرے رفقا نے بھی آس پاس کے علاقوں میں مکان کرائے پر لے لیے۔ اسی دوران میں ایک موقع پیدا ہوا کہ میاں طفیل محمد صاحب اور عبدالوحید خاں صاحب کے ساتھ میرا گھر بھی "۱۲۔ شاہ جمال" میں جا آباد ہوا۔ یہاں ہمارا خاصا دور گزرا، تقریباً دس سال۔ یہیں سے ۱۹۵۳ء میں میاں صاحب، عبدالوحید خاں صاحب اور میری گرفتاری عمل میں آئی۔

اِچھرہ میں نئی پھیلی ہوئی بستی

آہستہ آہستہ اندرونِ اِچھرہ ذیلدار پارک، شاہ جمال اور ملحقہ علاقوں میں مختلف رفقاء اور ہمدرد جمع ہو گئے۔ ایک اجتماعی ماحول پیدا ہو گیا۔ ۵۔ اے ذیلدار پارک میں درس بھی ہونے لگا اور حکومت نے جو جہادِ کشمیر ہمارے خلاف لڑا اُسے ہم نے یہاں کی اجتماعیّت کے بل پر بخوبی بھگتا۔ اپنے اوپر آنے والے وار ہم نے حریف قوّت پر الٹ دیے۔ اِچھرہ میں مختلف معزّز لوگوں اور دکانداروں سے ہمارے مراسم بڑھتے گئے اور بحیثیّت مجموعی لوگ ہماری عزّت کرتے۔ مخالفت کے بڑے بڑے ہنگامے اُٹھتے اور گالیوں کے طوفان آتے، مگر کچھ عرصہ زور دکھا کر سروں سے گزر جاتے۔ مسجد رسول پورہ میں مولانا مودودی رحمۃ اللہ تعالیٰ نمازیں ادا کرتے جہاں مخالفت کا ایک بڑا اڈّا تھا۔ مرحوم ملک میراں بخش[1] (خدا انھیں معاف کرے) اور مولوی طارق صاحب خاص طور پر

---

[1] ملک میراں بخش کی وفات پر ہمیں واقعی رنج ہوا اور ہم ان کے جنازے میں شریک ہوئے۔ نہ صرف اس وجہ سے کہ ایک دلچسپ سلسلۂ نوازشات رُک گیا بلکہ اس لیے بھی کہ ان کی مخالفانہ باتیں بزرگانہ بھولپن کی آئینہ دار تھیں۔ میرا اب بھی یہ خیال ہے کہ وہ اپنے خاص احساسات کے چکّر میں اس طرح آ گئے تھے کہ کسی گہری ٹھنڈی سوچ بچار کا تو کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ بس یوں

(صفحۂ آئندہ پر)

بہت تنگ و ترش ہوتے اور مولانا اور جماعت کے خلاف چہ می گوئیاں کیا کرتے اور پھر ان کی باتیں وعظ و درس میں منعکس ہوتی رہتیں۔ خاص طور پر ملک صاحب بعد نماز کی دعا کے وقت بطور خاص امام وخطیب سے بآوازِ بلند کہتے کہ غدّاروں کے خلاف دعا کریں۔ اور ان کا اشارہ جلی طور پر ہماری طرف ہوتا، مگر عام نمازیوں میں ہمارے ہمدردوں کی تعداد خاصی بڑھی۔

اس طرح مولوی محمد عمر اچھروی (مرحوم) لاہور کے باہر بھی جا بجا ہمارے خلاف زبردست مواعظ اور تقاریر کرتے پھرتے، انہی کا مقولہ ہے کہ ان لوگوں کو دو دو لاکھ روپے کے منی آرڈر بھارت سے آتے ہیں۔ ایک بار انھوں نے اِچھرہ کے مین بازار کے سرے پر جلسہ کیا اور تقریر میں لوگوں کو اُکسایا کہ یہ لوگ جو تبلیغ کے لیے آتے ہیں ان کی بات نہ سنیں۔ ان کی خواتین کو دھکّے دے کر نکال دیں۔ یہ باتیں ایک دینی آدمی کے شایانِ شان نہ تھیں، چنانچہ ان کا اثر بھی کچھ زیادہ نہیں ہوا، بلکہ وعظ کے بعد ہم نے ان کی مغالطہ انگیزیوں کے جواب میں خاص خاص پمفلٹ لوگوں میں تقسیم کیے، جنھیں پڑھ کر عوام نے محسوس کیا کہ وعظ میں غلط تصویر پیش کی گئی ہے۔ اس طرح کی ہر مخالفانہ کوشش کے نتیجے میں کام کا میدان پیدا ہو جاتا اور ہم سہم کر بیٹھ رہنے کے بجائے لوگوں میں جا جا کر اور زیادہ دعوت پھیلاتے۔

۵۔ اے ذیلدار پارک میں درسِ عصر کے بعد محفل لگنے کا سلسلہ اُسی زمانے میں شروع ہوا۔ یہ ایک نئی طرز کا تجربہ تھا اور خوب کامیاب رہا۔ کسی آدمی کا ہر روز قسم قسم کے مخالف و موافق آدمیوں کے درمیان بیٹھنا اور ان کے رنگارنگ سوالات کے فی البدیہہ جواب دینا کوئی آسان چیز نہیں ہے۔ سوالات دینی، فقہی بھی اور سیاسی و معاشی بھی، نیز ذاتی قسم کے مسائل سے متعلق بھی۔ ساتھ ہی مخالفین کی نکتہ طرازیوں کا تذکرہ بھی۔ یہ محفل ایک ایسی کسوٹی تھی کہ اگر کوئی کھوٹا یا کم زور آدمی ہوتا تو چار دن میں ٹاٹ لپیٹ لیتا۔ یہ محفل خود مولانا کی

(باقی حاشیہ صفحۂ گزشتہ کا)

معلوم ہوتا تھا کہ ایک ریکارڈ بج رہا ہے اور اس کی سوئی ایک جگہ پھنس گئی ہے۔ چوں کہ ان کا ذہن شر پسندانہ نہیں تھا، اس لیے ہمیں ان کی باتوں پر غصّہ نہیں آتا تھا۔ بعض دوسرے اصحاب کا رویہ مختلف تھا۔

عظمت کی ایک دلیل ہے۔ کم لوگ ایسے ہوں گے جو اس طرح کے تجربے کو نبھا سکیں، خواہ وہ کیسے ہی عالم و مفکّر کیوں نہ ہوں۔ مولانا نے اس پسندیدہ مشغلے کو ساری عمر جاری رکھا۔ یہ مشغلہ نہ تھا بلکہ دعوت ہی کے کام کا ایک حصّہ تھا۔

ایک عارضی بستی ماچھی گوٹھ

ماچھی گوٹھ ریاست بہاول پور میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ کراچی جاتے ہوئے صادق آباد سے آگے کا پہلا چھوٹا سا اسٹیشن ہے۔ مسافر گاڑیاں دو ایک منٹ کے لیے ٹھہرتی ہیں۔ لیکن پاکستان کے نقشے میں یہ نقطۂ نا معلوم یکایک اُبھر آیا ہے اور اسے ایک تاریخی اہمیّت حاصل ہوگئی ہے۔ یہ نام اخباروں میں نمایاں ہوا، سی آئی ڈی کی رپورٹوں میں درج ہوگیا، اور ہمارے جماعتی لٹریچر میں اب اس کے لیے ایک اہم جگہ پیدا ہوگئی ہے ـــــ اور برسوں تک ہم اور ہمارے بعد میں آنے والے لوگ ماچھی گوٹھ کے اجلاس کا حوالہ دیا کرینگے کہ وہاں یہ اور یہ فیصلے ہوئے تھے۔ اصل میں ماچھیوں اور مچھیروں سے تحریکِ اسلامی کا تعلّق بڑا پُرانا ہے۔ یہ تعلّق حضرت عیسٰی علیہ السّلام نے قائم فرمایا تھا۔ آپ نے معاشرے کے اُونچے طبقوں کو بنجر پا کر دعوت کا رُخ ماہی گیروں کی طرف پھیر دیا اور ان کو پکار کر کہا کہ آؤ تم کو آدمیوں کا شکار کرنا سکھاؤں۔ یہ تعلّق کم از کم ذہنی طور پر ایک بار پھر تازہ ہو گیا ہے۔

اس مقام پر الیانی فیکٹری (جس کے مالک مشہور لغاری خاندان کی ممتاز ترین شاخ سے تعلّق رکھنے کی وجہ سے الیانی کہلاتے ہیں) کے احاطے میں جماعتِ اسلامی کے ارکان کا کُل پاکستان اجلاس ۱۷ تا ۲۱ فروری ۱۹۵۷ء منعقد رہا۔ اس اجلاس میں تحریکِ اسلامی کی پچھلی پندرہ برس کی تاریخ کا جائزہ لے کر آئندہ کے لیے خطوطِ کار معیّن کیے گئے۔ یہ تاریخی

---

[1] چونکہ ماچھی گوٹھ جیسی نامی چھوٹی بستی میں تحریک ایک نازک موڑ سے گزری تھی، اس لیے ریکارڈ کو واضح کرنے کے لیے اس کا تذکرہ بھی کیا جا رہا ہے۔ اس وقت کے واقعات و احوال اور اجتماعِ ارکان کے پس منظر کو یہاں بیان کرنا مناسب نہیں یہ ایک پیچیدہ بحث ہے۔

اجلاس حسب ذیل امتیازات کی بنا پر غیر معمولی نوعیّت رکھتا ہے :

—— یہ اجلاس ارکان کے والہانہ جذبہ کا ایک روشن ثبوت ہے ، کیوں کہ حاضری کا تناسب دوسری جماعتوں کے مقابلہ میں ریکارڈ کی حیثیت رکھتا ہے ۔ مالی مشکلات کے باوجود (مشرقی پاکستان کے لیے شرکتِ اجلاس کی غیر معمولی مشکلات بھی پیشِ نظر رہیں) کثیر تعداد میں ارکانِ جماعت حاضر ہوئے جن میں خواتین بھی تھیں، کچھ لوگ بیمار اور ضعیف تھے اور ایک دو رفقاء تو بالکل نابینا تھے ۔

—— یہ اجلاس ایسے عالم میں ہوا جب کہ ارکانِ جماعت بعض وجوہ سے سخت ذہنی اضطراب میں مبتلا رہے تھے ، مگر اس کے باوجود صبر و سکون، ضبط و نظم کی حدود میں رہتے ہوئے بڑی خوبی سے اہم ترین فیصلے کیے گئے ۔

—— اس اجلاس میں جماعت کی پالیسی ایک چار نکاتی لائحۂ عمل —— دعوت الی اللہ، توسیع و تنظیم ، اصلاحِ معاشرہ اور اصلاحِ ادارۂ حکمت کی شکل میں صرف پندرہ آراء کے اختلاف کے ساتھ طے پائی ۔ ارکان نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ بھی دے دیا کہ پالیسی کے ان چار اجزاء میں سے کسی کو بھی ساقط، معطّل یا مؤخر نہیں کیا جاسکے گا۔ خصوصًا انتخابات کے بارے میں پوری طرح صراحت کر دی کہ جماعتِ اسلامی ان سے بے تعلّق بہر حال نہیں رہ سکتی، اسے بالواسطہ یا بلا واسطہ، یا دونوں طرح حصّہ ضرور لینا ہوگا ، البتّہ ہر انتخاب کے موقع پر اس امر کا تعیّن کہ تینوں میں سے کس صورت کو اختیار کیا جائے، جماعت کی مجلسِ شوریٰ کی ذمّہ داری ہوگی ۔ اس فیصلے سے جماعت تذبذب سے نکل کر یک سوئی و یک جہتی کے مقام پر آ گئی اس قرارداد نے فیصلے سے یہ مسئلہ ہمیشہ کے لیے طے کر دیا ہے کہ جماعتِ اسلامی محدود معنوں میں مذہبیّت کی علم بردار نہیں، بلکہ وہ تحریکی پیمانے پر نظریۂ اسلامی کو لے کر اٹھی ہے اور نظامِ حیات کو اس کے تمام شعبوں سمیت عملاً بدلنا چاہتی ہے —— اس اجلاس میں امیرِ جماعت اور مجلسِ شوریٰ سے اختلاف کرنے والے رفقاء کو اظہارِ رائے کا جو آزادانہ موقع حاصل رہا ۔ اس نے ہماری جمہوری روایات کو مستحکم کر دیا ہے ۔

—— گزشتہ چند ماہ سے جماعت کے اندر اختلاف و انتشار پائے جانے اور گروہ

بن جانے کے چرچے مخالف حلقوں میں ہو رہے تھے، اس اجلاس کے فیصلوں نے ان کو یا وہ بنا دیا ہے۔

جماعت کے دستوری سانچے میں تغیر کرنے والی قراردادیں بہت ہی مختصر بحث کے بعد جس درجے کے اتفاقِ رائے سے نہایت خوشگوار فضا میں ارکان نے طے کی ہیں وہ گواہ ہیں کہ اس جماعت کا اجتماعی ذہن پیشِ نظر مسائل و معاملات کو کیسی یک جہتی سے سوچتا ہے اور نئی ضروریات کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے کتنا وسیع اجتہادی ظرف رکھتا ہے۔ ہماری جماعتی فضا نہ تو جمود کا شکار ہوئی ہے نہ انتشارِ فکر کی!

امیرِ جماعت کے استعفےٰ کو زیرِ غور لاتے ہوئے صد فی صد اتفاقِ رائے سے امیرِ جماعت پر اعتماد کا اظہار کیا گیا اور موصوف کو استعفےٰ واپس لینے پر مجبور کر دیا گیا۔ اس طرح جماعت اور اس کا قائد باہم دگر پہلے سے زیادہ قریب ہو گئے اور مخالفین کی پھیلائی ہوئی غلط افواہوں کا بالکل صفایا ہو گیا۔

امیرِ جماعت نے چھ گھنٹے کی تقریر میں تحریک کی تاریخ اور جماعت کے طے کردہ سفر کی روداد شرح و بسط سے بیان کر کے منزلِ مقصود کو اور زیادہ متعیّن اور اس کی طرف جانے والے راستے کے نقوش کو اور زیادہ اُجاگر کر دیا ہے۔ اس تقریر نے ماضی اور مستقبل کو ایسا مربوط کیا ہے کہ اب نئے آنے والے شرکائے سفر بھی یہ محسوس کریں گے کہ گویا وہ پچھلے سارے سفر میں خود شریک رہے ہیں۔

اس اجلاس نے جماعت کے اندر یہ اعتماد بھی پیدا کر دیا کہ خدا کے فضل سے یہ جماعت کسی دورِ اضطراب کو پار کرنے کی صلاحیّت بھی رکھتی ہے۔

یہ جو کچھ ہوا اس میں جتنا بھی خیر ہے وہ اللہ کی مہربانی ہے اور اس میں جو کچھ بھی نقص رہا وہ ہماری خطاؤں اور کوتاہیوں کا نتیجہ ہے۔ ہم پچھلی نوازشوں پر خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے آئندہ کے لیے اس سے رہنمائی کی دعا کرتے ہیں۔

تازہ بستیاں آباد

یہ تمنّا تو مولانا مودودیؒ اور تمام حلقۂ جماعت میں شروع سے موجود رہی ہے کہ تحریکِ اسلامی کا ایک مرکز ہو جہاں ضروری دفاتر

کی جگہ بھی ہو اور مرکزی اسٹاف کے لیے رہنے کے کوارٹر بھی ہوں۔

شروع میں دارالاسلام پٹھان کوٹ کے بارے میں ایسی توقعات تھیں، مگر بعد میں ضرورت محسوس ہوئی کہ کسی دوسری جگہ انتظام ہونا چاہیے، چنانچہ مشوروں اور تگ و دو کے بعد کیمبل پور میں ایک قطعۂ زمین اس مقصد کے لیے حاصل کیا گیا۔ بعد میں گوجرانوالہ کے قریب ایک جگہ دیکھی گئی، لیکن جماعت ایسی نئی صورتِ حالات کی طرف آگے ہی آگے بڑھتی گئی کہ لاہور کو چھوڑنا ممکن نہ رہا۔

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے ذہن میں اب زیادہ اہمیّت اس بات کو حاصل ہوئی کہ جماعت کے سکریٹری اور ناظمین جو مختلف محلوں میں متفرّق طور پر بُرے بھلے مکانوں میں پڑے ہیں اور بسا اوقات ان کے بھاری کرایے دے رہے ہیں، کسی طرح ان کے لیے یکجائی اقامت کا انتظام ہو جائے اور دفاتر بھی وہیں ہوں۔ خود مولانا اور ان کے اہلِ خانہ کے لیے ۵ اے ذیلدار پارک کی کوٹھی کا نصف حصّہ بھی کافی نہ تھا، کیوں کہ اس کے بیرونی حصّے میں دفاتر تھے۔ سب کی خواہش یہ رہی کہ کوئی صاحبِ خیر ساتھی کسی جگہ ۶، ۸ کوارٹر بنا کر سستے کرائے پر مہیّا کر دیں تو مشکلات کا بوجھ کم ہو جائے۔ عرصہ تک اس کی کوئی سبیل پیدا نہ ہو سکی۔ تا آنکہ ایک صاحبِ خیر نے مولانا کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میرے پاس کچھ رقم ہے، اسے آپ جماعت کے کسی مناسب مصرف میں لائیں۔ مولانا نے ان سے دفاتر اور اصحابِ دفاتر کی ضرورتوں کا اظہار کیا اور کہا کہ بہت دنوں سے یہ ضرورت سامنے تھی، مگر مالی لحاظ سے کوئی سبیل نہ تھی۔ اب آپ اپنا مال اس مصرف میں صرف کریں کہ زمین حاصل کر کے اس میں ضرورت کی عمارات بنوائی جائیں، چنانچہ متذکرہ صاحبِ خیر نے اپنی رقم دارالاسلام سوسائٹی ٹرسٹ کے حوالے کر کے اس سے یہ چاہا کہ اس رقم سے زمین اور عمارات کا انتظام کیا جائے۔ چنانچہ دارالاسلام سوسائٹی نے اس فنڈ سے منصورہ کی زمین خریدی اور اس پر عمارات بنا کر اسے کرائے پر دفاتر اور کارکنوں کی رہائش کے لیے دے دیا۔ زائد خرید کردہ زمین مختلف افراد کے ہاتھ بیچ دی گئی۔

اس طرح منصورہ کا وہ خواب پورا ہوا جسے مولانا عرصے سے دیکھتے رہے تھے۔

منصورہ کی نو آبادی کا اصل تصوّر مولانائے مرحوم و مغفور ہی کا دیا ہوا ہے اور سارا کام

کام ان کی مرضی اور مشورے کے مطابق ہوتا رہا ہے۔

ابتدا میں سوچے ہوئے منصوبے کے مطابق ایک بڑی مسجد بن گئی ہے (تکمیلی کام جاری ہے)، دینی مدرسہ بھی قائم ہوگیا، بلکہ ابو سیّد مودودی انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن بھی قائم ہوگیا ہے جس کا مقصد غیر ملکی طلبہ کو اسلامی اور جدید علوم کی تعلیم دینا ہے۔ دینی مدرسہ میں حفظِ قرآن کا سلسلہ بھی جاری ہے۔

اس وقت منصورہ میں ادارۂ معارفِ اسلامی (مؤسّس مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ) کے تحت تحقیق، تدوین اور ترجمہ کے کام ہو رہے ہیں۔ ایک لائبریری کی بنیاد رکھ دی گئی ہے۔ دوسری جانب بہت بڑا ہسپتال ہے جہاں ان دنوں افغانستان کے زخمی مہاجرین کی خدمت کے لیے عملہ اور ضروری سامان مہیّا ہے۔ ۵۰ تا ۱۰۰ مریض یہاں علاج کے لیے موجود رہتے ہیں۔

یہاں چھوٹا سا ایک پریس (انگریزی عربی ٹائپ کا) موجود ہے۔ ٹیلیفون کے علاوہ ٹیلیکس سروس قائم ہے۔ (اب فیکس کا انتظام بھی ہوگیا ہے۔ ۱۹۹۰ء)

شروع شروع میں اکثر رفیق یہاں آتے تو ان کے ذہنوں میں "دارالاسلام" کا عمارتی معیار سامنے ہوتا یعنی دارالاسلام (پٹھان کوٹ) کے چند چھوٹے چھوٹے کوارٹر اور مکتب کے ایک چھپّر کا تصوّر۔ منصورہ میں دفتروں اور اقامت گاہوں کی تعمیر کو یوں محسوس کرتے ہیں جیسے تحریک اپنے راستے سے ہٹ رہی ہو۔ حالانکہ سادگی اور پختگی کے ساتھ اگر کام کرنے کے لیے عمارات یا دیگر وسائل مہیّا ہوں تو اسلام ہی کو حق پہنچتا ہے کہ اس کے لیے انھیں استعمال کیا جائے۔ آہستہ آہستہ ذہن صاف ہو گئے اور محسوس کیا جانے لگا کہ صاف ستھرے دفاتر اور اقامتی انتظامات کا ہونا دین کے کسی تقاضے کیخلاف نہیں ہے، خصوصاً اس صورت میں جب کہ ذمّہ دار حضرات (امیرِ جماعت ہوں یا قیّم ہوں یا ناظمین و کارکنانِ شعبہ جات) سادہ انداز میں برادرانہ اطوار کے ساتھ خدمتِ دین اور فروغِ تحریک کے لیے سرگرم ہوں۔

آج اس بستی کا شاندار ترین منظر وہ ہوتا ہے جب سب لوگ سویرے اٹھ کر فجر کی نماز میں، یا دفتری کام چھوڑ کر یکایک ظہر کی نماز کے لیے نکل کھڑے ہوتے ہیں اور اسی

اسی طرح دوسری نمازیں مل کر ادا کرتے ہیں۔

سال بھر میں تھوڑے تھوڑے وقفے پر تربیّت گاہیں منعقد ہوتی ہیں جن میں ملک کے ہر حصّے سے لوگ شریک ہوتے ہیں۔ دو سال سے ماہِ رمضان میں مولانا گوہر رحمٰن صاحب دورۂ تفسیر قرآن مکمل کرتے ہیں جس میں تقریباً ۵ گھنٹے روزانہ صرف کرکے وہ قرآنی مباحث کے متعلّق بے شمار معلومات اور حوالے سامنے لاتے ہیں۔ اس دورہ سے مستفید ہونے کےلیے بھی نہ صرف آس پاس کے تعلیم یافتہ لوگ، بلکہ ملک کے مختلف حصّوں سے محبّتِ قرآن رکھنے والے شہری اور دیہاتی آآ کر شریک ہوتے ہیں۔

آج کل صبح ۹ بجے بطور خاص کارکنانِ دفاتر کے لیے آدھ گھنٹے کا درسِ قرآن مولانا خلیل حامدی دیتے ہیں۔ وہ آسان انداز سے الفاظ کے مطالب، ان کے مادّے اور صیغے بیان کرکے آیت بہ آیت حاصلِ مدّعا کو واضح کرتے ہیں۔

خصوصی کانفرنسیں اور مجالس بھی منعقد ہوتی ہیں۔ مثلاً کچھ ہی عرصہ پہلے اہلِ کاروبار کا ایک کنونشن منصورہ میں منعقد ہوا۔ اسی سال ایک بڑی قرآن کانفرنس یہاں منعقد ہو چکی ہے۔ علاوہ ازیں وکلاء کے کنونشن، مزدوروں اور خواتین کی تربیّت گاہیں اور اجتماعات بھی ہوتے رہتے ہیں۔ درسوں اور تقاریر کا سلسلہ بھی چلتا ہے۔ حلقۂ خواتین اور اسلامی جمعیّت طالبات کے دفاتر بھی منصورہ میں موجود ہیں۔

منصورہ بستی کی سرزمین اور تعمیرات نے بہت سے ایسے کاموں کے لیے آسانیاں پیدا کردی جن کو سابق حالات میں مشکل ہی سے کیا جا سکتا تھا۔

اوپر ذکر ہو چکا کہ یہاں ایک ہسپتال کی عمارت بھی ہے اور کام شروع ہے۔ لیکن فی الحال ساری توجّہ زخمی افغان مہاجرین کی طرف ہے اور دو ڈاکٹر ان کی خدمت میں مصروف ہیں۔ عام مریضوں کے لیے ایک ڈسپنسری الگ قائم ہے۔

اس بستی کے دو مسئلے اہم ہیں۔ ایک یہ کہ اس کی آبادی ایسی منظم اور با اخلاق رہے کہ یہ ایک مثال بن سکے۔ یہ کام کسی قدر مشکل یوں ہے کہ مرکزی دفاتر کے اسٹاف اور کارپردازوں کے علاوہ یہاں دوسرے لوگ بھی آباد ہیں جو اگرچہ بیشتر ہم خیال ہیں، مگر بستی کو مثالی

معیار تک پہنچانے کے لیے جس جذبے کی ضرورت ہے وہ سب میں برابر حد تک کارفرما نہیں ہو سکتا۔

دوسرا مسئلہ گھروں اور نئی نسلوں کا ہے۔ تحریک کے انتہائی مصروف اصحاب کو اپنے گھروں پر پوری توجّہ کرنے کا پچھلے دور میں بھی موقع نہیں ملا اور اب بھی یہ کام کرنا آسان نہیں ہے۔ اس کے ساتھ بچّوں اور بچیّوں کا مسئلہ ہے جن کے بڑا ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ذوق رجحانات، نظریات اور معاشرتی اثرات بھی پروان چڑھتے رہتے ہیں جن کی تخم ریزی نوخیز ذہنوں میں ماحول کی مؤثر قوّتیں کرتی ہیں۔ ان حالات میں ابتدا ہی سے دین کے پختہ شعور کے نشوونما پانے کی ضرورت بنیادی ہے۔ پھر دولت پرستی، آسائش پسندی، موسیقی اور تصاویر اور سینما اور ٹیلی وژن سے دلچسپی دلوں میں نصب ہوجانے والا غلط پیمانۂ عزّت، معاشرتی روابط کی مروّجہ بنیادیں، شادی بیاہ کے غیر دینی معیارات، بڑوں اور چھوٹوں کے لیے صحیح آداب کا برقرار نہ رہنا اور ایک دوسرے کے حقوق کا نہ پہچاننا اور معاشرے سے طرزِ معاملہ کے اسلامی آداب سے غفلت، یہ ساری وبائیں جو ماحول میں پھیلی ہوئی ہیں اُن سے ہماری ازواج و اولاد کا تحفظ بغیر اس کے نہیں ہو سکتا کہ ابتدا سے ہی گھروں میں ایسی تعلیم و تربیّت دی جائے کہ ہمارے لواحقین خود اپنی ہی نگاہ سے ہدایت کا راستہ پہچان سکیں۔ اس سلسلے میں ہماری کوتاہی یہ ہے کہ اولادوں، بیویوں اور رشتہ داروں میں دعوت پھیلا کر انکو متاثر کرنے کے بجائے خود ان سے متاثر ہونے کے خطرے میں ہیں۔ انقلابی لوگ رشتہ داروں یا ماحول سے اس طرح سمجھوتا نہیں کیا کرتے۔ مگر معلوم نہیں، اب ہم انقلابی مرتبے پر ہیں بھی یا نہیں۔

ہمارا طریقہ چونکہ پیری مریدی کے اسلوب پر مبنی نہیں ہے بلکہ تعلیم اور نمونے کے ذریعے پختہ شعور پیدا کرنے سے عبارت ہے، اس وجہ سے ہمارا کام دوگونہ مشکل ہے، مگر کچھ نہ کچھ یہ کام ہوتا رہا ہے اور اب اس پر مزید توجّہ ہونی چاہیے۔ خصوصًا منصورہ بستی کو تو ملک بھر کے لیے ماڈل بننا چاہیے۔ کاش کہ ملک بھر میں ایک گاؤں بھی ایسا ہوتا جسے ہم جماعتِ اسلامی کا ماڈل ولیج کہہ سکتے۔

اس

خدا کا شکر ہے کہ ہمارے کارپرداز کبھی اس ذمّہ داری سے یکسر غافل نہیں ہوئے اور آئندہ کے لیے ہم ان سے اور بھی اچھّی اُمیدیں وابستہ کرتے ہیں۔

بہر حال ہمیں منصورہ کو اسلامی تاریخ کا ایک زرّیں باب بنانا ہے۔ یہاں کے ماحول میں محبّتِ دین اور روشنی و نیکی کا اتنا غلبہ ہونا چاہیے کہ کسی مختلف ساخت کے فرد یا گھرانے کو یہاں رہنا بار معلوم ہو۔

جماعت کی قیادت میں تبدیلی

مولانا مودودیؒ نے اپنی زندگی میں ہی بیماری کی وجہ سے امارت کی ذمّہ داریوں سے کنارہ کش ہونے کا فیصلہ کیا اور جماعت نے میاں طفیل محمد صاحب کو اپنے ووٹوں سے امارت کے لیے منتخب کر لیا۔[1] ۲۱ اکتوبر ۱۹۷۲ء کو نتیجۂ انتخاب کا اعلان ہوا۔ ۲ نومبر کو میاں صاحب کی حلف برداری کی تقریب ۵۔اے ذیلدار پارک میں منعقد ہوئی۔ اس تقریب میں مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے جو مختصر خطاب کیا، اس کے چند جملے ملاحظہ ہوں:

> "تیس سال تک چوں کہ میں ہی اس جماعت کے نظام کو چلاتا رہا اور اس کی قیادت کرتا رہا اس لیے جماعت کے لوگوں میں یہ غلط فہمی پیدا ہونے لگی تھی کہ شاید میری ذات اور جماعت کی امارت کو ایک دوسرے کے ساتھ ایسی وابستہ ہیں کہ میرے بعد کوئی شخص جماعت کو نہیں چلا سکتا۔"

مولانا نے بھارت اور کشمیر کی جماعتوں (جماعت اسلامی) کی مثالیں دیں کہ دونوں جگہ لوگوں نے اپنے اندر سے امیر منتخب کر لیے اور میرے ان کے درمیان موجود نہ ہونے کے باوجود بخوبی کام چل رہا ہے۔

پھر فرمایا:

> "جس وقت میری بیماری نے شدّت پکڑی اور میں نے محسوس کیا کہ اب ذمّہ داری کو

---

[1] پہلے کچھ عرصے تک میاں طفیل محمد صاحب مولانا کے ارشاد سے بطور قائم مقام امیرِ جماعت کام کرتے رہے تھے کیوں کہ مولانا کی صحّت بار اٹھانے کے قابل نہ تھی۔

نہیں اٹھا سکتا تو میں نے اپنے رفقاء کو کہہ دیا تھا کہ میں اب اس کو بد دیانتی سمجھتا ہوں کہ جس ذمّہ داری کو میں نہیں سنبھال سکتا، اسے اٹھائے رکھوں۔ اس وجہ سے پہلے تو میں نے ارادہ کیا کہ استعفیٰ دے دوں تاکہ نئے سرے سے انتخاب ہو سکیں۔ پھر اس خیال سے کہ کہیں استعفٰے سے غلط فہمیاں پیدا نہ ہوں، میں نے قائم مقام امیرِ جماعت مقرّر کر دیا اور خدا کا شکر ہے کہ قائم مقام امیر میاں طفیل محمد صاحب بہت خوبی کے ساتھ کام چلاتے رہے۔"

(خطاب ۲ ر نومبر ۱۹۷۲)

آگے کی بات:

"چنانچہ جب میری مدّتِ امارت ختم ہونے پر آئی تو میں نے جماعت کے قاعدے کے خلاف ارکانِ جماعت سے اپیل کی کہ آئندہ انتخاب میں مجھے ووٹ نہ دیں ——— خدا کا شکر ہے کہ میرے رفقائے جماعت نے میری بیماری کو جان کر میرے اوپر رحم کھایا اور میری اپیل کو قبول کر لیا اور ایک ایسے شخص کا انتخاب کیا جو جماعتِ اسلامی کا انتہائی وفادار کارکن ہے ——— میں نے بہت کم آدمی ایسے دیکھے ہیں جنھوں نے اس اخلاص کے ساتھ، اس وفاداری کے ساتھ اور اس قدر جاں نثاری کے ساتھ جماعت کا کام کیا ہو اور جماعت کے لیے اتنی تکلیفیں اور مصیبتیں اٹھائی ہوں۔ میں پہلے ہی یہ توقع کر رہا تھا کہ جماعت کی نگاہ اِنہی پر پڑے گی۔ خدا کا شکر ہے کہ میری یہ توقع پوری ہوئی اور جماعت نے انھیں اکثریت کے ساتھ منتخب کر لیا۔"

(خطاب ۲ ر نومبر ۱۹۷۲ء)

یعنی نظمِ امارت کی یہ ساری تبدیلی مولانا کی مرضی سے ان کے سامنے واقع ہوئی اور اس کی انھوں نے تحسین کی اور میاں طفیل محمد صاحب کو مولانا کا مکمل اعتماد حاصل ہوا۔

منصورہ اور مولانا مودودیؒ

اس موقع پر یہ ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ منصورہ بستی کے تصوّر اور اس کی تعمیر کی سکیم سے

لے کر آخر تک مولانا کی دعائیں اس کو حاصل رہیں اور متعدد موقعوں پر انہوں نے اس کو بعض تقاریب کے سلسلے میں بہ طورِ خاص مشرّف فرمایا۔ اس سلسلے میں بعض قابلِ یادگار باتوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

مسجدِ منصورہ کا سنگِ بنیاد

حلف برداری کی کارروائی کے بعد اعلان ہوا کہ ۲۷ رمضان المبارک (۴۔ نومبر ۱۹۷۲ء) کو قائدِ تحریک اسلامی مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ منصورہ کی اسکیم کا افتتاح اس زمین پر مسجد کا سنگِ بنیاد رکھ کر کریں گے۔ خاصا مجمع جمع ہوا، مگر ۲۶۔ رمضان المبارک کو مولانا پر بخار اور انفلوئنزا کا حملہ ہوگیا۔ ۲۷ر کو کچھ افاقہ نہیں ہوا، لہٰذا بنیادیں شروع کرنے کی ذمہ داری مولانا نے میاں طفیل محمدؒ صاحب امیرِ جماعتِ اسلامی کو تفویض کی۔ ۱۱ر نومبر کو عید ملاپ اجتماع کا انتظام رشید پارک میں کیا گیا۔ اس میں شرکت سے بھی مولانا کی علالت (خصوصًا کمزوری) مانع ہوئی۔

۲۸ر رمضان المبارک ۱۳۹۳ھ (۲۶ر اکتوبر ۱۹۷۳ء) بروز جمعۃ الوداع مولانا مودودیؒ مسجد کا سنگِ بنیاد رکھنے کی تقریب میں تشریف لائے۔ اس کا یادگاری پتھر مسجد کی ڈیوڑھی میں نصب ہے اور اس پر لکھا ہے کہ ۲۸ر رمضان ۱۳۹۳ء کو تعمیر کا آغاز مولانا نے اپنے دستِ مبارک سے فرمایا بعد ازاں میاں طفیل محمد، چودھری رحمت الٰہی اور مولانا خلیل حامدی نے باری باری پھاوڑا چلایا۔ (ایشیا۔ ۴ر نومبر ۱۹۷۲ء)

سالانہ اجتماعِ ارکان ۱۹۷۴ء

۱۹۷۴ء میں ارکانِ جماعت کا سالانہ اجتماع ۲۹ تا ۳۱ مارچ کو ہونا طے پایا۔ اس اجتماع کا مقام منصورہ ہی رکھا گیا جہاں اس وقت تک تعمیرات نہیں تھیں، ایک ٹیوب ویل تھا، ٹیوب ویل کے ساتھ ایک آدھ کمرہ، کچھ درخت اور جھاڑیاں، باقی کھیت جن میں کاشت کا سلسلہ ختم ہوگیا تھا۔ اس جنگل میں منگل منانے کا فیصلہ ہوا اور کارکنانِ جماعت کی محنتوں کے نتیجے میں تحریک کے سرگشتگانِ شوق کا قافلہ اس بیابان میں تھوڑی دیر کے لیے رُکا اور پھر اپنی منزل کو روانہ ہوگیا۔

کیشِ ما مانندِ موجِ تیز گام
اختیارِ جادہ و ترکِ مقام

اس اجتماع میں جس کی فلم بھی لی گئی تھی، ۳۱ تاریخ کو اجلاسِ عام (۹ بجے تا دوپہر) میں خطاب کے لیے مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ تشریف لائے۔ پروفیسر عبدالغفور صاحب کی تقریر ہو رہی تھی۔ یکایک " مودودی مرحبا مرحبا،، اور قائدِ تحریکِ اسلامی زندہ باد کے نعرے ملتان روڈ سے سنائی دیے۔ نوجوانوں کا ایک جلوس مولانا کے ساتھ تھا جس میں بنگالی نوجوانوں کا خاصا حصّہ تھا اور ان کے بنگالی نعرے بھی گونج رہے تھے۔ مولانا کے آگے اسکوٹر سوار نوجوانوں کا دستہ جماعتِ اسلامی کا پرچم اٹھائے ہوئے چل رہا تھا۔

مولانا کو پہلے سیدھا زیرِ تعمیر مسجد کی طرف لے جایا گیا۔ یہ وہی مقام تھا جہاں ایک سال پہلے مسجد کا سنگِ اساس رکھا گیا تھا۔ اس مقام پر جماعت کا بڑا پرچم پول کے ساتھ لپٹا ہوا تھا۔ مولانا نے اپنے دستِ مبارک سے اسے لہرایا اور اسلام کی سربلندی اور غلبے کی دعا کی۔

پھر مولانا جلسہ گاہ کی طرف روانہ ہوئے۔ پھر وہی نعروں کا شور! جس کی وجہ سے اجتماع میں اس وقت تک خاصی ہلچل ہوئی جب تک کہ مولانا اسٹیج پر بیٹھ نہ گئے۔ سکون ہونے کے بعد پروفیسر عبدالغفور صاحب نے اپنی تقریر کا سلسلہ پھر شروع کیا، مگر مولانا کے لیے لوگوں کا اشتیاق کو دیکھتے ہوئے انھوں نے اپنی تقریر مختصر کر دی۔ پھر میاں صاحب (امیرِ جماعت) نے مختصر سا خطاب کیا۔

چودھری محمد اسلم سلیمی نے اعلان کیا کہ اب اسلامی تحریک کے داعی اور جماعتِ اسلامی کے بانی مولانا سیّد ابوالاعلےٰ مودودی خطاب کریں گے۔ جلسہ گاہ میں پھر جوش وجذبے کی ایک لہر دوڑ گئی۔ نوجوانوں نے پھر پورے زور سے نعرے لگائے۔

مولانا نے دھیمی اور پُرسوز آواز میں اپنی تقریر شروع کی۔ لہجہ آہستہ آہستہ پُرزور اور آواز بلند ہوتی چلی گئی۔ اس تقریر کو نقل کرنا تو کجا، یہاں اس کی تلخیص بھی نہیں دی جا سکتی۔ کیوں کہ یہ ہمارے موضوع کا تقاضا نہیں ہے۔ تاہم ایک اقتباس حاضر ہے:

"جب یہ خیالات ملک کے اندر پوری طرح مضبوطی سے جم جاتے ہیں اور قوم کے اندر پورا ارادہ پیدا ہو جاتا ہے تو پھر کوئی طاقت انقلاب کو آنے سے نہیں روک سکتی۔ یہ ہر راستے سے آتا ہے۔ ایسے راستے سے آتا ہے کہ بند کرنے کا خیال کوئی سوچ تک نہیں سکتا۔ آپ اس بات کی فکر نہ کریں کہ انقلاب کس راستے سے آئے گا۔ آپ صرف کام کریں اور یہ کام آپ اس وقت تک انجام نہیں دے سکتے جب تک آپ اپنے اخلاق، اپنے کردار اور اپنی سیرت کو درست نہ کرلیں۔"

اس تقریر کا ایک اور اہم اقتباس جو تقریر کے ابتدائی حصّے سے متعلق ہے:

"جس چیز پر میں اللہ تعالیٰ کا انتہائی شکر گزار ہوں وہ یہ ہے کہ میری زندگی ہی میں آزمودہ کارکنوں کی ایک ٹیم نے جماعت کی تنظیم اور اس کی قیادت کو سنبھال لیا ہے۔ میں دنیا سے اس اطمینان کے ساتھ رخصت ہوں گا کہ میں بھروسے کے قابل لوگوں کے ہاتھ میں نظام دے کر آیا ہوں۔"

(تقریر اجتماعِ ارکان سالانہ ۱۹۷۴ء)

پھر بڑے درد بھرے انداز سے دعا کی اور اجلاس اختتام پزیر ہوا۔

نئے مرکز میں تربیّت گاہ صوبہ پنجاب

مارچ ۱۹۷۵ء میں منصورہ کی نو آبادی میں اتنی تعمیرات ہو چکی تھیں کہ ۲۰ مارچ کو پنجاب کے رفقائے تحریک کی تربیت گاہ منعقد ہوئی۔ اس کے دوران سوال و جواب کی ایک نشست میں مولانا نے ۲۰ مارچ کو سوالوں کے جواب دیے۔ سوالات کے صرف عنوانات دیے جا رہے ہیں جو ترجمان القرآن میں، مولانا کی نظرِ ثانی شدہ رپورٹ میں شائع ہوئے ہیں:

- "آئندہ انتخابات میں جماعتِ اسلامی کی پالیسی کیا ہو؟
- کیا اقامتِ دین کا کام ظہورِ مہدی سے پہلے ہو سکے گا؟

٭ عوامی رجحانات کو دیکھتے ہوئے ہماری پالیسی کیا ہونی چاہیے ؟
٭ اللہ تعالیٰ ظالموں کو غلبے کا موقع کس حد تک دیتا ہے ؟
٭ اقامتِ دین کے کام کے لیے فارغ کارکن کیوں ؟
٭ ہم جیسے کمزور لوگوں کے ہاتھوں اسلامی نظام کیسے برپا ہوگا ؟

پہلے سوال میں جب پوچھا گیا کہ آئندہ انتخابات میں جماعتِ اسلامی کی پالیسی کیا ہونی چاہیے ؟ تو بڑا ہی پُرحکمت اور سبق آموز جواب مولانا نے یہ کہہ کر دیا کہ :

"اس سوال کا جواب میں آپ کو یہاں نہیں دے سکتا ۔ اس کے متعلّق اگر مجھے کچھ کہنا ہوا تو امیرِ جماعت سے کہوں گا ۔ یا مجلسِ عاملہ مجھ سے دریافت کریگی، تو اس کے سامنے بیان کروں گا، یا مجلسِ شوریٰ مجھ سے پوچھنا چاہے گی تو اس کے اجلاس میں پیش کروں گا ۔ میں ایک عام رُکنِ جماعت ہوں ۔ نہ امیرِ جماعت ہوں، نہ مجلس عاملہ کا رکن، نہ مجلسِ شوریٰ کا رکن، میرا یہ کام نہیں کہ یہاں بیٹھ کر جماعت کی پالیسی طے کروں ۔ پالیسی طے کرنا ان لوگوں کا کام ہے جو دستور کی رُو سے اس کے مجاز ہیں ۔" (مئی ۱۹۷۵ء، ص ۱۳۶/۳۲)

اس پر ایک ممتاز رفیق نے کہا ! " لیکن مولانا ! ہم یہ سمجھتے ہیں کہ آپ سب کچھ ہیں"۔ اس کا جواب مولانا نے یوں دیا :

" میں اس تصوّر کی جڑ کاٹ دینا چاہتا ہوں ۔ یہ جماعت ایک دستور اور ایک نظام پر قائم ہے ۔ اس میں مجھ سمیت کوئی شخص بھی اپنی ذاتی حیثیّت میں سب کچھ نہیں ہو سکتا ۔ جس دن جماعت کی تاسیس ہوئی تھی، اسی روز میں نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ دعوت تو بلا شبہ میں نے دی ہے، مگر یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ جو شخص داعی ہے اُسی کو آپ سے آپ امیرِ جماعت بھی ہونا چاہیے ۔"

بقیہ سوالات بھی اہم تھے اور ان کے جوابات بھی بڑے اہم ہیں ۔

مرکزی دفاتر کی منتقلی ۳۰ جون ہی کی تاریخ وہ آخری تاریخ قرار پائی تھی جب کہ ۵ ۔ اے ذیلدار پارک اچھرہ سے دفاتر اور کارکنان و

عمائدین کی منتقلی منصورہ میں ہوجانی تھی۔ لاہور کے رفقار کی خواہش پر ۳۰ر جون کی شام کورشید پارک میں اس سلسلے میں ایک تقریب منعقد کی گئی۔ اس میں مولانا مودودیؒ نے شرکت فرمائی۔ کچھ رفقار کی تجویز تھی کہ نئے مرکز کا نام دارالاسلام رکھا جائے۔ لیکن کچھ دوسرے تھے جو دارالاسلام کے نام کی عظیم ذمہ داریوں سے کانپ اٹھے۔ پھر نئے مرکز کا نام منصورہ طے پا گیا۔ منتقلی کا کام اپنی جگہ ہوتا گیا۔

مولانا کی تقریر عیدالاضحیٰ

منصورہ میں ۱۹۷۵ء میں مؤرخہ ۱۴ر دسمبر بروز اتوار عیدالاضحیٰ کی نماز پڑھی گئی۔ مولانا مودودیؒ نے تکلیف اور کمزوری کے باوجود اس میں شرکت کی، اور شرکت ہی نہیں، تقریر بھی فرمائی۔ یہ تقریر حسبِ موقع عیدالاضحیٰ ہی کے پس منظر سے متعلق تھی۔ ہر چند کہ یہ ایک مختصر تقریر ہے، مگر جامع بھی ہے۔ اختصار اور جامعیت کو جمع کرنے میں مولانا کو خاص ملکہ تھا۔ یہ تقریر ہفت روزہ ایشیا، مؤرخہ ۲۱ر دسمبر ۱۹۷۵ء کے شمارے میں صفحہ ۸ اور ۹ پر میں نے دیکھی۔

واضح رہے کہ نماز عید کی امامت کے فرائض جناب عاصم نعمانی (مولانا کے پرسنل سکریٹری) نے ادا کیے۔

خواتین کے اجتماع میں خطاب

۷ر اپریل ۱۹۷۶ء کو مولانا نے منصورہ میں منعقدہ اجتماعِ خواتین سے خطاب فرمایا۔ اس کا اقتباس:

"کوئی شخص یہ حق نہیں رکھتا، خواہ وہ باپ ہو، خواہ وہ شوہر ہو کہ وہ کسی عورت سے اللہ اور رسول کی نافرمانی کا مطالبہ کرے۔ ایسا حکم دینے والا حقیقتاً بڑا گناہ گار ہے۔ اتنا ہی بڑا گناہ گار وہ ہے جو کسی کے کہنے پر اپنی عاقبت خراب کرے۔"

---

[1] حوالے کے لیے تفصیل دیکھیں: "ایشیا، لاہور" ۱۳ر جولائی ۱۹۷۵ء

اس وقت کے حکمران کے ایک افسوس ناک جملہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

"کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یا خلفائے راشدین کے زمانے میں کوئی شخص اس بات کا تصوّر بھی کر سکتا تھا کہ عورتوں کے پردے کو جیل قرار دے اور انھیں دعوت دے کہ آؤ اور مردوں کے مجمع میں بیٹھ جاؤ۔"

(ہفت روزہ ایشیا، ۲۵/ اپریل ۱۹۷۶ء ص ۱۰)

وکلاء کنونشن

۲۱/ مئی ۱۹۷۶ء کو منصورہ میں ایک بڑا کنونشن منعقد ہوا۔ کنونشن کا مقصد یہ تھا کہ پاکستان میں اسلامی توانین کو جاری کرنے کے لیے کیا ہو سکتا ہے۔ کنونشن کے آخر میں جناب اے کے بروہی نے بہ حیثیت صدر اور مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے بطورِ مہمانِ خصوصی خطاب کیا۔ مولانا کے خطاب سے مختصر اقتباسات:

"اس سرزمین میں جہاں آج سے اٹھائیس انتیس سال قبل اگر اس بات کا نام لیا جاتا کہ یہاں اسلامی قانون نافذ کیا جائے تو بہت سے حلقوں کی طرف سے اس کو سُننا بھی گوارا نہیں کیا جاتا تھا۔ لیکن اس اٹھائیس انتیس سال کی مدّت میں اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس ملک کا قانون دان طبقہ، اس ملک کے وکلاء اور جج، ان کی عظیم اکثریت اس بات کی قائل ہو چکی ہے کہ یہاں اسلامی قانون ہی نافذ ہونا چاہیے۔"

"ہمیں تو پوری طرح تجربے نے یقین دلا دیا ہے کہ یہاں جن لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار ہے وہ اس قانون کو نافذ کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔"

"اسلامی قانون کا نفاذ ہو سکتا ہے تو صرف اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار ہے ان کو اقتدار سے ہٹایا جائے، اور ملک کا اقتدار ان لوگوں کو منتقل ہو جو اسلام کو جانتے بھی ہیں دل سے مانتے بھی ہیں اور اس کے احکام کو نافذ کرنے کا ارادہ بھی رکھتے ہیں۔"

"عوام کے خیالات کی تبدیلی سے ملک کا نظام بہت کم بدلا کرتا ہے۔ ملک کا نظام بدلا کرتا ہے ہمیشہ اس وقت جب کہ ملک کو چلانے والے دماغ بدل جائیں اس وجہ سے آپ کو پوری کوشش یہ کرنی چاہیے کہ ملک میں ایک بھی پڑھا لکھا آدمی ایسا نہ چھوڑیں جس کے خیالوں کو آپ تبدیل نہ کر چکے ہوں۔"

"(ہفت روزہ "آئین" ۱۶ر جون ۱۹۷۶ء)

آخر میں مولانا نے مختصر دعا کی۔

منصورہ میں ضلعی اُمرار کی تربیّت گاہ

مؤرخہ ۱۱ر جولائی ۱۹۷۶ء کو منصورہ میں ایک خصوصی تربیّت گاہ برائے امرائے اضلاع منعقد ہوئی۔ جناب صادق حسین صاحب (کراچی) کی سرکردگی میں ایک نصاب کمیٹی مقرر ہوئی جس نے تربیّت گاہ کا پورا نصابی پروگرام طے کر دیا۔ اس تربیت گاہ کی مدّت دس روز تھی۔ اس دس روزہ تربیّت گاہ میں امیرِ جماعت میاں طفیل محمد صاحب کے علاوہ ۱۶ر حضرات نے تربیّتی تقاریر اور گفت گوئیں کیں۔

تحریکِ اسلامی کے داعیٔ اعلیٰ اور جماعتِ اسلامی کے موسّس مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اختتامی خطاب فرمایا۔ یہ چونکہ دورِ آخر کے فرمودات ہیں اس لئے کچھ اقتباس:

"مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ اس وقت تمام وہ لوگ میرے سامنے ہیں جو پورے ملک میں جماعتِ اسلامی کے نظم کو چلا رہے ہیں۔"

"یہ بات آپ جانتے ہیں کہ جس مقصد کے لیے ہم کھڑے ہوئے ہیں وہ ایک ہمہ گیر اور کُلّی انقلاب کا مقصد ہے۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ پوری زندگی افراد کی بھی اور قوم کی بھی اسلامی نظام کے سانچے میں ڈھل جائے۔ کلمۃ اللہ بلند ہو اور ہر کلمہ اس کے سامنے دب جائے۔ احکامِ اسلامی ان کی اصل اسپرٹ اور ان کے اصل الفاظ کے مطابق جاری ہوں۔ ملک کے اندر سے بُرائیاں مٹیں اور بھلائیاں قائم ہوں۔"

"پاکستان بننے کے بعد سے جتنے لوگوں کے ہاتھ میں حکومت آئی وہ سب اس مقصد کی راہ میں مزاحم ہی رہے ہیں۔"

"اس طاقت کے مقابلے میں ہمارے پاس نہ تعداد کی طاقت ہے، نہ مال کی طاقت ہے، نہ حکومت کی طاقت ہے، نہ اور کسی قسم کی طاقت ہے ــــ صرف دو طاقتیں ہیں جن سے ہم اس صورتِ حال کا مقابلہ کر سکتے ہیں، ایک اخلاق اور دوسرے تنظیم ــــ اگر ہماری یہی دونوں طاقتیں کمزور رہیں تو پھر ہم کس بنیاد پر اُمید کر سکتے ہیں کہ اتنی بڑی منظّم طاقتوں کو شکست دے سکتے ہیں۔"

"نظمِ جماعت کی پابندی میں کمزوری ہی شکست کی ابتدا ہوتی ہے۔ قلیل التعداد آدمیوں کا ایک ڈھیلا ڈھالا نظمِ جماعت اقتدار کی قوّت کے مقابلے میں کیسے ٹھہر سکے گا۔"

"جس طرح مجھے کل سورج نکلنے کا یقین ہے اتنا ہی مجھے اس بات کا یقین ہے کہ اگر آپ نے اس کام کی شرائط پوری کیں تو ان شاء اللہ آپ یقیناً کامیاب ہوں گے۔"

"قبل از وقت کسی مقام پر کوئی فعل ایسا کر ڈالنا کہ جس سے پورے ملک میں جماعت کی لڑائی چھڑ جائے، یہ بہت بڑی غلطی ہے ــــ اس چیز پر میں آپ کو متنبّہ کرتا ہوں۔"

تقریر سے پہلے مولانا نے ملک نصر اللہ عزیز کے لیے دعائے مغفرت کی۔ ملک صاحب کا انتقال ۲رجولائی کو ہوا تھا۔

(ہفت روزہ ایشیا۔ ۱۸رمارچ ۱۹۷۶ء۔ ص۔ ۱۰)

فتحِ مبین ۱۹۷۶ء میں منصورہ میں ایک خصوصی درس کا اہتمام ہوا۔ یہ ۲۴ستمبر ۱۹۷۶ء کا واقعہ ہے۔ جامع فاروقیہ ڈسکہ نے اپنے ہاں مقامی طور پر ایک درس کا انتظام کر رکھا تھا۔

جب وہ سورۂ توبہ تک پہنچے تو یکایک فیصلہ کیا کہ اس کے آخری رکوع کا درس براہِ راست مولانا مودودیؒ سے سنا جائے، چنانچہ انھوں نے اس کی درخواست مولانا سے کی جسے مولانا نے منظور کر لیا۔ وہ لوگ ٹرانسپورٹ کا اپنا انتظام کر کے آئے۔ جماعت کے مقامی، ضلعی اور آس پاس کے ارکان اور کارکنوں کی بھی خاصی تعداد منصورہ پہنچ گئی۔ منصورہ ہی میں مولانا نے درس دیا۔ اس درس کے لیے ہفت روزہ "آئین" نے "فتح مبین" کا عنوان تجویز کیا۔ تمہید میں مولانا نے صلح حدیبیہ سے لے کر غزوۂ تبوک تک کے حالات پر مشتمل پس منظر بیان کیا۔ آخری رکوع میں منافقین کی دوستی اور ان کے کردار کے مختلف پہلوؤں سے گفتگو ہے۔ ان کا نفسیاتی تجزیہ ہے۔ اس گفتگو کے خاتمے پر منافقین کو خصوصاً اور اہلِ ایمان کو عموماً یہ بتایا گیا ہے کہ تمھارے سامنے جو رسول مبعوث ہوا ہے، ایک تو وہ خود تم میں سے ہے، دوسرے تمھارا نقصان میں پڑنا اسے شاق گزرتا ہے، تمھاری فلاح کا وہ حریص ہے اور ایمان لانے والوں کے لیے شفیق اور رحیم ہے۔ آخر میں اللہ تعالیٰ کا روئے سخن براہِ راست نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہو جاتا ہے۔ فرمایا کہ "اگر یہ لوگ تم سے منھ پھیرتے ہیں تو اے نبیؐ ان سے کہہ دو کہ میرے لیے اللہ بس کرتا ہے، کوئی معبود نہیں مگر وہ، اس پر میں نے بھروسا کیا ہے اور وہ مالک ہے عرشِ عظیم کا!" صَدَقَ اللّٰہُ الْعَظِیْمُ!

(ہفت روزہ ایشیا۔ ۱۰ اکتوبر ۱۹۷۶ء ص۔ ۱۷)

خوش قسمتی سے میں بھی اس محفلِ درس میں موجود تھا اور اپنے لیے بطورِ خاص اس کا ٹیپ حاصل کیا۔ آخر میں مولانا رحمہُ اللہ نے حسبِ ذیل دُعا کی:

"یا اللہ! مسلمانوں کو قرآن مجید پڑھنے کی توفیق عطا فرما، کیوں کہ اسی میں ان کی بھلائی ہے۔ جتنا وہ قرآن سے دور ہوں گے اُتنا ہی اپنی بھلائی سے دور ہوں گے۔ جتنا وہ قرآن کے قریب ہوں گے اتنا ہی وہ اپنی بھلائی کے قریب ہوں گے اور یا اللہ جن لوگوں کو کوئی جسمانی بیماری ہے اس کو بھی دور فرما، اور جو کسی رُوحانی بیماری میں مبتلا ہیں ان کو بھی شفا بخش۔ آمین۔"

وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلیٰ خَیرِ خَلْقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ۔

مولانا چاہتے تو بربنائے علالت اس درس کا اہتمام ۵۔اے ذیلدار پارک میں بھی کرا سکتے تھے، مگر وہ خود منصورہ کو بطورِ مرکزِ جماعت اہمیت دینا چاہتے تھے اور لوگوں کا رجوع ادھر بڑھانا چاہتے تھے۔ اس لیے تکلیف اٹھا کر یہاں تشریف لائے اور مفصّل درس دیا۔ اس مجلس کے بڑے بابرکت اثرات تمام حاضرین میں محسوس ہوتے تھے۔

نمازِ عید الفطر

۲۶ر ستمبر ۱۹۷۶ء کو مولانا مودودیؒ رحمۃ اللہ علیہ نے نمازِ عید الفطر منصورہ میں ادا کی۔ اجتماع سے مختصر خطاب بھی کیا جس کے چند جملے درج ذیل ہیں:

ماہِ صیام کے روزوں اور عید الفطر کے اجتماعات کے ذریعے ہمیں اجتماعی طور پر خدا کی بڑائی بیان کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

پچھلی قوموں کے زوال کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے دین اور دنیا کی تفریق پیدا کی اور کہا کہ دینی کام کرنا راہبوں یا پادریوں اور پروہتوں کا کام ہے، جس طرح انھوں نے دوسرے مذہبی کام پروہتوں کے حوالے کر دیے ویسے ہی ان کے ہاں روزہ رکھنا بھی مذہبی خدمت گاروں کا کام ہی بن کر رہ گیا، لیکن اسلام میں عبادات کا فریضہ ایک ایک فرد کا فریضہ ہے اور ہر ہر فرد پر ان کی ادائیگی فرض کی گئی ہے۔

(آئین مورخہ ۳۰ر ستمبر ۱۹۷۶ء ص ۷)

منصورہ میں دوسری نمازِ عید الاضحیٰ

۲ر دسمبر ۱۹۷۶ء کو منصورہ میں نمازِ عید الاضحیٰ میں مولانا سیّد ابو الاعلیٰ مودودیؒ نے شرکت فرمائی۔ اس موقع پر بہت اچھا خطاب کیا۔ خطاب میں مرکزی زور اس دعوتِ توحید پر تھا جس کا مرکز حرمِ پاک کو ٹھیرایا گیا اور جس کے علم بردار اپنے دور میں حضرت ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ تھے

اور جو حج کی عبادت کی رُوح ہے۔

مولانا نے تقریر کے اختتامی حصّے میں بڑی دردمندی سے کہا کہ یہی توحید جس پر مبنی ایک مکمّل نظامِ حیات اللہ تعالیٰ نے اُمّت کو دیا تھا، اس کے علمبرداروں کا اب یہ حال ہے کہ جگہ جگہ تفرقہ بازی اور تکفیر کا سلسلہ جاری ہے۔ اس خرابیٔ احوال کا سبب مولانا نے یہ بیان کیا کہ:

"مختلف لوگوں نے توحید اور دین و شرع میں نئی نئی چیزوں کی آمیزش کی ہے اس دین کے عقائد و احکام میں کچھ بڑھایا اور کچھ گھٹایا ہے، جو چیزیں اہم نہ تھیں ان کو اہم ترین بنایا ہے اور اس کمی بیشی کو مدارِ ایمان قرار دے دیا ہے۔"

(ہفت روزہ آئین۔ ۱۰ دسمبر ۱۹۷۶ء)

طالبات کا اجتماع

۲۴ دسمبر ۱۹۷۶ء کو جمعیت طالباتِ پاکستان کا اجتماع منصورہ میں منعقد ہوا۔ اس اجتماع کے آخری دن (۲۷ دسمبر ۱۹۷۶ء) کو مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے منصورہ آکر خطاب فرمایا۔ اس خطاب کا صرف ایک اقتباس:

"آپ کا اپنا عزم اور ارادہ یہ ہونا چاہیے، آپ کی اپنی خواہش یہ ہونی چاہیے کہ آپ کا گروہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ کی سیرتِ پاک کی پیروی کرے۔ اس بات کا فیصلہ آپ کے دل میں ہونا چاہیے، آپ کے اپنے دماغ کو مطمئن ہونا چاہیے کہ رسول اللہ جو ہدایت لائے ہیں اس کے سوا کوئی اور ہدایت نہیں ہے جس کی طرف ہمیں رجوع کرنے کی ضرورت ہو۔ حضورؐ نے جس چیز کو غلط کہا ہے وہ غلط ہے۔ آپ کو اس چیز پر اطمینان ہونا چاہیے۔ حضورؐ نے جس چیز کو صحیح کہا ہے اس کے صحیح ہونے پر آپ کو پورا پورا یقین اور اعتبار ہونا چاہیے۔ حضورؐ نے جس چیز کے متعلق بتایا ہے کہ یہ چیز اللہ کی رضا کے مطابق ہے، اللہ کی رضا حاصل کرنی ہو تو اس چیز پر عمل کریں، اور آپ کو اطمینان ہونا چاہیے کہ واقعی یہی چیز ہے جس میں اللہ کی رضا ہے۔"

(ہفت روزہ ایشیا ۹ جنوری ۱۹۷۷ء ص ۱۹)

طالبات کی طرف سے بہت سے سوالات کیے گئے۔ مولانا نے ان کے تسلّی بخش جواب دیے یہاں صرف آخری سوال اور جواب کو درج کیا جاتا ہے:

سوال کیا گیا کہ اگر آپ تحریک سے علیٰحدہ ہو کر موجودہ حالات سے مطمئن ہیں تو کس حد تک؟ اگر نہیں تو اس کا ازالہ کریں "

مولانا محترم نے جواب دیا: " میں تحریک سے علاحدہ کہاں ہوں، میں تو تحریک میں شامل ہوں، امارت سے الگ ہونے کی میری وجہ تھی بیماری، جس کی وجہ سے میں کام نہیں چلا سکتا تھا۔ لیکن امارت کو چھوڑ دینے کے معنیٰ تحریک کو چھوڑ دینے کے نہیں ہیں۔ میں آج بھی تحریک میں ہوں، اسی طرح سے جس طرح سے تھا۔ موجودہ امارت سے مطمئن نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے اس لیے کہ جماعت کی اکثریت نے جس آدمی کو امیر چُنا ہے، اور خود جس شخص کو میں ابتدا سے، جب سے یہ تحریک شروع ہوئی ہے جانتا ہوں، میرے ساتھ کام کیا ہے، میرے معتمد ترین رفیقوں میں سے ہے تو آخر میرے مطمئن نہ ہونے کی وجہ کیا ہے۔ اگر کسی چیز پر میں غیر مطمئن ہوا تو میں صاف صاف کہہ دوں گا کہ اس چیز کی اصلاح کیجیے اور اسی طرح سے مجلسِ شوریٰ کو مشورہ دوں گا۔ اگر امیرِ جماعت سے متعلق وہ چیز مجلسِ شوریٰ میں کہنے کی ہو۔

(ہفت روزہ ایشیا۔ جلد ۲۶، شمارہ ۳۔ ۱۶ جنوری ۱۹۷۸ء)

میاں طفیل محمدّ صاحب کی دُوسری تقریبِ حلف برداری

مرکزی امارت۔۔۔ کے عہدے کے لیے اواخر ۱۹۷۷ء میں انتخاب ہوا اور ۲۸ر اکتوبر کو نتیجے کا اعلان ہو گیا کہ میاں طفیل محمد صاحب کو جماعت نے دوبارہ منتخب کرلیا ہے۔ میاں صاحب کی تقریبِ حلف برداری میں شرکت کے لیے مرکزی مجلسِ عاملہ کے ارکان منصورہ پہنچ گئے۔ ۲ر نومبر ۱۹۷۷ء کو عاملہ کا اجلاس خاص طور پر اس لیے ۵۔ اے ذیلدار پارک میں منعقد کیا گیا کہ بانیٔ جماعت مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی اس میں حصّہ لے سکیں۔ ۱۱ بجے تقریب کا آغاز ہوا اور اس تقریب نے واضح

کردیا کہ منصورہ اور ۵۔اے ذیلدار پارک ایک ہیں۔ حلف برداری کی ساری کارروائی کے بعد بانیٔ جماعت نے اپنی جامع تقریر میں ایک بار پھر میاں طفیل محمد صاحب پر اپنے بھرپور اعتماد کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

"میں اپنے پُرانے رفیق اور دست و بازو میاں طفیل محمّد صاحب سے اظہارِ ہمدردی کرتا ہوں کہ جماعت نے ان پر یہ ذمّہ داری پھر ڈال دی ہے، حالاں کہ انھوں نے پچھلے پانچ سال تک اتنی سخت محنت کی ہے اور دین کی خدمت میں اتنا کچھ برداشت کیا ہے کہ اب حقیقت میں رحم کے مستحق تھے، تاہم میں اس بات پر خوش بھی ہوں کہ جماعت نے اس شخص کو دوبارہ منتخب کیا ہے جو جماعت کے اندر اس کام کے لیے سب سے زیادہ موزوں تھا، جو ابتدا سے جماعت کے پورے نظام کو سمجھنے اور تحریک کو چلانے میں میرے ساتھ شریک رہا اور اسقدر جماعت کے نظام کو اور تحریک کو سمجھنے والا شاید ہی کوئی اور ہو۔"

(ہفت روزہ "ایشیا" ۱۳ر نومبر ۱۹۷۷ء)

مولانا جیسی ہستی کے یہ الفاظ میاں صاحب کے لیے دنیا و آخرت میں قیمتی سرمایہ ہیں۔

منصورہ میں تیسری عید الاضحیٰ

۲۲ر نومبر ۱۹۷۷ء میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ منصورہ میں نمازِ عیدالاضحیٰ میں شرکت کے لیے تشریف لائے۔ تقریر مولانا گلزار احمد صاحب مظاہری نے کی۔ نماز و خطبۂ عید کے بعد اعلان ہوا کہ مولانا "تجدیدِ میثاق" کروائیں گے۔ واضح رہے کہ اسلامی کونسل کی تجویز میں خدا سے پیمانِ وفا باندھنے کی ایک تحریک اٹھائی گئی اور یہ تحریک چوں کہ باعث خیر و فلاح تھی اسلیئے مولانا مودودیؒ نے اس کو آگے بڑھانے میں حصّہ ادا کیا۔ مولانا کی کرسی سامنے لاکر رکھ دی گئی اور مائیکروفون قریب کر دیا گیا۔ مولانا نے میثاق کو جس انداز سے پڑھا اس سے معلوم ہوتا تھا کہ مولانا کے نزدیک یہ کتنا اہم اور عظیم فرض تھا۔ مولانا میثاق کا ایک فقرہ پڑھتے تھے اور اہلِ اجتماع صدق دل سے اسے بآوازِ بلند دہراتے تھے۔

بعدازاں آپ نے جو تقریر فرمائی اس کا ملخّص یہ ہے۔

"یہ عہد جو آپ نے کیا ہے اس کی حیثیت یہ نہیں کہ ایک عبارت میں پڑھتا گیا اور آپ اسے دہراتے گئے، بلکہ آپ کو یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ کسی اور سے نہیں، مالکِ کائنات سے عہد ہے اور آخرت میں اس کے متعلّق پوچھا جائے گا کہ ہم نے یہ عہد جو کیا تھا اس کو کہاں تک پورا کیا۔"

"اللہ تعالیٰ کے ساتھ عہد کا معاملہ ایسا زبردست اور اہم ہے کہ بنی اسرائیل کے سروں پر کوہِ طور اٹھا کر ان سے عہد لیا گیا تھا تا کہ انھیں احساس رہے کہ انھوں نے جس عظیم ہستی سے پیمان باندھا ہے وہ پہاڑ کو اٹھا کر اُن کے اوپر گرا سکتی ہے۔"

"جن جن لوگوں کو اس عہد نامے کی چھپی ہوئی عبارت ملے وہ کم از کم دس نسخے اپنے ہاتھ سے تیار کر کے دوسروں تک پہنچائیں۔"

"اس کا مدّعا صرف اتنا ہی نہیں کہ ہر شخص اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچے اور فرماں برداری کرے، بلکہ اس کا مدّعا یہ بھی ہے کہ ساری قوم اللہ سے پیمانِ وفا باندھے اور یہ طے کرے کہ اب وہ اپنے معاملات کی باگ ڈور کبھی خدا کی نافرمانی کرنے والوں کے ہاتھوں میں نہیں دے گی۔ خوب سمجھ لیجیے کہ کسی قوم پر ظالم وجابر، سنگ دل و بے رحم، خائن و بددیانت اور فاسق و فاجر لوگوں کا مسلّط ہو جانا اللہ کا عذاب ہے جو اسی قوم پر نازل ہوتا ہے جو خود اللہ کے راستے سے بھٹک گئی ہو۔"

"خداوندِ عالم ہمیں عہد شکنی سے اور اُس کے بُرے نتائج سے بچائے۔"

(ہفت روزہ "ایشیا"، ۲۷ نومبر ۱۹۷۷ء)

دراز تر گفتم

حکایت ہی ایسی تھی کہ بات لمبی ہو گئی۔ اس تحریر میں تاریخِ تحریک کے کئی گوشے شامل ہیں ـــــ آخر میں مجھے اس قصّے کو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی ایک خواہش کے ذکر پر ختم کرنا ہے۔

مولانا سے درخواست کی گئی کہ آپ بھی منصورہ کی زمین پر اپنی اقامت گاہ تعمیر کرائیں۔
مولانا نے فرمایا: منصورہ میں مجھے فقط "دو گز زمین" درکار ہے۔ ہماری مرکزی قیادت کے عمائد کے سامنے یہ بات ہوئی اور ہم سب اسے جانتے ہیں۔
دلی صدمہ ہے کہ مولانا کے لیے جہاں دسیوں گز زمین کی پیش کش کی جا رہی تھی، وہاں
"دو گز زمین" مقدّر نہ ہو سکی۔
مگر مشیّتِ الٰہی کے سامنے ہم سرنگوں ہیں۔

دُعا

عمارات اور ساز و سامان ضروری چیزیں بھی ہیں اور مفید بھی، مگر ذرا سی غفلت سے یہ چیزیں کسی مقصدِ اعلیٰ کی راہ میں دیواریں بن جاتی ہیں۔ یہ حقیقت ہمیں یاد رکھنی چاہیے کہ فقر و افلاس اہلِ ایمان کے لیے جتنا تکلیف دہ ہوتا ہے اس سے زیادہ تباہ کُن۔

خدا سے دعا ہے کہ وہ منصورہ سے وہی کام لے جس کا خواب دارالاسلام میں دیکھا گیا تھا۔

خدا کرے کہ ظاہری عمارات اور اسباب سے کام لیتے ہوئے ہمارے قلوب اسی ذوقِ فقر کی لہروں پر رواں دواں رہیں جس پر ابتدا ریں تھے۔

خدا کرے کہ غلبۂ حق کی تحریک کا تموّج اسی رفتار سے روز افزوں رہے جس رفتار سے ہمارے ابتدائی کارکنوں نے جان ماری کر کے ہر صبح و شام اس میں اضافہ کیا تھا۔

خدا کرے کہ ہ ے مؤسّسین جماعت کا جذبۂ اقامتِ دین ہر دوسری فکر پر غالب رہے اور ادنیٰ قسم کی سیاسی ضروریات اس پر برتری حاصل نہ کر سکیں۔

خدا کرے کہ ہم میں ویسا ہی جذبۂ اُخوّت کارفرما رہے جیسا ۱۹۴۱ء میں تھا۔

خدا کرے کہ ہم لوگ اقامتِ دین اور بندگانِ خدا کی خدمت کے لیے اپنے عزیبانہ وسائل میں سے حسبِ مقدرت بصد ذوق و شوق انفاق کرتے رہیں۔

خدا کرے کہ کاروانِ بلاکشاں سے جادۂ حق پر پیش قدمی کرتے ہوئے مخالف قوّتیں، مشقتوں اور قربانیوں کا جو خراج طلب کریں، ہم اسے بصمیم قلب ادا کریں۔

خدا کرے کہ تحریکِ اسلامی فکری، اخلاقی اور تنظیمی لحاظ سے توانا ہو کر جلد سے جلد حصولِ مقصد تک پہنچے۔

اگر ایسا ہوا تو دارالاسلام کی سچّی روح منصورہ کے بھی ذرّے ذرّے میں زندہ رہے گی۔

ایک ضروری حوالہ

کچھ لوگوں کو اس بدگمانی کا گناہ اپنے سر لینا تھا کہ مولانا مودودی اور ان کے اہل خانہ منصورہ میں آنا پسند نہیں کرتے تھے اور اہل منصورہ اور اہلِ اِچھرہ میں کوئی کدورت حائل تھی۔ اس کی بہت اچھّی طرح تردید اس مضمون میں ہو گئی ہے مگر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ایک مفید حوالہ اور پیش کر دیا جائے۔

"افریشیا" کے لیے بیگم مودودی کا انٹرویو

مشہور خاتون کالم نگار اور رپورٹر محترمہ رفعت نے "افریشیا" کے لیے بیگم مودودی سے انٹرویو لیا۔ اس کا ضروری اقتباس:۔

س: "آپ لوگ منصورہ کیوں نہ منتقل ہوئے۔ لوگ کہتے ہیں کہ آپکے گھر کا ماحول منصورہ والے جماعت کے ارکین سے فرق رکھتا ہے، اس لیے آپ وہاں نہیں گئے۔"

ج: "دیکھیے، ہم میں سے کوئی ایسا کم ظرف نہیں جو مولانا کی علالت کو نہ سمجھتا ہو۔ مخالفین باتیں اور بتنگڑ بناتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ اس مکان میں مولانا کی لائبریری ہے اور انھوں نے اپنی کتابیں خود ترتیب دے رکھی ہیں وہ ان دنوں کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے ہیں۔ جب چاہتے ہیں اپنی مطلوبہ کتب نکال لیتے ہیں۔ اگر وہ یہاں سے لائبریری منتقل کرتے تو پھر اس طرح نہ ترتیب دے پاتے اور ان کا تخلیقی کام رک جاتا، ورنہ منصورہ جانے میں کوئی ماحول، کوئی ایسی چیز مانع نہیں۔"

(ہفت روزہ "افریشیا" اشاعت ۲۲ دسمبر ۱۹۷۸ء ص ۲۹۔ ۳۰)

رُخصت

اے بزمِ جہاں

۱۹ رجون کو لاہور سے اور ۲۰ کو کراچی سے روانگی ۔ ۲۰ رکی دو پہر دبئی کے ہوائی اڈے پر اور رات ایک ہوٹل میں ۔ ۲۱ رکو دوبئی سے فرینکفرٹ اور پیرس ہوتے ہوئے لندن ۔ رات یو کے اسلامک مشن کے دفتر میں قیام ۲۳ رکی شام کو نیویارک، پھر فلوریڈا، ڈیٹرائیٹ، پھر انڈیانا پلیس، پھر بالٹی مور، پھر واپس نیویارک، ۱۳ رجولائی کو نیویارک سے کاسا بلانکا اور قاہرہ ہوتے ہوئے جدّہ، ۱۶ رکو مکّہ معظّمہ، ۱۸ رکو مدینہ منوّرہ، ۱۹ رکو جدّہ، ۲۰ رکو پھر مکّہ معظّمہ، ۲۱ رکو واپسی ۲۲ رکی صبح کو کراچی اور دوپہر کو لاہور میں "تشریف آوری"!

یوں سمجھیے "کہ" بس پھر آنکھ کھُل گئی "۔

ع " جب آنکھ کھلی گُل کی تو موسم تھا خزاں کا "

اور ع " پھر وہی ہم، پھر وہی غم "

مکانی لحاظ سے ہزاروں میل طویل، اور زمانی لحاظ سے تقریباً ایک ماہ (۱۹ جون ۱۹۷۹ء تا ۲۲ رجولائی ۱۹۷۹ء) میں محدود اس سفر کا بیش قیمت باب یہ تھا کہ محترم مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ مولانا لاہور سے ۲۶ رمئی کو روانہ ہوئے تھے۔ میں ۱۹ رجون کو چلا۔ اواخر جون (۲۸، ۲۹) کو ملاقات ہوئی یعنی ایک مہینے کے وقفے سے۔

نیویارک پہنچنے کے تیسرے روز مولانا سے ٹیلیفونی رابطہ قائم کیا۔ سلام و آداب کے بعد عرض کیا کہ میں کسی دن حاضر ہونا چاہتا ہوں۔ فرمایا کہ آپ جب چاہیں آجائیں اور اپنے آنے سے قبل ڈاکٹر (یعنی مولانا کے فرزند ڈاکٹر احمد فاروق) کو اطلاع دے دیں تاکہ وہ ایئرپورٹ سے اپنی گاڑی پر لے آئے، کیونکہ یہاں تک آنے کا راستہ بہت مشکل ہے۔ بعد میں مشاہدے سے اس بات کو صحیح پایا۔

پھر ایک دن رختِ سفر باندھا، یعنی اپنا سفری بیگ ساتھ لیا اور ہوائی جہاز کے ذریعہ غالباً دو گھنٹے میں بفیلو جا پہنچا۔ ہوائی اڈے سے ڈاکٹر صاحب کو فون کیا۔ پھر عمارت سے باہر آکر اُن کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر میں ڈاکٹر صاحب اور اُن کے قریبی عزیز مسعود صاحب دونوں گاڑی میں آپہنچے۔ منزل تک جانے میں سہ پہر کا وقت ہوگیا۔ لہٰذا دن کا کھانا گول کیا۔ اور ڈاکٹر صاحب نے میرے حسبِ خواہش چائے کے ساتھ بسکٹ پھل وغیرہ فراہم کردیے، نمازِ عصر کے بعد مولانائے محترم اندرونِ خانہ سے اپنے "واکر" کے سہارے کشادہ ڈرائنگ رُوم میں پہنچ گئے مجھے بلوایا گیا۔ اوپر کی منزل سے اتر کر حاضر ہوا۔ مصافحہ کے ساتھ ہی میں نے کہا کہ "مولانا آپ نے تو یہاں بھی کھینچ بلوایا۔ جواباً مولانا نے غالباً کچھ ایسی بات کہی کہ جہاں ہم ہوں گے وہاں آپ کو آنا ہی ہوگا۔ پھر شاید یہ بھی کہ آخر آپ نے امریکہ دیکھ لیا۔ عرض کیا کہ ایسی کوئی خواہش میرے اندر نہ تھی یوں بھی طبیعت سفر گریز ہوگئی ہے۔ پھر بات کا رُخ مولانا کی صحت، کے موضوع کی طرف مُڑ گیا۔ ایک بات تو از خود ظاہر تھی، یعنی مولانا کی مجموعی ظاہری حالت اچھی تھی، چہرہ شاداب تھا، لہجے میں اُبھار تھا، گفتگو میں بشاشت کا رنگ تھا۔ میرا خیال ہے کہ یہ خوش گوار عمومی تبدیلیاں بڑی حد تک ماحول کے بدلنے، جائے قیام کے پُر فضا ہونے، صاحبِ حیثیت، مگر سلیم الطبع اولاد کی خدمت کیشی، بہترین صاف سُتھری غذاؤں کی فراہمی، مولانا کی روایت کے مطابق مکمّل پابندئ اوقات اور ملاقاتیوں کے ہجوم اور مسائل کی یورش میں کمی کا نتیجہ تھیں۔

البتّہ معلوم ہوا کہ جوڑوں کا درد بدستور ہے اور ابھی چند ہی روز پہلے (ایک ہفتے سے زیادہ نہیں) درد کا علاج ایک جدید ترین معالجاتی تکنک سے ہوا ہے، یعنی مشین کے ذریعے فوق السّماعت قسم کی صوتی لہریں پیدا کی جاتی ہیں جو ماؤف جوڑوں اور ہڈیوں تک حرارت کی لہروں میں بدل کر پہنچتی ہیں اور گوشت سے گزر کر براہِ راست مقاماتِ درد پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اندازہ یہ ہوا کہ اس طرزِ علاج کا جس کا ایک کورس دو ماہ کا ہے، قدرے اچھّا ہی اثر ہے۔ مگر اس کے اثرات کا صحیح اندازہ ۲۴، ۲۵ دن کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ مولانا کہہ رہے تھے کہ اگر یہ علاج مفید رہا تو ضروری مشینیں خرید کر واپسی پر لے آؤں گا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ بطورِ علاج مولانا کو ۶، ۷ سیڑھیاں چڑھنے کا تجربہ بھی کرایا جارہا ہے۔

اس اثنا میں خلیل حامدی صاحب اور نیو یارک کے ذکی الدّین صاحب آچکے تھے، چائے کا دور بھی چلا اور باتوں کا حلقہ بھی وسیع تر ہو گیا۔ مولانا نے مجھ سے بھی اور خلیل صاحب سے بھی ادھر کے حالات دریافت کیے۔ مختصراً ضروری باتیں بتائیں۔ ذکی الدّین صاحب نے اسلامی یونیورسٹی کے بارے میں مولانا سے مشورہ طلب کیا۔ خاصا وقت گزر جانے پر ہم نے مولانا سے خود ہی عرض کیا کہ اب شاید آپ کو بیٹھنے میں زحمت ہو رہی ہے، آپ واپس تشریف لے جائیں۔ اور ہمارا اندازہ بالکل صحیح تھا۔ مولانا مصافحے کر کے تشریف لے گیے۔

صحبتِ روشن دلاں یک دم، دو دم
آں دو دم سرمایۂ بود و عدم

شام کا کھانا ڈاکٹر احمد فاروقی ہی کے ساتھ کھایا گیا۔ دسترخوان پر دال کی موجودگی امریکہ میں پاکستانیت کے حلول پر دلالت کر رہی تھی۔ ۱۰۔۱۱ بجے ہم تینوں مسافرانِ بے منزل قریبی قصبہ بفیلو کے لیے روانہ ہو گئے جہاں سے اگلے دن ڈیٹرائیٹ جانا تھا۔

پھر مولانا کی صحّت کے سلسلے میں بعد کی تازہ اطلاع یہاں یہ ملی کہ آٹھ دس روز پہلے (۲۳ر جولائی کو) اُن کو ایک خاص قسم کا انجکشن ریڑھ کی ہڈی میں لگایا گیا جس سے کمر اور کولھوں کے درد میں بہت کمی ہو گئی ہے۔ چہرے کی رنگت بھی بہتر ہو گئی ہے۔

مولانا کے بڑے بھائی کی رحلت

مولانا سیّد ابوالخیر مودودی بتاریخ ۲۸ر اگست ۱۹۷۹ء (مطابق ۴ شوّال ۱۳۹۹ھ) بروز سہ شنبہ بوقت ایک بجے دوپہر انتقال فرما گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

مرحوم مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی مدظلہ، کے بڑے بھائی تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ صدمہ سب سے بڑھ کر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ہی کے لیے ہے اور آج وطن سے ہزاروں میل دُوری پر جب انھیں اطلاع ملے گی، تو احساس کچھ شدید تر ہی ہو گا۔

ادھر مولانا ابوالخیر مرحوم کے لیے دنیائے عِلم بھی ماتمی ہے۔ مرحوم نے جدید و قدیم علوم کے ساتھ دارالترجمہ حیدرآباد کے زیرِ اہتمام ملّتِ اسلامیہ کی قیمتی خدمات انجام دی ہیں۔ اور

نہیں توکم سے کم مرحوم کی ایک خدمت فتوح البلدان کے اردو ترجمہ سے تو بیشتر اصحابِ مطالعہ واقف ہوں گے۔ "ڈھنڈورے" کے اس دور میں ان کی شہرت گریزی ہی تھی کہ اوّل درجے کے ایک مصنّف و محقق، ایک مترجم اور ایک تنقید نگار اور مورّخ کے قدردان صرف خواص ہیں۔

مولانا ابوالخیر کی شخصیّت صرف علمی ہی نہ تھی، وہ دینی لحاظ سے بھی ایک مقام رکھتے تھے۔ اوران کا مزاج ایک خاص رنگِ تصوّف میں رنگا ہوا تھا۔ مولانا ابوالخیر مرحوم نے نہ صرف یہ کہ والدِ گرامی کی وفات کے بعد مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی تعلیم و تربیّت کی ذمہ داری پوری کی اور تحریکِ اسلامی کے سلسلے میں مولانا پر جو مشکل اَدْوار گزرے اُن میں ان کا پورا پورا ساتھ دیا، بلکہ وہ جماعتِ اسلامی سے بھی خیر خواہانہ محبّت رکھتے تھے۔ ترجمان القرآن کے وہ کئی برس سے پبلشر بھی تھے۔

کرب انگیز خلاء

وہ ایک شخص تھا، جس کے ساتھ ۳۸ سال گزر گئے! ——— مولانا مودودیؒ!

کتنا سخت لمحہ ہے کہ اس شخص کے جسد کی امانت کو مٹی کے حوالے کرنے کے بعد میں اسی کی جدائی کا ذکر چھیڑ رہا ہوں۔ ترجمان القرآن کی ادارت کرنے اور اس کے ذریعے دور دراز تک ایمان و حکمت کا نور پھیلانے والی ہستی نگاہوں سے اوجھل ہو چکی ہے۔ اس کی کرسی خالی ہے، وہ اپنے تاریخی کمرے میں بھی موجود نہیں، اور اہلِ خانہ کی مجلس میں بھی شریک نہیں ہے، اس کی کتابیں جیسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے ڈھونڈ رہی ہیں۔ اس کی میز پر رکھے ہوئے کاغذ اس کا انتظار اور اس کا قلم سوچتا ہے کہ وہ کب آکر اُسے اپنے ہاتھ میں لے گا۔ اس کی رہنمائی و شفقت کے سائے میں کام کرتے ہوئے بڑی قوّت محسوس ہوتی تھی۔ قلم بے باکی سے چلتا تھا اور اربابِ فساد و عناد کے بڑے بڑے محاذ بے وقعت معلوم ہوتے تھے۔ آج قلب و نظر کی وہ کیفیتیں جوں کی توں کیسے برقرار رہ سکتی ہیں، لیکن اصل سرچشمۂ قوّت چوں کہ خداوندِ کون و مکان ہے، اس وجہ سے مجھے یقین ہے کہ موجودہ مرحلۂ سخت سے گزرتے ہی وہ پہلے سے بھی زیادہ قوّت و اعتماد عطا کرے گا۔ وہ جانتا ہے کہ مولانا مودودی رحمۃ اللّٰہ علیہ کے بعد اس کے ساتھ مل کر اقامتِ دین کی جدّوجہد کرنے والے رفیقوں کو نئے مراحل میں پہلے سے زیادہ عزم و ہمّت کی ضرورت ہوگی۔

میری پہلی ملاقات مولانائے مغفور سے اگست ۱۹۳۸ میں بہ مقام دارالاسلام پٹھانکوٹ ہوئی تھی، اور آخری ملاقات بفیلو میں جولائی ۱۹۷۹ء کو۔

میں ان چند خوش قسمت لوگوں میں سے ایک ہوں جنھوں نے پاکستان سے ۱۴ ہزار میل دور، اس سرزمین پر مولانائے مغفور سے دل خوش کن ملاقات کی جہاں مولانا کے لیے آخری سانس لینا مقدّر تھا، وہاں ان کی عام صحّت کو بہتر، چہرے کو شاداب اور گفتگو کو تروتازہ پایا۔ اس علاج کی افادیت بھی معلوم ہوئی جس کا آغاز چند روز پہلے ہوا تھا۔

پھر جس دن مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ کے آپریشن کی خبر آئی تو تشویش تو ہوئی، مگر دل کی امیدیں جوں کی توں برقرار رہیں۔ اس اطلاع کے ملنے کے بعد مولانا مغفور کے گھر میں ختم قرآن اور ذکر و دعا کا ایسا سلسلہ چلا کہ ۲۲ ستمبر کی خبرِ خدنگ اثر کے آنے تک برقرار رہا۔ سینکڑوں خواتین ہر روز جمع ہوتیں۔ صبح سے رات گئے تک آتی جاتی رہتیں، اور ہر گھڑی ذکر و دعا کا دور چلتا رہتا۔ متفرّق طور پر مختلف محلّوں کے کئی کئی گھروں میں بھی یہی صورت تھی۔ ظاہر ہے کہ دوسرے شہروں اور قصبوں کے علاوہ دور دراز کے دیہات سے بھی دعاؤں کے ہجوم عرشِ الٰہی تک اٹھے۔ مولانا کے اپنے گھر کے علاوہ اچھرہ اور لاہور کے دوسرے حصّوں میں محبّانِ مودودیؒ نے بکرے ذبح کرا کے صدقے میں دیے۔ گویا ذکر و دعا اور صدقہ و انفاق کی ایک خاموش تحریک تھی جو کسی ہدایت کے بغیر چل رہی تھی۔ ان مخلصانہ و دردمندانہ کوششوں سے خدا کی اٹل تقدیر کو بدلا نہیں جا سکتا تھا، ہونے والا سانحہ اپنے وقتِ مقرّرہ پر ہو گیا۔ (اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ) مگر ذکر و دعا کی یہ مساعی ضائع تو جا نہیں سکتیں، ان پر تو وعدۂ الٰہی کے مطابق برگ و بار آنے ہیں۔

۳۸ سالہ دور[لہ] میں ہم نے نہ صرف دین کا اصل مدّعا مولانا سے سمجھا، بلکہ ان سے لفظاً لفظاً قرآن و حدیث کے درس سُنے، بلا جھجک ان سے ہر طرح کے سوالات کیے، اُن سے بحثیں کیں، دماغ میں اپنے دَور کے جتنے اثرات بھرے ہوئے تھے اُن کے سامنے اُگل دیے، انھوں نے

لہ اس سے مراد جماعتِ اسلامی کی تشکیل کے بعد کا مسلسل رابطہ ہے ورنہ میرا تعلق ۴۱ سال رہا۔

جس محبّت، جس کشادہ دلی اور جس حوصلہ افزائی کے ساتھ ہمارا قلبی و ذہنی تزکیہ کیا، وہ ان کی طرف سے ہم پر اتنا بڑا احسان ہے کہ اس کا جواباً کوئی صلہ دینا سوائے دعاؤں کے ہمارے بس میں نہیں ہے۔ پھر ملکی اور بین الاقوامی سیاسیات، معاشیات، نظریۂ ارتقار، مارکس ازم، جمہوریّت، فسطائیت ہندو امپریلزم وغیرہ وسیع مباحث میں انھوں نے جس طرح آبیاری کی اور دنیا کے ہر فتنے کے ـــــ بالمقابل جس خوبصورتی سے رموزِ دین کو ہم پر آشکار کیا، اس کا بیان کیسے ممکن ہے۔ کہنا یہ چاہیے کہ جیسے ۳۸ برس کا پورا زمانہ ایک کالج یا یونیورسٹی میں گزرا جس میں ایک ہی شخص تمام مضامین کا لیکچرار اور پروفیسر تھا جس کا اصل مرکزی موضوع نظامِ اسلامی کا احیا رتھا۔

میں سچ کہتا ہوں کہ اگر میں اس سعادت سے محروم رہتا تو ایک دیہاتی نوجوان کی حیثیت میں زیادہ سے زیادہ کلرکی یا مدرّسی یا ایڈیٹری جیسا کوئی کام کرلیتا۔ دوسری طرف اخلاقی حیثیت سے ماحول کا تیز و تند دھارا نہ جانے مجھے کن گردابوں میں جا پھینکتا، میں اب جو کچھ ہوں ـــــ اگرچہ اب بھی خدا کا ایک کوتاہ کار بندہ ہوں ـــــ میرے اندر جو بھی خوبی ہے اس کا بڑا حصّہ اُسی مردِ حق کی وجہ سے ہے جس کے قرب کی سعادت میرے لیے مقدّر ہوئی۔

اس ۳۸ سال کی مدّت میں مَیں نے بھی اور بے شمار دوسرے رفقائے مقصد نے بھی اس شخص کی ذاتی زندگی کے ہر پہلو کو بھی دیکھا اور اس کی دعوتی اور سیاسی اور علمی سرگرمیوں کو بھی خوب اچھی طرح چھانا پرکھا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا اور رسولؐ کے لیے گہری محبّت کا جو رجحان خدا کے دین کے لیے جو بے پایاں جذبہ، برّصغیر کے مسلمانوں کے لیے جو گہرا تفکّر، پاکستان کے لیے جس طرح کا ولولۂ بے تاب اور پورے عالمِ اسلام کے مسائل کے لیے اس کے اندر جو مخلصانہ اضطراب کار فرما دیکھا ہے، اس کی کوئی دوسری مثال نہ ملے گی۔ پھر ایک شخص نہ کبر و ریا سے کام لیتا ہے، نہ انکسار بے جا کا مظاہرہ کرتا ہے۔ نہ دین میں مداہنت کی اور نہ سیاست میں خیانت کی روش اختیار کرتا ہے، دعوت ماننے والوں کو اپنے بھائیوں اور بیٹوں کی طرح محبّت و شفقت سے نوازا، اور گالیاں دینے والوں کو نظر انداز کیا۔ رفقا میں سے کسی نے اس کے روّیے سے اتفاق کیا تو وہ خوش، اور اختلاف کیا بلکہ تنقید کی تو وہ احسان مند۔ نہ مخالفوں کا تذکرہ کبھی بپھر کر کیا، نہ احوالِ ناسازگار کا سامنا کرتے ہوئے گھبراہٹ دکھائی، نہ کبھی وہ غصّے

سے بے قابو ہو کر کسی پر برسا، نہ طوفانِ عناد و فساد میں گھر کر اس نے کبھی مایوسانہ نقطۂ نظر سے کام لیا۔ زبان ہمیشہ معیاری اور پاکیزہ رہی، لہجہ ہمیشہ نرم و لطیف رہا۔ اس کے سامنے الٰہ بخش تڑپ گیا، ڈاکٹر نذیر کی شہادت کی خبر اس کے کانوں تک پہنچی۔ تحریک ۱۹۷۷ء میں محبّانِ دین گولیوں کا نشانہ بنے اور پولیس کی لاٹھیوں نے علماء کی بوٹیاں اُڑا دیں، اور اس کے چہیتے نوجوان قلعے اور سی آئی کے دفتروں اور تھانوں میں غیر انسانی شقاوتوں کا تختۂ مشق بنے تو ایسے عالم میں بھی اس کا مشہور سلوگن نہ بدلا ــــــ "صبر اور حکمت"! تقسیمِ پاکستان کے سانحہ پر وہ سخت اندوہ گیں ہوا مگر راضی بہ رضا رہا۔

معاملہ محض ایک فرد کے ذاتی غم کا نہیں ہے، مولانا کے غمِ جدائی کی وسیع جاگیر کے حصّہ دار بے شمار ہیں، مگر سب سے پہلے جس حلقۂ غم زدگان کا احساس ہوتا ہے وہ مرحوم و مغفور کے گھر کے لوگ ہیں۔ ہماری وہ بڑی بہن جو مولانا کی رفیقۂ مقصد بھی رہی ہیں، آج بیوہ ہو گئی ہیں۔ انھوں نے اگرچہ ضبطِ گریہ کی ایک اعلیٰ مثال قائم کی ہے، مگر یقیناً مولانائے مغفور کی وفات نے ان کی شخصیّت کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ وہ پچھلے چند برس سے خدمتِ دین اور درسِ قرآن کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو مولانا کی تیمارداری، پابندیٔ وقت کے ساتھ ان کے لیے غذا اور دوا کے اہتمام اور ان کی خبر گیری اور خدمت میں لگی رہتی تھیں، اور امریکہ میں مولانا کے مرض الموت کے دوران جو حالیہ سخت دورِ آزمائش انھوں نے گزارا ہے، اس کے بعد مولانا کی جدائی نے ان سے گھریلو سرگرمیوں کا مرکز چھین لیا ہے خدا ان کی سعادت مند اولاد کو سلامت رکھے مگر ایک عظیم شخصیّت کی رفاقت و خدمت کا خلا کوئی بھی پر نہیں کر سکتا۔ اسی طرح مولانا کے نہایت ہی لاڈلے اور حسّاس بیٹے اور بیٹیاں ہیں اور مجھے اندازہ ہے کہ ظاہری صبر کے باوجود ان کے دل اندر سے کس طرح کٹ رہے ہیں۔ ہم سب ان کے دُکھ درد میں شریک ہیں۔ ہم اس پورے گھر کا احترام کرتے ہیں۔ ہم مولانا کے اہلِ خانہ سے ہر ممکن تعاون کرتے رہیں گے اور ان کو یہ محسوس نہ ہونے دیں گے کہ بس ہمارا تعلّق صرف مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ سے تھا، اور اب مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ کے گھر والوں سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ مولانا مغفور کے ملازموں اور خادموں کا بھی ہمیں

لحاظ ہے۔

اس موقع پر میں یہ بھی کہوں گا کہ مولانا اور بیگم صاحبہ کے صاحبزادے اور صاحبزادیاں زیادہ تر دین سے وابستہ اور تحریکِ اسلامی سے متاثر ہیں، مگر اب مولانا کی وفات کا غم لگنے پر ان کے پگھلے ہوئے دلوں کو میں مائل کرنا چاہتا ہوں کہ وہ سب کے سب اب پوری سرگرمی سے اقامتِ دین کی جدّوجہد میں شریک ہوں اور مولانا نے جس کام میں ساری عمر اپنی ہر قوّت کو خرچ کیا، اُن کے اخلاف بھی پوری یکسوئی سے اسی کو سرمایۂ دنیا و آخرت بنالیں۔ اسی طرح وہ ایک وسیع برادری میں عزّت کا مقام پالیں گے۔ یہ بلند مقام ان کا ہر لمحے منتظر ہے۔ دولت اور کاروبار اور عہدے اور شہرت اور سامانِ آسائش و آرائش وہ چیزیں نہیں ہیں جن کے لیے مولانا مودودی کا خاندان سرگرداں ہو۔ آپ دنیا سے بے نیاز ہو کر خدا کے دین کے پیچھے چلنے کا فیصلہ کرلیں۔ دنیا اپنے سارے مادّی اسباب و وسائل لیکر آپ کے پیچھے چلے گی ——— اس طرح چلے گی جس طرح خدم وحشم چلتے ہیں۔ آپ سب اُن بڑوں کو اپنے بزرگ اور ان چھوٹوں کو اپنے بھائی اور عزیز سمجھیں جن سے مولانا مودودیؒ مغفور صاحب کا عمر بھر کا رویّہ (جو آخر دم تک رہا) آپ کے لیے بجائے خود وصیّت ہے، ان کا سارا لٹریچر ایک وصیّت ہے، ان کا سلسلۂ روابط ایک وصیّت ہے۔ ان کی دعوتِ دین اور خدمتِ دین ایک وصیّت ہے۔ اس وصیّت کا جزء بہ جزء پورا کرنا آپ کی اوّلین ذمہ داری ہے۔ اس کے بغیر تو قیامت کے دن اپنے معزّز نگرا اصول و مقصد رکھنے والے باپ کے سامنے حق فرزندگی وقرابت پورا کرکے دکھانا مشکل ہو جائے گا۔ آپ کے سامنے طغریٰ یہ ہونا چاہیے کہ آنچہ پدر نتواند، پسر تمام کُند۔ مرحوم و مغفور نے اپنا کام حسن مقام پر پہنچا دیا ہے، اُسے اس سے آگے لے کے چلنے والوں میں آپ پیش پیش ہوں۔ ہمارے لیے کیا ہی مقامِ مسرّت ہوگا کہ آپ نیچے کی مختلف ذمہ داریوں سے گزر کر زیادہ اہم مناصب تک پہنچیں۔ اگر اپنا فرض صحیح طور پر ادا کرنے لگیں تو مولانا مودودیؒ کی قائم کردہ جماعت کی لیڈرشپ کی صف آپ کے بغیر مکمل نہ ہو سکے گی۔ آپ مصر کے استاد حسن البنّا شہید کے معزّز صاحب زادے سیف الاسلام کی مثال بنیں، اور جب کبھی آپ عالمِ اسلام کی دنیا

شرق و غرب میں کہیں بھی جائیں تو خواص و عوام یہ سُن کر ٹوٹ پڑیں کہ اسلام کے عظیم مفکّر مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے تشریف لائے ہیں۔ آپ ادنیٰ مقاصد کی سطح سے بلند ہوکر اپنے تاریخ ساز باپ کے خالی کردہ رُتبے تک پہنچنے کے مستحق بنیں۔ وَمَاذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیزٍ۔

مولانا کے وسیع پسماندگان میں وہ تمام خاص و عام شامل ہیں جو اس عقیدے اور نصب العین کے فدائی ہیں۔ ایسے فدائیوں کو برسوں کی محنت سے مرحوم و مغفور نے اپنے گرد سمیٹا، پھر ان کو منظّم کیا، اُن کی تربیّت کی، اُن کو کام سونپے، ان سے مشورے لیے، اُنکی عزّت کی اور انھیں تاریخ پر اثر ڈالنے والی ایک بڑی قوّت بنا کے اپنے پیچھے چھوڑا۔

مولانا کا یہ وہ خاندان ہے اور یہ ایسی برادری ہے کہ مولانا نے جب جس کام کے لیے ان کو پکارا انھوں نے لبّیک کہا، ان میں سے کتنوں نے عہدوں اور ملازمتوں کو تج دیا۔ کتنوں نے حرام آمدنیوں سے حاصل شدہ جائیدادوں کو الگ کر دیا اور کتنوں نے عزیز رشتوں اور دوستوں کو چھوڑ دیا۔ پھر خدا کے یہ بندے جیلوں میں گئے، سڑکوں پر لاٹھیوں اور گولیوں کا نشانہ بنے، گالیوں کی بوچھاڑوں سے دوچار ہوئے۔ تھانوں اور حوالاتوں میں خراب ہوئے، لاہور کے شاہی قلعہ اور دوسری عقوبت گاہوں میں ان کے جسموں اور عضلات کو پیس ڈالا گیا، اور ان کو اعصاب شکن ذہنی اذیّتیں دی گئیں اور ان کی عزّتِ نفس کے پُرزے اُڑائے گئے۔ ان میں سے ہر شخص قربانیوں کی ایک تاریخ رکھتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اور سب کچھ چھوڑ کر آپ اُس دیہاتی کارکن کا تصوّر کیجیے جس کو ضرورت کی پوری آمدنی میسّر نہیں، جس کے بدن پر اچھّا بلکہ کافی لباس نہیں، جس کے بچّے مشکلات سے گزر رہے ہیں، لیکن وہ تیس پینتیس برس سے ایک عاشقِ جنون زدہ کی طرح اقامتِ دین کے لیے صحرانوردیاں کرتا ہے، وہ مولانا کی ہدایت پر عوام کو کوئی پیغام پہنچانے کے لیے کوچہ گردیاں کرتا ہے۔ وہ ایک ایک پمفلٹ کو لے کر ہر دروازے پر دستک دیتا ہے، اجتماعات میں شرکت کے لیے سفر کرتا ہے۔ تربیّت گاہوں کے لیے وقت نکالتا ہے اور غریبی کے باوجود خدا کی راہ میں انفاق کرتا ہے۔ حق یہ ہے کہ مولانا مودودیؒ کی مقصدی برادری کے اس چھوٹے سے کارکن کے قدموں کی دُھول سیم و زر کے انباروں، کوٹھیوں اور کاروں سے

زیادہ قیمتی ہے۔ اور اس کی شخصیّت اربابِ دولت وجاہ کی شخصیّتوں سے ہزار گنا پاکیزہ اور بلند ہے۔

میں سوچتا ہوں کہ مولانا کی مقصدی برادری کے۔ ایسے ایک ایک کارکن کا دُکھ کون بٹائے گا، اس کے آنسو کون پوچھے گا۔ اس کو کون سہارا دے گا اور اس کے سامنے تعزیت کے لیے کون جائے گا۔

اسی صف کے اُن ہزاروں پیارے بھائیوں کا تصوّر کرتا ہوں جو چترال اور بلوچستان سے لمبے لمبے سفر کر کے اس لیے لاہور پہنچے کہ مولانا کے جنازے میں شریک ہوں اور آخری بار ان کے چہرے کی جھلک دیکھ سکیں۔ کوئی حساب ہے ان لوگوں کے دکھے ہوئے جذبات کا۔ جن میں سے کتنے بچّوں کی طرح بلک بلک کر روتے رہے، اور زیارت کے لیے میل بھر لمبی قطارِ انتظار میں کئی گھنٹے کھڑے رہے۔

اور مولانائے مرحوم ومغفور کی اس وسیع برادری کی ایک اہم صف ان بیدار دل اور شاہین نگاہ نوجوانوں کی ہے جنھوں نے درس گاہوں کی مخالفانہ تعلیمی فضا اور معاشرے کے فاسد ماحول کو شکست دے کر مولانا کا پیغامِ انقلاب اپنے اندر جذب کیا اور آج اُنکی جانیں پرچمِ حق کو بلند کرنے کے لیے بے تاب ہیں۔ ان نوجوانوں نے اپنے آپ کو الحاد اور مادّہ پرستی اور سوشلزم اور جنسی ثقافت سے اس طرح اپنے آپ کو بچا نکالا ہے جیسے کوئی نوخیز بچہ خرکاروں کے چنگل سے نکل بھاگا ہو۔ انھوں نے شدید تعلیمی مصروفیات کے ساتھ ساتھ ایک طرف اپنے آپ کو اسلامی شعور اور اسلامی کردار سے آراستہ کرنے کی مساعی جاری رکھیں، دوسری طرف یونیورسٹیوں کے ماحول میں انھوں نے مخالفِ اسلام نظریات کے جال پھیلانے والوں کا زور توڑ دیا اور تیسری طرف یہ ملک کی اسلامی تحریک کا سرمایۂ تقویّت ہیں۔

مجھے اندازہ ہے کہ عزم وہمّت کے ان پیکروں پر کیا گزری۔ اُن کی روحیں کیسے تڑپ تڑپ گئیں، مگر انھوں نے اپنے سینوں کی جراحتوں سے خون نہیں ٹپکنے دیا۔ پھر کمال یہ کہ اپنی تفتہ جگری کے باوجود انھوں نے اپنے لیڈروں کی زیرِ کمان تابوت کی آمد، سیّد مغفور

کے رُخِ پرنور کی زیارت اور جنازے کی اسٹیڈیم روانگی اور واپسی کے انتظامات منظّم سپاہ کی طرح کیے ۔ یہ نوجوان جو اپنے ماں باپ سے زیادہ سیّد مودودیؒ اور مرشدِ مودودیؒ کو چاہتے تھے، آج محترمی میاں طفیل محمدؒ سے لے کر مجھ ناچیز تک مولانا کی ساری برادری اپنی اس نوجوان صف کے دُکھ درد کا بہ شدّت احساس کرتی ہے مستقبل کے ان مجاہدینِ تحریکِ اسلامی کے سامنے میں سب کی طرف سے اظہارِ ہمدردی اور تلقینِ صبر کا فریضہ ادا کرتا ہوں، نیز دعا کرتا ہوں کہ سیّد مودودی کے یہ لاڈلے بچّے اور اسلام کے یہ فداکار سپاہی آنے والے دَور میں تحریکِ غلبۂ اسلام کو تاریخ کے آخری کناروں تک پہنچا دیں اور دعوتِ حق کے جس علَم کو انھوں نے تھاما ہے اُسے دنیائے انسانیت کے ہر اُونچے سے اونچے مقام پر گاڑ دیں۔ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ!

میں اپنے آپ پر بھی، اور اپنے تمام رفیقوں پر بھی لازم سمجھتا ہوں (اور میرے سارے رفیق بھی لازم سمجھتے ہیں) کہ مولانا کی اپنی بنائی ہوئی اس مقصدی برادری کے ہر رُکن سے محبّت کی جائے ۔ اور اس کو احترام و اعتماد کا مستحق سمجھا جائے ۔ اور مولانا کے خونی رشتوں اور خاندان کا بھی یہ فرض ہے کہ مولانا کے ان روحانی رشتہ داروں، بلکہ بیٹوں اور چہیتوں اور لاڈلوں کو ہمیشہ محبّت و احترام کا مستحق سمجھیں۔

میں اپنے ادارے کے ذریعے مولانا کی اس پوری برادری کے ہر ہر فرد سے (جو پاکستان میں بھی پھیلی ہوئی ہے اور پاکستان سے باہر بھی دنیا کے مختلف خطّوں میں موجود ہے) تعزیت اور ہمدردی کا اظہار کرتا ہوں نیز اُن سے درخواست کرتا ہوں کہ مولانا کے تمام چاہنے والے اس عقیدۂ و نصبُ العین کی سربلندی اور نظامِ اسلامی کے غلبہ کی جدّوجہد پہلے سے زیادہ عزم و ہمّت کے ساتھ کریں جس کے لیے مولانائے مغفور نے آخر دم تک بھرپور کام کیا۔ اگر یہ نہیں تو محبّت یا تو محض جذباتی نوعیّت کی ہو گی یا کسی دنیوی مفاد کے لیے!

مولانا مودودی رحمۃ اللّٰہ علیہ کی اس وسیع برادری ہی کے جذبۂ محبّت و احترام نے ہمیں مجبور کر دیا کہ جنازے کی تدفین میں قدرے تاخیر کو گوارا کر لیا جائے، ورنہ ہزاروں افراد کا دردِ محرومی ہمیں تڑپا تڑپا دے گا۔ ان کے جذبے مُرجھا جائیں گے اور کلیجے مسوس کر ـــــ

رہ جائیں گے۔ مولانا کے زخم خوردہ فدائیوں کے ساتھ ایسا خوفناک تجربہ کرنے کی ہمیں ہمّت نہ تھی۔
بلاشبہ حکم ہے کہ تکفین و تدفین میں عجلت کی جائے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت میں ہے کہ
اِسْرَعُوْا بِالْجَنَازَۃِ (یعنی جنازے میں جلدی کرو) حُصین بن دَحْدَحْ نے حضرت طلحہؓ بن
براء کی وفات کے موقع پر حضورؐ کا ارشاد "عَجِّلُوْا بِہٖ"، نقل کیا ہے یعنی تجہیز و تکفین اور جنازہ
اُٹھانے میں جلدی کرو۔

یہ حکم اگرچہ فرضیت و وجوب کی نوعیّت رکھتا ہو تو پھر تو کسی بڑے سے بڑے سبب کو بھی اس کی عین میں تعمیل
میں مانع نہیں ہونا چاہیے۔ حقیقت میں اس پر عمل کرنا مندوب و مستحب ہے اور اس کی حکمتیں اور مصلحتیں واضح
ہیں۔ بروئے سُنّت مندوب و مستحب تقاضوں کو بالعموم پورا کرنا چاہیے اور عام طور پر تکفین و تدفین میں جلدی کی
ہی جاتی ہے لیکن اگر کبھی کوئی بڑی ضرورت سامنے ہو، مثلاً مناسب وقت میں اعزّہ و اقرباء کے شریکِ جنازہ
ہونے کا امکان ہو، یا وارث حقیقی موجود نہ ہو اور اس کا تھوڑی بہت دیر میں پہنچ جانا متوقع
ہو، یا طوفانِ باد و باراں اتنا شدید ہو کہ شامیانہ تان کر بھی قبر تیار کرنا ممکن نہ ہو اور اگر تیار کریں
تو اس کے کنارے گرنے لگیں یا پانی اندر بھر جائے یا بیک وقت کسی بستی میں یا کسی گھر میں آگے
پیچھے موتیں ہو جائیں تو ایسی صورت میں توقف کیا جا سکتا ہے۔ میں اگرچہ فتویٰ دینے کا مقام
نہیں رکھتا، مگر سرسری حیثیت سے مسئلے کی نوعیّت کو سمجھتا ہوں اور جنائز کے سلسلے میں پیش
آنے والی عملی صورتوں کا مجھے تجربہ و مشاہدہ ہے۔

جہاں تک دلیل کا تعلق ہے، عملِ صحابہؓ سے بڑی قاطع دلیل ملتی۔ آخر آنحضور صلی اللہ
علیہ وسلّم کے جَسَدِ مبارک کو کم از کم ۳۲ گھنٹے تاخیر سے سپردِ لحد کیا جا سکا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ
مسلمانوں کے گروہ تا دیر یکے بعد دیگرے آئے اور جنازہ پڑھتے رہے۔ گویا ایمانی
فدائیوں میں سے اکثر کو محروم رکھنا صحابہؓ نے درست نہیں سمجھا۔

ہم جیسے عامیوں کی موت کے مقابلے میں جن کا تعلّق اپنے گھر یا خاندان کے چند افراد سے
ہوتا ہے، خدا کے دین کی خدمت کرنے والی مقبولِ خلائق اور محبوبِ عام شخصیّتوں کا معاملہ ذرا
مختلف ہوتا ہے۔ ایسی ہستیوں کا خاندانِ محبّت بڑا وسیع ہوتا ہے اور اس وسیع خاندان کو درکنار
رکھ کر محض خونی رشتے کے دو چار ورثار کا کوئی فیصلہ کر دینا مناسب نہیں ہوتا۔ ایسے لوگوں کے

بھائی بندوں، بیٹے اور بیٹیوں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے جن کی رعایت اس بنا پر ملحوظ رکھنا ضروری ہوتا ہے کہ کسی متوفّی نے زندگی میں ان کے جذبات کی رعایت ملحوظ رکھی۔

پس ایک حکمِ مندوب کے ثواب کی کمی، ہزارہا انسانی قلوب کے اطمینان ان کی شرکتِ جنازہ سے پوری ہو جاتی ہے۔ واضح رہے کہ جنازوں کا بڑا ہونا جہاں یہ معنیٰ رکھتا ہے کہ انبوہِ کثیر نے ایک شخص کے حق میں دعا کرنے کے ساتھ ساتھ اچھی شہادت دی اور اپنے لیے ثواب حاصل کیا، وہاں دین کی تاریخی کشمکش میں حصّہ لینے والی شخصیّتوں کے جنازے دنیا کے لیے ایک علامتِ ہدایت بھی ہوتے ہیں۔ جیسے کہ امام احمدؒ بن حنبلؒ اور امام ابنِ تیمیہؒ نے فرمایا تھا کہ یہ تو ہمارے جنازے ہی واضح کریں گے کہ ہم یا ہمارے مخالفین میں سے کون حق پر ہے؛ چنانچہ ان کے جنازوں کی وسعت و عظمت ان کے حق میں علامت بن گئی۔ آج مولانا مودودیؒ کا جنازہ بھی اُن کے حق میں ایک دلیل اور علامت کی حیثیّت سے سامنے آیا ہے۔

کیا خوب بات کہی ان کے ایک محبِّ خاص استاذ یوسف القرضاوی نے کہ مولانا مودودیؒ کا جنازہ نہیں ریفرنڈم تھا۔ اس جنازے نے اسلام اور غیر اسلام کے درمیان لکیر کھینچ دی ہے۔ اس جنازے نے ثابت کر دیا ہے کہ پاکستان اب اسلام کے لیے وقف ہو گیا ہے۔ سبحٰن اللہ!

اگر مولانا کی بیماری اور وفات کی خبر نہ دی جاتی اور جنازے کے متعلّق کسی طرح کا اعلان کیے بغیر چپکے سے میّت لا کر جلدی جلدی دفن کر دی جاتی تو ایک حکمِ مستحب کا ثواب تو اُن کے ورثا کو مل جاتا مگر دین اور محبّانِ دین کو وہ عظیم برکات نہ ملتیں جن سے وہ بہرہ مند ہوئے ہیں۔

مولانا کے معاملے میں خدا تعالیٰ کا خاص ہی پروگرام تھا۔ ذاتی طور پر ان کو یہ بات پسند نہ تھی کہ اُن کا آخری وقت کسی غیر ملک میں آئے (اس کا اظہار انھوں نے میرے رُوبرو بھی کیا) لیکن مشیّتِ الٰہی نے اپنا راستہ خود معیّن کیا۔ گھر سے ہزاروں میل دُور بفیلو کے ایک ہسپتال میں ان کی رُوح قبض کی گئی۔ نتیجہ یہ کہ نیویارک اور لندن میں ان کے جنازے پڑھے گئے۔ بروایت پروفیسر خورشید احمد مجموعی طور پر ایک درجن مرتبہ جنازے پڑھے گئے۔

اور خبری دنیا میں اُن کا تذکرہ تازہ ہوا۔ ادھر ملک کے لوگوں کو موقع مل گیا کہ وہ دُور سے جنازے کے لیے آسکیں، اور بے شمار لوگ آئے۔ خدا ان سب کے جذبۂ اخلاص کو قبول کرے۔

یہ طویل گزارشوں کو ختم کرتے ہوئے میں یہ دعا کرتا ہوں کہ:

اے اللہ! اپنے دینِ مقدّس کی بھرپور خدمات انجام دینے والے سیّد مودودیؒ کی رُوح پر اپنی رحمتوں اور انوار کا نزول فرما، اس پر اپنی بہترین تجلّیات کے پھول برسا! اس کی قبر کو اُفق تا اُفق وُسعت دے اور اپنے جمال کی کرنوں سے اسے روشن کر دے۔

اے اللہ! تیرے اس بندے نے اقامتِ دین کی مہم کا آغاز کر کے اس کے عروج کے لیے اپنی پوری عُمر کھپا دی، اُسے جزائے وافر عطا فرما!

اے اللہ! وہ ہستی جس نے تیرے پیارے رسولؐ سے اور اُس رسولؐ کی ستم رسیدہ اُمّت کے ساتھ بھرپور محبّت کی اور اس اُمّت کی بھلائی کے لیے جیل کی سلاخوں اور پھانسی کے تختے تک کے لیے اپنے آپ کو پیش کر دیا، اُسے اپنے رسولؐ کی شفاعتِ خاص سے نواز، اور اُسے حوضِ کوثر کے مشروبِ مقدّس سے سیراب فرما۔

اے اللہ! وہ عالمِ اسلام کے ہر دُکھ پر تڑپا ہے، جس نے مسلمانوں کے ہر زخم کی ٹیس اپنے کلیجے میں محسوس کی ہے اور ان سارے احساساتِ کرب کو اپنے سینے میں جذب کر کے جس نے پورے صبر و عزم کے ساتھ ایسے تمام معاملات میں اپنا فرض ادا کیا ہے، اسے انعام یافتہ انبیاء و شہداء اور صدّیقین و صالحین کی محفل میں مسندِ نور عطا فرما۔

اے اللہ! تیرا وہ بندہ جس نے قدم قدم پر مختلف اطراف سے تکفیر و تضحیک کے حملے برداشت کیے اور بدگوؤں کو "جیسے کو تیسا" کے اصول پر نہ کبھی بر سرِ عام جواب دیے اور نہ دل میں کوئی کینہ رکھا جو قریبی حلقے میں وقتاً فوقتاً نمایاں ہوتا رہے ——— اپنے ایسے بندے کو ہر آخری راحت سے زیادہ سے زیادہ حصّہ ارزانی فرما۔

اے اللہ! اس داعیٔ حق اور نقیبِ اقامتِ دین نے اپنے مقدّس مشن کے لیے جس تحریک کو برپا کیا ہے، اس کی زیادہ سے زیادہ خدمت کی توفیق ہمیں بھی نصیب کر۔ نیز ہمیں نئی قوّتیں اور صلاحیتیں عطا فرما۔

اے اللہ! جن افراد اور جن اداروں اور جن سرگرمیوں سے اس نے زندگی میں صرف تیرے لیے محبّت کی ہے اُن سے محبّت کرنے کی سعادت ہمیں عطا فرما۔

اے اللہ! اپنے بعد کام کو جاری رکھنے کے لیے جن اصحاب کو رخصت ہونے والے بانیٔ تحریک نے بہ طورِ امیر یا لیڈر تربیّتِ خاص دی اور جن کو مامور کیا یا جن کے کسی منصبِ ذمّہ داری پر آنے کو پسند کیا، اُن کی اطاعت اور ان سے تعاون اور اُن کی خیر خواہی کی راہ پر ہم کو مستقیم رکھ۔

اے اللہ! راقم الحروف کے لیے تو وہ دینی استاذ اور قرآن و حدیث کا معلم ہونے کے علاوہ ذاتی دائرے میں مشفق بزرگ بھی تھا۔ میں نے بعض اوقات اپنی ذاتی پریشانیوں کو اس کے سامنے بیان کر کے حرفِ تسلّی اور کلماتِ دعا کی شکل میں فیض اٹھایا ہے۔ میں نے کبھی کبھار اس کے سامنے اپنی الجھنیں اور اذیّتیں بھی پیش کی ہیں۔ میں نے دو ایک بار اس سے وقتی ضرورتوں کے لیے قرض بھی لیا ہے، اور میرے ربِّ غفور! میں نے اس کے سامنے بارہا بے باکی سے (بدتمیزی سے نہیں) بعض ایسی باتیں کہی ہیں جنھیں شاید کوئی دوسرا نہ کہہ سکتا اور ایسی کئی باتوں کو سیّد مغفور نے مجھ سے قبول کر لیا۔ میرے آقا! تیرے اس بندے نے تہائی صدی سے زائد عرصے میں مجھے کبھی خوردہ گیری کا نشانہ نہیں بنایا، مجھ پر میرا کم تر ہونا واضح نہیں کیا، مجھے زجر و توبیخ نہیں کی، بلکہ میرے ناقص کاموں پر میری حوصلہ افزائی کی۔

— اے خداوندِ کائنات! میرے اس مشفق محسن کے درجاتِ عالیہ میں مسلسل اضافہ فرما۔

اے اللہ! مولانائے مغفور کے اہلِ خاندان، جماعتِ اسلامی کے وابستگان اور پاکستان عالمِ اسلام اور بقیہ دنیا کے تمام محبّانِ مودودیؒ کی جراحت ہائے غم پر صبر و سکینت کا مرہم رکھ دے آمین، ثُمّ آمین

ایک رفیقِ عزیز کے نام

عزیز بھائی! مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی جیسا صاحبِ علم و فکر اور مالکِ خلق و کردار قائد ہم سے جُدا ہو گیا ہے اور یقیناً اس کا صدمہ ہونا چاہیے۔ لیکن آپ کی باتوں سے ایسا تأثر—

جھلکتا ہے گویا کہ بات ختم ہو گئی ۔ اب ویسا کوئی نہیں آئے گا، اور ویسا نہیں ہو گا تو پھر کام کیسے ہو سکتا ہے ۔

مولانا مودودی پر ایسی موت وارد نہیں ہوئی ہے کہ ان کی فکر اور ان کی تحریک اُنکے نظر سے اوجھل ہوتے ہی ہوا میں اُڑ جائیں ۔ وہ نہیں رہے تو بھی ان کا قائدانہ فیض ہم میں جاری ہے ۔

اور پھر شریعت کے جس تصوّرِ قیادت سے انھوں نے ہمیں آشنا کیا ہے اس کے لحاظ سے اگر کوئی شخص نیّت کا مخلص، دین کے مقاصد کو جاننے والا اور ہم سفروں کی مرضی اور ہم سفروں کے مشورے کے ساتھ قافلے کو لے چلنے والا ایسا مل سکے جسے ہم اپنے اندر بہتر پاتے ہوں تو پھر اس کا احترام کیا جائے گا، اس کی اطاعت کی جائے گی، اور اِس کو اس کم زور کُن احساس میں پڑنے نہیں دیا جائے گا کہ وہ چوں کہ مولانا مودودیؒ نہیں ہے اس وجہ سے وہ کام نہیں چلا سکتا ۔ ہمیں اسے یہ احساس دلانا ہے کہ اپنے معزّز منصب کی وجہ سے تم بھی ہمیں ویسے ہی عزیز ہو، تم بھی ہماری بزم میں ویسے ہی فانوس روشن ہوا اور ہم تمھارے ایک ایک اشارے پر اسی طرح چلیں گے جس طرح مولانا مودودیؒ کے دَور میں ہوتا رہا ہے چاہے اس کی علمی سطح کمتر ہو، چاہے اس کی بعض آرا مختلف بھی ہوں ۔ چاہے اس کا اسلوبِ کار کسی قدر جُداگانہ انداز رکھتا ہو، چاہے اس کا مزاج مختلف ہو ۔ ہم صرف یہ چاہیں گے کہ ہمیں معروف کا حکم دیا جائے اور تمام معاملات مشوروں سے انجام پائیں ۔ تمام لوگوں کو مقرّرہ دستوری اسالیب سے بات کرنے کا، اختلافات کرنے کا حق حاصل رہے ۔ یہ سب کچھ اگر حاصل ہے تو سمجھو کہ مولانا مودودیؒ کی قیادت جاری ہے ۔ سمجھو کہ مولانا مودودیؒ زندہ ہیں

جَسدی لحاظ سے نہیں، دعوتی لحاظ سے !

عزیز من ! آپ میں یہ احساس کیوں پیدا ہوا کہ آپ کے پاس کوئی کام نہیں رہا ؟ حق و انصاف کی گواہی دینے والے خدا کے سپاہیوں پر کبھی کوئی لمحہ ایسا نہیں آتا کہ اُن کے پاس کوئی کام نہ رہے، وہ فارغ ہوں اور پریشان ہونے لگیں ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے مولانا مودودیؒ کا سارا پیغام فراموش کر دیا ہے !

آپ اپنا رُوئے سخن خدا کی طرف کر کے اس سے کیوں نہیں پوچھتے کہ میرے لیے کیا کام ہے؟ آپ خدا کے رسول صلے اللہ علیہ وسلّم کے فرمودات کی محفل آراستہ کر کے وہاں کیوں سوال نہیں کرتے کہ میری راہِ عمل کدھر جاتی ہے؟ سیرت و سوانح کا نورانی دفتر موجود ہے اس سے معلوم کیجیے کہ ایک مسلم کیا کرے؟

خرابی یہ ہے کہ دین کا کام ابھی تک آپ کا ذاتی کام نہیں بنا۔ اصل ذاتی کام، اصل دل چسپیاں، اصل سرگرمیاں، اصل رشتے رابطے دوسرے ہیں۔ دین کو آپ کسی دوسری قوت کی طرف سے عائد شدہ کام سمجھتے ہیں۔

حالاں کہ آپ نے خدا کے ہاں مزدوری کرنے والے محنت کاروں میں نام لکھوایا اور خدا کی فوج میں آپ سپاہی بھرتی ہوئے ہیں۔ ایک مزدور خوب جانتا ہے کہ اسے مالک کے کارخانے یا باغ یا کھیت میں کام کرنا ہے، اسی طرح ایک سپاہی اچھی طرح سمجھتا ہے کہ کن طاقتوں سے جنگ ہے اور وہ کہاں کہاں ہیں، کدھر کدھر سے حملہ کر رہی ہیں اور ان کا مقابلہ کس کس محاذ سے کیسے کرنا ہے۔ آپ دوسروں کی طرف سے تجویزوں کا انتظار کرتے ہیں، آپ خود کیوں نت نئی مفید تجویزیں نہیں سوچتے؟

عزیزِ من! اگر نماز روزہ کی ادائی کے لیے کسی سے پوچھنا نہیں پڑتا تو آخر دعوتِ حق کو خدا کے بندوں تک پہنچانے، خدمت کے کام کرنے، لوگوں سے رابطہ قائم کرنے، دینی و ملّی مقاصد کی طرف عوام کی توجّہ دلانے کے کاموں میں کسی سے دریافت کرنا کیا ضروری ہے؟ نماز باجماعت ادا کرنے پر اگر کہیں پابندی ہے تو اپنی اپنی انفرادی نماز پر تو کوئی قدغن نہیں!

پیارے رفیق! میں بھی دُکھی ہوں، تم بھی دکھی ہو، اس وقت ہم اپنی ایک قیمتی متاع سے محروم ہو گئے ہیں ـــــــــ وہ جو قافلے کی متاعِ گراں بہا تھا، وہ ہماری محفل سے اٹھ کر چلا گیا، کیوں کہ اس کی مہلتِ کار ختم ہو گئی اور عالمِ بقا سے اس کے لیے بلاوا آ گیا۔

یہ ایک آزمائش ہے، اُن آزمائشوں سے بڑی آزمائش جو مخالفین کی طرف سے ہمیں پیش آتی رہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا مولانا مودودیؒ کے کام نے اور ان کی محبّت و قربت نے، ان کے درس اور گفتگوؤں نے، ان کے اخلاق و کردار نے ہمارے ایمان کو اتنا

قوی بنادیا ہے یا نہیں کہ ہم اتنی شدید و سنگین آزمائش سے عہدہ برآ ہو جائیں ؟

ظاہری جسدی موت، صدّیقین و شہداء و صالحین، مجدّدین اور ائمہ سب کے لیے تھی اور ہے، یہاں تک کہ انبیاء علیہم السّلام کی عظیم ہستیاں بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھیں۔ انبیاء کے جدا ہونے کے بعد ان کے سچّے پیروؤں نے ان کی تعلیمات کو زندہ رکھا، ان کے کردار کی جھلکیاں باقی رہیں، ان کے کردار کی شعاعیں بعد میں بکھرتی رہیں۔ اسی طرح مولانا مودودیؒ جو ہمیں اپنی ذات کی طرف بلانے نہیں اٹھے تھے، بلکہ اُنھوں نے خدا کی طرف دعوت دی، خدا کے رسولؐ کی طرف دعوت دی، خدا کی کتاب کی طرف دعوت دی، خدا کے دین کی طرف دعوت دی اور اقامتِ دین کے لیے تحریک اٹھانے میں ہماری رہنمائی کی، ان کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد بھی خدا حیّ و قیّوم ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکمت و سُنّت اور اسوہ و سیرت زندہ موجود ہے، خدا کا دین جیتا جاگتا دین ہے اور اقامتِ دین کی تحریک پاکستان ہی میں نہیں، پورے عالمِ اسلام میں چل رہی ہے، تو پھر ہم لوگوں کا خدا پرستار بن کر رہنا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبّت رکھ کر حضورؐ کے اُسوہَ و سُنّت سے اکتسابِ فیض کرنا اور دین کا علم حاصل کر کے اس کے مطابق زندگی گزارنا اور اپنی ساری توانائیاں اقامتِ دین کی تحریک میں صرف کر دینا یہ معنیٰ رکھتا ہے کہ معنوی لحاظ سے مولانا مودودیؒ زندہ ہیں، کیوں کہ ان کی دعوت اور ان کا نام زندہ ہے۔

مولانا مودودیؒ کے رخصت ہو جانے کے بعد ان سے سچّی محبّت کا اوّلین تقاضا تو یہ ہے کہ ہم اس مرحوم و مغفور ہستی کے لیے خدا سے مغفرت و لطف و کرم کی دعائیں کرتے رہیں، لیکن ہماری عملی زندگیوں اور سرگرمیوں کی درستی کا دار و مدار اس پر ہے کہ ہم مولانا کے چھوڑے ہوئے لٹریچر (خصوصاً تفہیم القرآن) سے مسلسل استفادہ کرتے رہیں کیوں کہ یہ لٹریچر ہمیں قرآن و سُنّت کے سرچشمہ ہائے ہدایت تک پہنچانے کا بہت مؤثر ذریعہ ہے۔

دوسری ضروری بات یہ ہے کہ اقامتِ دین کی تحریک یا اسلامی انقلاب کا جو نہج مولانا مودودی نے واضح کیا اور جس کی تعلیم ہم سب کو مسلسل دیتے رہے، اُسے اچھّی طرح سمجھا جائے۔ علاوہ ازیں دعوتی سرگرمی اور سیاسی سرگرمی یا تعلّق باللہ اور تعلّق بالنّاس

یا اصولوں اور مصالح کے درمیان جو تناسب و توازن مولانا نے ہم سب کے سامنے سالہا سال کے مشوروں سے متعیّن کیا اس تناسب و توازن کو برباد نہ ہونے دیں۔

میرے پیارے رفیق! اگر ہم ان خطوط پر اپنی ذمہ داریوں کو صیحح طور پر سرانجام دیں تو چاہے ظاہری دوری اور افق تا افق ہو، ہم مولانا کے قریب ہیں اور مولانا کی تعلیم ہمارے ساتھ ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ خدا ساتھ ہے!
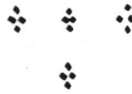
سفرِ آخرت ـــــــ مرحلہ بہ مرحلہ

تاریخ وار سلسلۂ حوادث

۲۶ر مئی ۱۹۷۹ء : ۱/۲ ۶ بجے شام کی پرواز سے لاہور سے اسلام آباد کے لیے روانگی۔

۲۷ر مئی ״ : اسلام آباد سے براستہ لندن، امریکہ کے لیے روانگی۔

۲۹ر مئی ״ : لندن سے نیویارک ـــــ بفیلو ـــــ کے لیے روانگی۔

۱۹ر جون ״ : بفیلو میں قیمّ جماعت اسلامی پاکستان قاضی حسین احمد اور پروفیسر خورشید احمد کے بھائی ڈاکٹر انیس احمد کی مولانا سے ملاقات۔ نیز شمالی امریکہ کے دُور افتادہ شہروں سے آئے ہوئے لوگوں سے ملاقات اور محفلِ سوال وجواب۔

۲۹ر جون ״ : مولانا مودودیؒ سے ملاقات کے لیے بفیلو روانگی۔

: بفیلو میں نعیم صدّیقی اور مولانا خلیل حامدی کی مولانا محترم سے ملاقات۔ مقامی عام افراد کے ایک وفد کی مولانا سے ملاقات۔

۲۳ر جولائی ״ جوڑوں کے درد کا نیا علاج شروع ہوا۔

۲۰ر اگست ״ : مولانا ابوالخیر مودودیؒ (مولانا کے برادرِ بزرگ) کا لاہور میں انتقال

۴ر ستمبر ״ : بفیلو کے ”ملرڈ فلمور ہسپتال“ میں معدے کے اُلسر کا آپریشن

۵ر ستمبر : طبیعت ہشّاش بشّاش رہی۔

۶ر ستمبر ״ : شام کے وقت دل کا دورہ۔ دوسرے ہسپتال میں منتقلی۔

۱۱ر ستمبر ״ : تشویشناک صورت حال ختم ہوگئی اور رُو بصحّت نظر آنے لگے۔

۱۳ر ستمبر ״ : دل کا دوسرا شدید دورہ۔ حرکتِ قلب چار منٹ بند رہنے کے بعد جاری ہوئی۔ (حیرت انگیز!)

۱۴ر ستمبر ״ : حواس بحال ہوگئے۔ لیکن نقاہت بڑھ گئی۔

۲۰ر ستمبر ۱۹۷۹ء : جگر اور (واحد) گُردے کا فعل متأثّر ہوگیا، بے ہوشی طاری ہوگئی۔

۲۱ر ستمبر ״ : آج طبیعت سنبھلی ہوئی محسوس ہوئی۔

۲۲ ستمبر ۱۹۷۹ء : پانچ بجے صبح دل کا تیسرا دورہ۔ طبیعت کی بحالی کا عارضی وقفہ
: مولانا نے تمام آلات وغیرہ ہٹا لینے کے لیے کہا۔ آخری تحریر "میں مسلمان ہوں اور پاکستانی" (بزبانِ انگریزی) لکھی ـــــ رحلت!
پاکستانی وقت کے مطابق ۶ بجے شام!

۲۳ ستمبر " : بفیلو (امریکہ) میں نمازِ جنازہ ـــــ ۲ مرتبہ۔
" " : نیویارک میں کنیڈی ایرپورٹ پر نمازِ جنازہ۔

۲۴ ستمبر " : لندن میں ہیتھرو ایرپورٹ پر نمازِ جنازہ ـــــ ۵ مرتبہ۔

۲۵ ستمبر : اپنی سالگرہ کے روز صبح ½ ۱۰ بجے واپس وطن (کراچی) جہاں ایرپورٹ میں ۵ ہزار افراد نمازِ جنازہ میں شریک ہوئے۔ جنازہ میاں طفیل محمدؒ نے پڑھایا۔

۲۵ ستمبر " : ۳ بجے بعد دوپہر ہوائی جہاز میں میت لاہور ایرپورٹ پر پہنچی پھر ۵۔اے ذیلدار پارک میں دیدارِ عام ـــــ ملک کے گوشے گوشے سے آنے والے لاکھوں سوگواروں نے زیارت کی۔

۲۶ ستمبر " : قذافی سٹیڈیم لاہور میں نمازِ جنازہ ½ ۱۰ بجے صبح امریکہ، انگلستان، بھارت، عراق، شام، قطر، سعودی عرب، بنگلہ دیش اور دیگر ممالک کے نمائندے شریک ہوئے۔ ۵۔اے ذیلدار پارک میں تدفین (بوقت ڈھائی بجے)

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ۔

۵۔اے ذیلدار پارک کے اس سبز پلاٹ کے کونے میں تدفین جس میں ہر روز بعد نمازِ عصر سیّد مودودیؒ محفل آرا ہوتے تھے۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے